8 پاکستان کی سیاسی تاریخ

افغانستان کا تاریخی پس منظر اور

پختون مسئلہ خودمختاری کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ
جلد 8

افغانستان کا تاریخی پس منظر
اور
پختون مسئلہ خودمختاری کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب:
حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

فہرست

باب7:

باب8:

باب9:

باب10:

دیباچہ ایڈیشن دوم

آج سے قریباً 20 برس پیشتر جب زیر نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن 1994ء میں شائع ہوا تھا، افغانستان میں سوویت انخلا کے بعد شدید خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ 1992ء میں سوویت حمایت یافتہ صدر افغانستان ڈاکٹر نجیب اللہ کے اقتدار کا خاتمہ ہوا، انہیں انہیں پھانسی دے دی گئی اور کابل پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ طالبان کا اہم قوت کے طور پر ابھر چکے تھے مگر ابھی ان کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ مجاہدین کے مختلف دھڑے باہم خانہ جنگی میں مصروف تھے اور کابل میں کوئی مستحکم حکومت موجود نہیں تھی۔ لاکھوں افغان مجاہدین بدستور پاکستان میں پشاور سے کوئٹہ تک مہاجر کیمپوں میں پناہ گزین تھے۔ پاکستان بھی سیاسی عدم استحکام سے دوچار تھا۔ یہاں سول اور فوجی بیوروکریسی اگرچہ بینظیر اور نواز شریف کی باریاں لگوا رہی تھی لیکن افغان پالیسی، دفاعی پالیسی اور خارجہ حکمت عملی پر مکمل کنٹرول سول اور فوجی اسٹبلشمنٹ کو حاصل تھا۔

اس وقت اس کتاب نے افغانستان کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے اور صوبہ خیبر پختونخواہ جیسے شمال مغربی سرحد صوبہ (NWFP) کہا جاتا تھا کے عوام کی علاقائی اور صوبائی خودمختاری کے سوال کو سمجھنے میں رہنمائی مہیا کی تھی۔ گزشتہ 20 برس میں پاکستان کے سرحد کے اندر وہ آگ جو اس وقت افغانستان میں بھڑک رہی تھی، پھیل کر نہ صرف پختونخواہ بلکہ پورے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ اس دوران 1996ء میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی جسے صرف پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی منظوری حاصل تھی۔ اور 11 ستمبر 2011ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر نیو یارک کی مبینہ طور پر القاعدہ کے ہاتھوں تباہی کے ساتھ ہی طالبان حکومت کا خاتمہ ہوا اور یہ پورا خطہ دہشت گردی کی آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا۔ ایک جانب امریکی

سامراج کی دہشت گردی ہے جو دہشت کے خلاف جنگ کے نام پر جاری ہے تو دوسری جانب مذہبی انتہا پسندی کے سراب میں مبتلا نوجوان خودکش حملوں کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں اور ہزاروں معصوم لوگوں کی جان و مال کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ فاٹا اور پاٹا کا قبائلی سماج پہلے ہی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی پس ماندگی کا شکار تھا، اس میں عالمی اور علاقائی طاقتوں کی باہمی لڑائی نے مذہب کی آڑ میں جہاد اور نفاذ اسلام کے نام پر ان لوگوں کو ایک لامتناہی خانہ جنگی اور فرقہ ورانہ دہشت گردوں کی آگ میں دھکیل دیا ہے۔

ان حالات میں زیر نظر کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے جو ایک بار پھر افغانستان اور پختونخواہ کے سیاسی، تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

حسن جعفر زیدی

لاہور

جنوری 2014ء

دیباچہ ایڈیشن اول

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سلسلے کی آٹھویں جلد پیش خدمت ہے جو پختونوں کی صوبائی خودمختاری اور افغانستان کے تاریخی پس منظر کے بارے میں ہے۔ اس سے پیشتر کی جلدوں میں کشمیریوں، پنجابیوں، مہاجروں، سندھیوں اور بلوچوں کی سیاسی تاریخ کا ابتدائی جائزہ پیش کیا جاچکا ہے۔

پختونوں، جن کے لئے بیشتر مورخین نے افغان کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، زیادہ تر پاکستان کے شمال مغربی صوبہ سرحد میں آباد ہیں، افغانستان میں نہیں...... دراصل وہاں ان کی آبادی پاکستان کی سرحد کے متوازی خطے میں آباد ہے...... جبکہ شمال میں تاجک، ازبک، بدخشانی اور دیگر ترکی النسل قومیں، وسط میں ہزارہ، جنوب اور مغرب میں خراسانی، ترکمانی اور سیتانی قومیتیں آباد ہیں...... کابل ہمیشہ سے مختلف قومیتوں کا شہر رہا ہے۔ آج سے کم وبیش پانچ سو برس پہلے جب بابر نے یہاں اپنی چھوٹی سی ریاست قائم کی تھی تو اس کے اپنے بقول اس شہر میں سترہ 17 زبانیں بولی جاتی تھیں...... پھر یہاں کی تاریخ میں ایک ایسا وقت آیا جب اٹھارھویں صدی میں ایک افغان سردار احمد شاہ ابدالی نے اسے ایک وسیع و عریض سلطنت کا مرکز بنایا۔ تب سے یہاں افغان سرداروں کی بالادستی قائم ہوئی اور یہ افغانی سلطنت کہلائی جو بعد میں اپنی موجودہ سرحدوں میں سکڑ کر افغانستان کہلائی۔ تاہم اس سکڑنے کے عمل میں پشتو بولنے والوں کی اکثریت ڈیورنڈ لائن کے جنوب مشرق میں رہ گئی جو پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ کہلاتا ہے۔ اگرچہ اس ریاست کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں تھی مگر کابل پر حکمران افغان سرداروں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ ڈیورنڈ لائن کے اس پار پشتو بولنے والے علاقے پر بلکہ اٹک تک اپنی حکمرانی

دوبارہ استوار کرلیں۔ جب تک برصغیر پر برطانوی سامراج کا تسلط رہا، کابل کے افغان حکمرانوں کی یہ خواہش دبے لفظوں میں اظہار تک محدود رہی لیکن جب برصغیر سے برطانوی راج کے خاتمہ کا وقت قریب آیا اور برصغیر کی تقسیم عمل میں آنے لگی تو کابل کے حکمرانوں کی یہ خواہش مطالبہ بن کر سامنے آ گئی...... انڈین نیشنل کانگرس کو جب تک یہ امید رہی کہ وہ کانگرسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب اور اس کے بھائی عبدالغفار خاں کے ذریعے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو پاکستان کا حصہ بننے سے روک لیں گے اور اسے ہندوستان میں شامل کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے، نہرو کی جانب سے کابل کے حکمرانوں کے مذکورہ مطالبہ کی مخالفت کی گئی مگر جب ریفرنڈم نے پانسہ پلٹ دیا اور شمال مغربی سرحدی صوبہ پختونوں کے بھاری اکثریتی ووٹ کے ذریعے پاکستان میں شامل ہو گیا تو نئے ہندوستان کی کانگرسی حکومت نے کابل کے حکمرانوں کے مذکورہ مطالبہ کی حمایت شروع کر دی۔ کابل کے حکمران اپنی توسیع پسندانہ خواہش کے تحت بھارتی حکمرانوں کے ہاتھوں میں استعمال ہو گئے اور نومولود پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی بھارتی سکیم کا حصہ بن گئے۔ اس طرح پختونستان سٹنٹ کھڑا کیا گیا۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی سیاست میں چونکہ ہندوؤں کا ویسا اثر نہیں تھا جیسا کہ برصغیر کے دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں میں تھا اس لئے وہاں کے مسلمانوں کے نزدیک کانگرس کا وہ مطلب بھی نہیں تھا جو باقی صوبوں کے مسلمانوں کے نزدیک تھا چنانچہ 1946ء کے انتخابات کے نتیجہ میں سرحد اسمبلی میں کانگرس کو اکثریت حاصل ہوئی اور وہاں ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں کانگرس کی حکومت قائم ہوئی لیکن جب تقسیم ہند کا مرحلہ آیا تو اسی Electorate نے جس نے 46ء میں کانگرس کو اسمبلی میں اکثریت دی تھی، ریفرنڈم کے ذریعہ اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دیا اور یہ صوبہ دیگر مسلم اکثریتی صوبوں کی طرح پاکستان میں شامل ہو گیا۔ تاہم قیام پاکستان کے وقت اسمبلی میں اکثریت کے جمہوری اصول کی بنیاد پر وہاں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بدستور قائم تھی اور اسے قائم رہنے کا پورا آئینی حق حاصل تھا تا آنکہ اسمبلی میں اس کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جاتی...... لیکن اس اصول کی پاسداری نہ کی گئی اور قیام پاکستان کے چند روز بعد ہی ڈاکٹر خان وزارت کو برطرف کر کے یہاں ایک شاطر مسلم لیگی رہنما عبدالقیوم خان کی وزارت قائم کر دی گئی جس کی خود مسلم لیگ کے ساتھ

رفاقت بھی کچھ زیادہ پرانی نہیں تھی بلکہ اس کی مسلم لیگ کے ساتھ عداوت کا زمانہ گزرے بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا...... یاد رہے کہ اس وقت سرحد مسلم لیگ کی سب سے معتبر اور مدبر شخصیت سردار عبدالرب نشتر کی تھی مگر اسے مرکزی کابینہ میں ذمہ داریاں سونپ دی گئی تھیں...... عبدالقیوم خان نے اپنے اقتدار کی خاطر ہر طرح کے آمرانہ حربے اختیار کئے اور صوبہ کے عوام الناس کی ترقی وخوشحالی کے لئے کوئی کام نہ کیا...... اس کے بعد پاکستان کی مرکزی حکومت کی جانب سے وہاں وزارتوں کے بنانے اور توڑنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس صوبہ کی صوبائی حیثیت کو ختم کر کے اسے ون یونٹ یعنی صوبہ مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا...... صوبائی خودمختاری کے اس قتل میں ڈاکٹر خان صاحب نے پاکستان کے مرکزی حکمرانوں کے آلہ کار کا کردار ادا کیا اور نئے صوبہ مغربی پاکستان کا پہلا وزیراعلیٰ بننے کا ''اعزاز'' حاصل کیا۔

67/68 کے دوران پاکستان کے طول وعرض میں فقید المثال عوامی تحریک کے نتیجے میں ایوب خان کی آمریت کا خاتمہ ہوا اور یحییٰ خان نے عبوری انتظام سنبھالا تو عوام کے پرزور مطالبہ پر ون یونٹ کا خاتمہ ہوا۔ 70ء کے انتخابات کے نتیجے میں یہاں 71ء کے اواخر میں منتخب نمائندوں کی حکومت بحال ہوئی اور پھر 73ء کے آئین کے مطابق دی گئی صوبائی خودمختاری کی بنیاد پر باقاعدہ صوبائی حکومت قائم ہوئی لیکن اسے بھی زیادہ عرصہ چلنا نصیب نہ ہوا...... جب 74ء میں عراقی سفارت خانہ سے اسلحہ کی برآمدگی کا ڈرامہ رچا کر اور بیلہ میں مظاہروں کا اہتمام کر کے بھٹو نے بلوچستان کی صوبائی حکومت کو معزول کر دیا تو سرحد میں بھی نیپ (NAP) اور جمیعت العلمائے اسلام کی مخلوط حکومت احتجاجاً مستعفی ہوگئی۔ اس کے بعد یہ صوبہ مرکز سے بھی کنٹرول ہوتا رہا یہاں تک کہ 77ء میں ضیاء آمریت قائم ہوگئی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے اس گیارہ سالہ تاریک ترین دور میں اس صوبہ کے جرنیل گورنروں کو یہاں کا مطلق العنان بادشاہ کہا اور سمجھا جاتا تھا...... 88ء کے عام انتخابات میں نام نہاد جمہوریت کی بحالی کے بعد سے باقی ملک کی طرح اس صوبہ میں بھی کسی منتخب حکومت کو دو اڑھائی سال سے زیادہ ٹکنے نہیں دیا گیا گویا صوبائی خود مختاری ابھی تک یہاں کے عوام کا ایک خواب ہے، یا پھر طالع آزما سیاستدانوں کے ہاتھ میں ایک نعرہ ہے جسے وہ جب اپنے لئے سودمند سمجھتے ہیں استعمال کر کے عوام کو بے وقوف بنا لیتے ہیں اور مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔

زیرِ نظر جلد میں ون یونٹ کے قیام تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے جن میں ریاست افغانستان کے تاریخی پس منظر، انیسویں اور بیسویں صدی میں روس اور مغربی طاقتوں کے مابین تضاد سے یہاں رونما ہونے والے اثرات، پختونوں کی مغلوں اور پھر انگریزوں سے تابعداری اور بغاوت کے ملے جلے پس منظر، برطانوی عہد میں حاصل صوبائی خودمختاری، برطانوی عہد کے خاتمے پر ریفرنڈم کے ذریعہ پختونوں کا پاکستان میں شمولیت کا تاریخ ساز فیصلہ اور پھر قیام پاکستان سے لے کر ون یونٹ کے قیام تک صوبائی سیاسی عدم استحکام شامل ہیں ان واقعات کے تسلسل میں جاری وساری عالمی اور مقامی تضادات کا مربوط سائنسی تجزیہ ساتھ ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

صوبائی خودمختاری سے مراد صوبہ کے عوام کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی آزادی ہے لیکن صوبہ سرحد کے عوام کو بھی اس آزادی سے اسی طرح محروم رکھا گیا ہے جیسے سندھیوں، بلوچوں اور بنگالیوں کو رکھا گیا۔ یہ صوبہ قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ قدرتی وسائل سے بھی مالا مال ہے جبکہ یہاں کے عوام الناس بے حد محنتی اور جفاکش ہیں لیکن ابھی تک یہاں کی وسیع اکثریت غربت اور پس ماندگی کا شکار ہے، خوانین اور وڈیروں کے سازشی ٹولے اقتدار کی رسہ کشی میں اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں تاکہ ان کی لوٹ کھسوٹ کا نظام جاری رہ سکے۔ جبکہ صوبہ اور عوام کی فلاح وترقی محض نعرے بازی اور اعداد وشمار کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پختون عوام تلاش معاش میں اپنا وطن چھوڑ کر پنجاب اور کراچی کا رخ کرتے ہیں تاکہ اس دولت کی تلچھٹ میں حصہ دار بن سکیں جو ملک کی مقتدر قوتوں نے پنجاب اور کراچی میں مرتکز کر رکھی ہے۔ نقل مکانی کا یہ سلسلہ نہ جانے کب سے جاری ہے اور کب تک جاری رہے گا۔ نہ معلوم وہ دن کب آئے گا جب پختونوں کو اپنی خوبصورت وادیوں میں رہتے ہوئے وہ سب کچھ میسر آسکے گا جس کی خاطر وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں درحقیقت یہ صوبائی خودمختاری کی شاہراہ ہے جو اس منزل تک جاتی ہے لیکن اسی سے یہاں کے عوام کو مسلسل محروم رکھا جا رہا ہے۔ یہ کتاب اس محرومی کے آغاز کی داستان بیان کرتی ہے، اس کے انجام تک پہنچنے کے لئے مزید کئی جلدیں درکار ہیں جن پر کام کرنا ابھی باقی ہے۔

زیرِ نظر جلد کی تیاری میں حسب سابق میرے عزیز ترین دوست خالد محبوب نے بڑی

محنت کے ساتھ کام کیا ہے اور پروف ریڈنگ اور اشاریہ کی تیاری کا کام انجام دیا ہے۔ سمیع اللہ ظفر، ثائر علی اور مسعود نقوی نے اس تحقیقی منصوبے کی جس آڑے وقت میں قانونی مدد کی ہے اس کے لئے ان جلدوں کے قارئین کو ان حضرات کا بے حد ممنون ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں جن سرپرستوں کی شفقت اور محبت کی بدولت میں یہ کام انجام دے رہا ہوں، ان میں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، میاں دلاور محمود صاحب، صدیق درانی صاحب، خورشید عالم صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، حسین نقی صاحب، محمد اورنگ زیب صاحب، صفدر قریشی صاحب، مہدی حسن صاحب اور قمر عباس صاحب جیسے کرم فرما شامل ہیں۔ مصطفیٰ وحید صاحب جس ثابت قدمی اور جرأت کے ساتھ اس تحقیقی منصوبے کو طباعت اور اشاعت کے مراحل سے گزار کر قارئین تک پہنچا رہے ہیں، وہ ان کی علم اور سچائی کے ساتھ گہری کمٹ منٹ کی علامت ہے۔ ان کے بھائی آصف جاوید اور معاون نعیم احسن بھی جس خلوص سے اس کام میں حصہ لیتے ہیں، ان کا ممنون ہوں۔

قارئین نے اب تک شائع ہونے والی جلدوں کو جو پذیرائی بخشی ہے اس سے Inspiration لے کر ہی میں آگے بڑھتا رہا ہوں اور آگے بڑھتا رہوں گا۔ تاہم خامیوں اور غلطیوں سے بالکل مبرا ہونے کا دعویٰ کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر آپ کچھ خامیاں اور غلطیاں پائیں تو ان کے لئے میں خود کو ذمہ دار سمجھتا ہوں۔

حسن جعفر زیدی

لاہور

جون 1994ء

باب:1

پہلی افغان سلطنت

پختون عوام کی سیاسی، معاشی و معاشرتی پس ماندگی میں ان کی تاریخ اور جغرافیہ کے بیشتر عوامل کارفرما رہے ہیں۔ ان کا خطہ کبھی وسط ایشیائی مہم جوؤں، کبھی ایرانی شہنشاہوں اور کبھی دہلی کے فرمانرواؤں کے زیر نگیں رہا۔ پختون قبائل کسی نہ کسی صورت میں کبھی تو اس غلبہ کے خلاف مزاحمت جاری رکھتے اور کبھی حالات سے مجبور ہو کر یا فرمانروا کی جانب سے بہتر شرائط پیش ہونے پر اس کے ساتھ صلح کر لیتے اور پر امن ہو جاتے تھے۔ اس طرح اٹھارہویں صدی تک پختون علاقے میں کوئی باقاعدہ پختون ریاست یا سلطنت کبھی قائم نہ ہو سکی۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل تک یہ علاقہ مغلیہ سلطنت کا حصہ تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا تو پختون قبائل بھی تخت دہلی کے خلاف نبرد آزما تھے۔ مشہور پشتو شاعر خوشحال خان خٹک کی شاعری میں ان جذبات کا کھلا اظہار موجود ہے جو پختون قبائل میں تخت دہلی کے خلاف پیدا ہو چکے تھے۔ خوشحال خان خٹک خود بھی ان مسلح بغاوتوں میں شریک رہا تھا جو مغلوں کے خلاف زور و شور سے جاری تھیں۔ اورنگ زیب کے بعد کابل اور قندھار ایران کے بادشاہ نادر شاہ کے زیر تسلط چلے گئے۔ بیشتر افغان قبائل نے مغل سلطنت کے خلاف نادر شاہ کا ساتھ دیا اور یوں نادر شاہ کو دم توڑتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی دہلی پر حملہ کا حوصلہ پیدا ہوا۔

نادر شاہ نے 1739ء میں دہلی میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو اس وقت اس کی فوج میں وسطی ایشیا کے قبیلہ قزلباش کے علاوہ افغانستان کے قبیلہ ابدالی کے لوگ بھی شامل تھے۔ ابدالیوں کی کمان ایک نوجوان احمد خان کے پاس تھی جو اپنے قبیلے کی روایت کے مطابق ایران کے بادشاہ کا بہت وفادار تھا۔ نادر شاہ بھی احمد خان اور اس کے قبیلے پر بہت اعتماد کرتا تھا اور یہ بات دونوں قبیلوں میں رقابت کا باعث تھی جو بالآخر 1747ء میں رنگ لائی جبکہ نادر شاہ کو ایک

قزلباش باڈی گارڈ نے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد ایران کی وسیع وعریض سلطنت میں افراتفری کی صورت حال پیدا ہوئی تو احمد خان جلدی سے قندھار پہنچا جہاں اس کے قبیلے کے سرداروں نے اسے ایران کے صوبہ افغانستان کی ایک الگ سلطنت کا بادشاہ منتخب کرلیا۔ وہ اس سے قبل نادر شاہ کے دہلی میں لوٹے ہوئے ساز وسامان پر قبضہ کر چکا تھا جس میں مغلوں کا تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا۔ اس وقت احمد خان کی عمر صرف 24 سال تھی۔ اس نے بادشاہ بننے کے بعد اپنا نام احمد شاہ رکھا اور پھر خود ہی دردران کا لقب اختیار کرلیا کیونکہ اسے موتی بہت پسند تھے اور وہ اپنے کان میں موتیوں کا جھمکان پہنا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں اسے احمد شاہ درانی کہا جاتا ہے اور اس کا ابدالی قبیلہ بھی درانی قبیلہ کہلاتا ہے۔

احمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد تقریباً 26 سال تک حکومت کی۔ اس دوران اس نے اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے وسطی ایشیا کی طرف تو رخ نہ کیا البتہ ہندوستان پر آٹھ حملے کئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نادر شاہ کے 39-1738ء کے حملے کے بعد مغلیہ سلطنت کی کمر بالکل ٹوٹ چکی تھی اور مغل بادشاہ، محمد شاہ ازخود دریائے سندھ کے شمالی علاقے سے دستبردار ہو چکا تھا۔ پنجاب میں سکھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں لیکن ابھی ان میں کسی بڑے حملہ آور کی مزاحمت کرنے کی سکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس نے 1748ء اور 1750ء میں دو حملے تو محض اس لئے کئے کہ مغل بادشاہ دریائے سندھ کے شمالی علاقے کو اپنی مغلیہ سلطنت کا ایک حصہ سمجھنے کے بجائے اس علاقے کو اس کی نئی ابدالی سلطنت افغانستان کا ایک حصہ تسلیم کرلے۔ اسے اپنے اس مقصد میں کامیابی ہوئی کیونکہ سندھ کا گورنر نور محمد اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس طرح پشاور کی سرسبز وزرخیز وادی پر اس کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔ 1751ء میں احمد شاہ نے پھر حملہ کیا تو اس کا شمال مغربی ہندوستان کے علاقے میں کسی نے بھی مقابلہ نہ کیا کیونکہ نور محمد نے سال گزشتہ کی شکست کے بعد مغلوں کی گورنری چھوڑ کر اس کی گورنری قبول کر لی تھی۔ 1752ء میں احمد شاہ کے عزائم میں وسعت پیدا ہوئی تو اس نے دریائے سندھ سے آگے بڑھ کر پہلے تو لاہور اور ملتان پر قبضہ کرلیا اور پھر سرہند پہنچ کر اعلان کیا کہ میری سلطنت کی حدود یہاں تک ہوں گی۔ اس نے اسی سال صوبہ سرحد کے قبیلہ یوسف زئی اور پشاور کے گردونواح کے دوسرے قبیلوں کی امداد سے وادی کشمیر کو بھی فتح کر کے وہاں نہایت ظالمانہ نظام حکومت مسلط کر دیا۔ وہ اس مہم سے فارغ ہو کر کابل واپس پہنچا

تو معلوم ہوا کہ اس نے پنجاب میں جو نائبین مقرر کئے تھے وہ اس علاقے میں امن وامان قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ بالخصوص سکھوں کی بغاوتیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر احمد شاہ نے 1757-1756ء میں ایک اور حملہ کیا جس کے دوران نہ صرف اس نے سرہند کے نزدیک مغل بادشاہ کو شکست دی بلکہ اس کے بیٹے شہزادہ تیمور نے لاہور کے نزدیک سکھوں کو بہت مارا پھر امرتسر میں ان کے مقدس ترین گوردوارہ کو تہس نہس کر دیا۔

احمد شاہ کا پانچواں حملہ 61-1759ء میں ہوا جس کے دوران اس نے پانی پت میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ اولف کیرو (Olaf Caroe) لکھتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی 1761ء کی مرہٹوں سے لڑائی دنیا کی فیصلہ کن لڑائیوں میں سے تھی۔ اس لڑائی کے نتیجے میں مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت پاش پاش ہو گئی۔ ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں مرہٹوں کے غلبے کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل گیا اور انگریزوں کے اقتدار کی رفتہ رفتہ دہلی تک توسیع کے لئے رستہ کھل گیا۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ مغلوں کی زوال پذیر سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے عمل کی تکمیل ہو گئی اور اس طرح پنجاب میں سکھوں کی ایک طاقت ور سلطنت کے قیام کے لئے زمین ہموار ہو گئی اور تیسرا نتیجہ یہ تھا کہ اس جنگ کے بعد لاہور، ملتان، ڈیرہ جات اور پشاور کے عوام کی توجہ کا رخ دہلی کی بجائے شمال کی طرف ہو گیا۔ محمود غزنوی کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد سینکڑوں سال تک دہلی طاقت کا ایک ایسا مرکز بنا رہا تھا جس کا حکم شمال میں کابل تک چلتا تھا[1] لیکن کابل کا حکم دہلی تک زیادہ دیر نہ چل سکا کیونکہ پنجاب میں سکھوں کی بغاوتیں بڑی تیزی سے زور پکڑنے لگیں۔
ان بغاوتوں کی تعداد اور شدت میں اضافہ اورنگزیب کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد 1708ء میں شروع ہوا تھا جبکہ گھوڑوں کے ایک پٹھان سوداگر کے بیٹوں نے سکھوں کے دسویں گورو گوبند سنگھ کو قتل کر دیا تھا۔ یہ قتل محض ذاتی جذبہ انتقام کے تحت ہوا تھا کیوں کہ گوبند سنگھ نے چند سال قبل کسی وجہ سے طیش میں آ کر ان ملزموں کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ اس قتل کا پس منظر یہ تھا کہ گورو گوبند سنگھ نے اورنگزیب کی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کے لئے جو فوج منظم کر رکھی تھی اس میں پٹھان سپاہی بھی شامل تھے کیونکہ خوشحال خان خٹک نے بھی اسی زمانے میں زوال پذیر مغلیہ سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ گورو گوبند سنگھ بڑا منصف مزاج آدمی تھا۔ اس لئے اسے مرنے سے پہلے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان پٹھان نوجوان نے اپنے باپ کے

قتل کا بدلہ لے کر کوئی جرم نہیں کیا ہے چنانچہ اس نے انہیں معاف کر دیا لیکن گورو کی انصاف پسندی کے اس قابل تحسین مظاہرے سے اس کے چیلوں کا غصہ فرو نہ ہوا اور یہ واقعہ سکھوں اور پٹھانوں کے درمیان مستقل مخاصمت کا باعث بن گیا۔

احمد شاہ ابدالی کے خلاف باغیوں میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ بھی تھا۔ سکھوں نے امرتسر میں گوردوارہ صاحب کی بے حرمتی کے بعد ابدالیوں سے انتقام لینے کے لئے اپنی فوجی طاقت میں بہت اضافہ کر کے پنجاب میں بہت سے قلعے بنا لئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے 67-1762ء کے دوران آخری تین حملے محض سکھوں کی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے کئے تھے۔ ان حملوں کے دوران بھی امرتسر میں سکھوں کے گوردوارہ کو ایک مرتبہ اور اس لئے تباہ و برباد کیا گیا کہ انہوں نے اپنی بغاوتوں کے دوران مسلمانوں کی بہت سی مسجدوں کی بے حرمتی کی تھی۔ مگر اس طرح سکھوں کی طاقت میں کمی ہونے کے بجائے اور بھی اضافہ ہوا۔ احمد شاہ کو اپنے اس مشن میں ناکام ہونے کے باعث مایوس و نامراد ہو کر 1767ء میں واپس لوٹنا پڑا اور سکھ فاتحین نے اس کا تعاقب کر کے راولپنڈی تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کی ناکامی کی ایک وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے سکھ گوریلے پہلے مغلوں اور پھر ابدالیوں کے خلاف طویل مسلح جدوجہد کے بعد ایک بہت بڑی فوجی طاقت بن گئے تھے۔ ان کے مقابلے میں احمد شاہ کی قبائلی فوجوں میں جوش وجذبہ کی مقابلتاً کمی ہوگئی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ احمد شاہ کی اپنی صحت بہت خراب ہوگئی تھی اسے سرطان کا مہلک مرض لاحق ہوگیا تھا۔ تاہم جب وہ 1773ء میں اس مرض سے جاں بحق ہوا تو اس کی سلطنت کا علاقہ پنجاب میں سکھوں کی بغاوتوں کے باوجود بظاہر افغانستان میں دریائے اوکسس (Oxus) سے لے کر ہندوستان میں دہلی تک اور تبت سے لے کر بحر ہند تک پھیلا ہوا تھا۔ ظاہر شاہ تک کابل کے حکمران ابدالیوں کی اس دوسو سالہ پرانی سلطنت کے خواب دیکھتے رہے حالانکہ احمد شاہ کے انتقال کے فوراً ہی بعد اس کی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ اس کے بیٹے تیمور شاہ کا عہد دراصل افراتفری، بدامنی اور بدنظمی کا عہد تھا۔ اس عہد میں نہ صرف لاہور اور راولپنڈی کے علاقے سکھوں کے قبضے میں چلے گئے تھے بلکہ رنجیت سنگھ کے باپ موہا سنگھ کا حسن ابدال تک کے علاقے پر موثر کنٹرول تھا اور سکھ جتھے دریائے سندھ کے شمال کے علاقوں پر بھی کامیاب چھاپے مارتے تھے۔

1792ء میں تیمور شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا شاہ زمان تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے دادا کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان میں اپنی وسیع وعریض سلطنت کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سب سے پہلے 1795ء میں حسن ابدال پر حملہ کر کے وہاں سکھوں کے گوردوارے کو تباہ وبرباد کر دیا اور روہتاس کے قلعے میں سکھ فوج کے یونٹوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ وہ اس موقع پر اس سے آگے نہ جا سکا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے کابل سے عدم موجودگی میں اس کے سوتیلے بھائی محمود نے ہرات میں بغاوت کر دی ہے۔ اس نے تیسرا حملہ 1797ء میں اور پھر چوتھا حملہ 1798ء میں کیا اور ان دونوں حملوں کی بنا پر اس نے قصور کے ایک پٹھان جاگیردار نظام الدین کی امداد سے لاہور میں اپنا اقتدار قائم کر لیا لیکن اس مرتبہ بھی اسے فوراً واپس لوٹنا پڑا۔ چونکہ اس حملے میں رنجیت سنگھ نے شاہ زمان کے مقابلے میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اس لئے درانی بادشاہ اس سکھ نوجوان کے ''غیر جانبدارانہ'' رویے سے بہت متاثر ہوا اور جب رنجیت سنگھ نے دریائے جہلم میں سے شاہ زمان کی فوج کی چند توپیں نکال کر اسے واپس دیدیں تو وہ اس پر بہت ہی خوش ہوا اور اس نے کابل واپسی سے پہلے رنجیت سنگھ کو 1799ء کے اوائل میں لاہور کا وائسرائے مقرر کر دیا۔ شاہ زمان واپس کابل پہنچا تو اس کے تقریباً ایک سال بعد اس کے سوتیلے بھائی محمود نے اسے معزول کر کے اسے اندھا کر دیا اور اس کے بعد افغانستان میں محلاتی سازشوں اور ''انقلابوں'' کا ایسا گھناؤنا سلسلہ شروع ہوا جو بیس پچیس سال تک جاری رہا۔ اس دوران رنجیت سنگھ نے چھوٹے چھوٹے افغان جاگیرداروں کو زیر کر کے پورے پنجاب میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1809ء میں اس کا حکم پٹیالہ سے لے کر راولپنڈی اور حسن ابدال تک چلتا تھا۔ وہ ایک آزاد و خود مختار مہاراجہ تھا اور کسی کو خراج ادا نہیں کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک طاقتور فوج تھی جس میں سکھوں کے علاوہ چند مسلمان جرنیل بھی شامل تھے۔

اسی زمانے میں انگریزوں نے مرہٹوں کو پے در پے شکست دینے کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیا تھا اور یورپ میں نپولین بوناپارٹ فرانس کے گرد ونواح کے کئی ممالک پر قبضہ کرنے کے بعد روس پر بھرپور حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ انگریزوں کو خطرہ لاحق تھا کہ نپولین روس کو فتح کرنے کے بعد براستہ افغانستان اور پنجاب ہندوستان کی سونے کی چڑیا پر قبضہ کر لے گا۔ قبل ازیں وہ جنوبی ہندوستان میں ٹیپو سلطان کی امداد کر کے ہندوستان میں انگریزوں کے روز افزوں

اقتدار کو ختم کرنے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ افغانستان کے بادشاہ شاہ شجاع، جس کا حکم ان دنوں دریائے سندھ تک چلتا تھا، اور پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ، جس کے حکم کی تعمیل پورے پنجاب میں ہوتی تھی، کے ساتھ دفاعی معاہدات کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ان کے ایلچی ماؤنٹ سٹوارٹ الفنسٹون (Stewart Elphinstone) نے 1809ء میں پشاور میں شاہ زمان کے سگے بھائی شاہ شجاع سے، جو آفریدیوں اور دوسرے قبائلیوں کی امداد سے محمود شاہ کو شکست دے کر خود بادشاہ بن گیا تھا، ملاقات کر کے اس سے مجوزہ دفاعی معاہدے پر دستخط کرا لئے۔ ابھی یہ برطانوی ایلچی پشاور میں ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ شاہ شجاع کے سوتیلے بھائی محمود نے تیسری مرتبہ بغاوت کر کے کابل پر قبضہ کر لیا ہے اور اب وہ پشاور کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے اور یہ بھی اطلاع ملی کہ شاہ شجاع نے کشمیر کے گورنر عبداللہ خان کی بغاوت کو کچلنے کے لئے جو فوجیں بھیجی تھیں ان میں سے بیشتر کا مختلف دروں میں صفایا کر دیا گیا ہے۔ شاہ شجاع نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے انگریزوں سے مدد طلب کی مگر ان کے ایلچی کا جواب یہ تھا کہ دفاعی معاہدہ بیرونی حملہ آور کے خلاف کیا گیا ہے۔ حکومت برطانیہ شاہی خاندان کے افراد کی باہمی لڑائیوں میں کسی کا ساتھ نہیں دے گی۔ انگریز ایلچی یہ کورا جواب دے کر واپس ہوا تو حسن ابدال میں اسے اطلاع ملی کہ شاہ شجاع کو محمود شاہ کے ہاتھوں شکست ہو گئی ہے اور جب وہ چند دن بعد حسن ابدال سے راولپنڈی پہنچا تو مملکت افغانستان کا معزول شدہ بادشاہ شاہ زمان بھی، جسے محمود شاہ نے اندھا کر دیا ہوا تھا، اپنے شاہی خاندان کے ساز و سامان اور خواتین کے ہمراہ، وہاں پہنچ گیا۔

جب رنجیت سنگھ کو شاہ شجاع کی شکست کی خبر ملی تو وہ اس وقت ضلع وزیر آباد میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ یہ ضلع قبل ازیں اس کے بھائی کی تحویل میں تھا لیکن اس کے بھائی کی موت کے بعد اس علاقے میں خاندانی جھگڑوں کے باعث کچھ عدم استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ رنجیت سنگھ کو یہ اطلاع بھی ملی کہ پشاور اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ابھی تک شاہ شجاع کے کنٹرول میں ہے اور وہ دفاعی معاہدے کے تحت انگریزوں کی امداد حاصل کرنے کی موہوم امید میں راولپنڈی آ رہا ہے۔ رنجیت سنگھ ایک جابر حکمران اور اعلیٰ پایہ کا منتظم ہونے کے علاوہ نہایت زیرک یا مکار سیاست دان بھی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ افغانستان میں درانی خاندان کے اقتدار کا ستارہ غروب ہو رہا ہے اور اس بنا پر اس کے لئے موقع ہے کہ وہ سیاست گری کے ذریعے دریا کے شمالی

علاقے پر اپنا اقتدار قائم کر لے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر خود شاہ شجاع کا خیر مقدم کیا۔ دونوں بادشاہوں کی ساہیوال میں ملاقات ہوئی جس کا اس لحاظ سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا کہ رنجیت سنگھ نے محمود کے خلاف شاہ شجاع کی امداد کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ تاہم شاہ شجاع کو یہ معلوم کر کے تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ رنجیت سنگھ ملتان اور کشمیر پر قبضہ کی بحالی کے لئے اس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہے لیکن اس کی یہ خوشی بھی بے بنیاد ثابت ہوئی کیونکہ دونوں بادشاہوں کے درمیان اس مفاہمت پر عمل نہ ہو سکا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع کو یوسف زئی اور پشاور کے علاقے کے دوسرے قبیلوں کی جانب سے وفاداری کے پیغامات ملے تھے اور اس کا خیال تھا کہ وہ سکھوں کی امداد کے بغیر ہی اپنی سلطنت بحال کر لے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسے سکھوں کی نیت پر اعتماد نہیں تھا۔ اسے جائز طور پر شبہ تھا کہ رنجیت سنگھ اسے امداد و تعاون کا جھانسہ دے کر خود اپنی سلطنت کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔

شاہ شجاع رنجیت سنگھ سے کوئی معاہدہ کئے بغیر اٹک واپس پہنچا تو اس نے 1810ء میں بعض قبیلوں اور کشمیر کے افغان گورنر کی امداد سے وادی پشاور پر پھر قبضہ کر لیا مگر اس کا یہ اقتدار زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ چند ماہ بعد اس کے قبیلے کے بارک زئی خاندان کے ایک سردار فتح خان نے پشاور پر حملہ کر کے اسے ڈیرہ جات کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہاں سے وہ ملتان پہنچے تو اس صوبہ کا افغان گورنر بڑی سرد مہری سے پیش آیا اور اس نے اسے شہر کی حدود میں بھی داخل نہ ہونے دیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر وہ واپس شمال کی طرف آیا تو اسے معلوم ہوا کہ بعض قبائل میں ابھی تک اس کے حامی موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے ان حامیوں کی امداد سے پشاور پر دو مرتبہ حمدہ کیا۔ پہلی مرتبہ تو شکست ہوئی لیکن دوسری مرتبہ اسے فتح نصیب ہوئی لیکن یہ فتح بھی بہت عارضی ثابت ہوئی۔ 1812ء میں اٹک کے افغان گورنر جہانداد خان نے اس سے غداری کی اور اسے گرفتار کر کے پہلے تو اٹک کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور پھر اسے کشمیر بھیج دیا جہاں وہ تقریباً ایک سال تک جلاوطنی اور بے سروسامانی کی زندگی بسر کرتا رہا۔

دریں اثنا ایک اور واقعہ بھی پیش آ چکا تھا جس نے سکھوں کے عروج اور درانیوں یا ابدالیوں کے زوال کے عمل کو تیز کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح تھی کہ 1811ء میں جب شاہ شجاع ملتان کے علاقے میں ذلیل وخوار ہو رہا تھا تو شاہ محمود پشاور آیا اور پھر یہاں سے وہ

کشمیر کے باغی افغان گورنر کی سرکوبی کے لئے دریائے سندھ کو عبور کر کے راولپنڈی پہنچ گیا۔ چونکہ رنجیت سنگھ نے ان دنوں خود کشمیر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا اور وہ اس مقصد کے لئے پونچھ، بھمبر، راجوڑی اور بعض دوسرے پہاڑی علاقوں کے چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں کو زیر کرنے میں مصروف تھا۔ لہٰذا وہ شاہ محمود کا "پرتپاک خیر مقدم" کرنے کے لئے راولپنڈی پہنچ گیا۔ اس کا "پرتپاک خیر مقدم" کا اصل مقصد یہ تھا کہ شاہ محمود کو کشمیر پر حملہ کرنے سے باز رکھا جائے۔ دونوں کی بادشاہوں کی طرح 1811ء میں راولپنڈی میں ملاقات ہوئی۔ جس کے دوران شاہ محمود نے رنجیت سنگھ کی چرب زبانی اور خوشامد سے متاثر ہو کر اسے بطور تحفہ ایک سجا سجایا گھوڑا دیا۔ پھر دونوں پگڑیاں تبدیل کر کے ایک دوسرے کے "بھائی" بن گئے اور پھر درانی بادشاہ کشمیر پر حملے کا پروگرام ترک کر کے واپس چلا گیا۔

1812ء میں افغانستان کے دونوں معزول شدہ بادشاہوں کی بیگمات، رنجیت سنگھ سے پناہ لینے کے لئے لاہور پہنچیں کیونکہ کشمیر میں ان کا قیام خطرے سے خالی نہیں رہا تھا۔ ان کی اطلاع یہ تھی کہ شاہ محمود کا گورنر فتح خان کشمیر پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ رنجیت سنگھ نے انہیں دلاسہ دیا اور شاہ شجاع کی بیگم سے یہ سودا کیا کہ وہ اس کے شوہر کے لئے کشمیر کی گورنری حاصل کر دے گا تو اسے بطور انعام کوہ نور ہیرا دیا جائے گا۔ اس کا دراصل پروگرام یہ تھا کہ وہ خود کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد شاہ شجاع کو اپنی حراست میں رکھے گا۔ کشمیر میں اس کی فتح کے لئے راستہ تقریباً ہموار ہو چکا تھا کیونکہ اس کے بیٹے کھڑک سنگھ نے جموں پر قبضہ کر لیا تھا لیکن عین اس موقع پر پشاور کا بارک زئی افغان گورنر فتح خان اپنے بادشاہ شاہ محمود کے پرانے پروگرام کے مطابق کشمیر پر حملے کرنے کے لئے راولپنڈی میں وارد ہو گیا۔ رنجیت سنگھ، فتح خان کے "شاہانہ استقبال کے لئے بھی فوراً آگے بڑھا۔ دونوں میں ملاقات ہوئی پگڑیوں کا تبادلہ ہوا اور یہ دونوں بھی ایک دوسرے کے "بھائی" بن گئے۔ رنجیت سنگھ نے وعدہ کیا کہ وہ اٹک اور ملتان کے افغان گورنروں کو ان کی سرکشی کی سزا دے گا اور اس کے اس وعدے کی بنیاد پر یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں مشترکہ طور پر کشمیر پر حملہ کر کے وہاں کے سرکش افغان گورنر کو سزا دیں گے جس نے معزول شدہ بادشاہوں شاہ زمان اور شاہ شجاع کو پناہ دی تھی۔ یہ حملہ 1813ء کے موسم بہار میں ہوا مگر اس کی کامیابی کے بعد رنجیت سنگھ کے ہاتھ کچھ نہ لگا کیونکہ فتح خان کے بقول اس نے اس حملے میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا تھا۔

فتح خان کشمیر میں فتح سے اس قدر مخمور ہوا کہ اسے یاد ہی نہ رہا کہ معزول بادشاہ شجاع کو حراست میں لینا ضروری ہے۔ شاہ شجاع نے اس کی اس غفلت سے فائدہ اٹھایا اور وہ رنجیت سنگھ کے ساتھ لاہور پہنچ گیا۔ اس کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ سکھوں کے ساتھ مل کر اپنے سوتیلے بھائی شاہ محمود کے خلاف لڑائی کرے گا۔ غالباً اس کے اس فیصلے کی بنا پر اٹک کے گورنر جہاندادخان نے شہنشاہ اکبر کا مشہور قلعہ رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔ اس کی دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ جہاندادخان کو خطرہ تھا کہ فتح خان کشمیر سے واپسی پر اس کی سرکوبی کرے گا۔ فتح خان کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو فوراً اٹک پہنچا اور یہاں 13 رجولائی 1813ء کو درانیوں اور سکھوں میں فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ فتح خان کو بری طرح شکست ہوئی کیونکہ بہت سے قبائل نے شاہ شجاع سے وفاداری کے باعث اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ فتح خان کی شکست خوردہ فوج میں اس کا بھائی دوست محمد بھی شامل تھا جو چھ سال بعد افغانستان کا حکمران بنا۔

اٹک کی اس تاریخی لڑائی میں شاندار فتح حاصل کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عزائم بلند سے بلند تر ہو گئے۔ وہ شاہ شجاع کے نام پر نہ صرف کشمیر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ اپنے شاہی مہمان کے وفادار قبائل کی امداد سے وادی پشاور کو بھی اپنی تحویل میں لینے کا عزائم رکھتا تھا اور کوہ نور کے ہیرے پر بھی اس کی نظر تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے ان سارے عزائم کی تکمیل کے لئے شاہ شجاع سے ملاقات کی۔ دونوں میں بڑی ''محبت پیار'' کی باتیں ہوئیں۔ حسب معمول پگڑیوں کا تبادلہ ہوا اور پھر شاہ شجاع نے اپنے ''منہ بولے بھائی'' کو کوہ نور کا ہیرا پیش کر دیا اور ''بھائی'' رنجیت سنگھ نے جواباً اپنے شاہی مہمان کو گزارہ کے لئے پنجاب میں ایک جاگیر عطا کر دی اور وعدہ کیا کہ ''خالصہ'' کابل کے فتح کے لئے اس کی امداد کرے گا۔ 1814ء میں شاہ شجاع کی بیگم دریائے ستلج عبور کر کے برطانیہ کے زیر تحویل شہر لدھیانہ میں پہنچ گئی اور چند ماہ بعد شاہ شجاع بھی وہاں چلا گیا چونکہ رنجیت سنگھ کو اب اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لئے اس نے اس کے برطانوی علاقے میں جانے کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ کی بلکہ بعض روایات کے مطابق اس نے اس سلسلے میں اسے ضروری سہولت مہیا کی۔ شاہ شجاع نے لدھیانہ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد کشتواڑ کے لئے ایک جاگیردار کی امداد سے براستہ کلو کشمیر پر حملہ کر دیا جہاں ابھی تک فتح خان کا بھائی محمد اعظم گورنر تھا۔ شاہ شجاع کو اپنی اس مہم میں کامیابی نہ ہوئی۔ وہ 1816ء میں ناکام و نامراد

ہوکو واپس لدھیانہ پہنچ گیا اور وہاں اپنے خاندان کے ہمراہ برطانیہ کے قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگا۔ محمد اعظم اس سے قبل 1815ء میں رنجیت سنگھ کے ایک حملے کو بھی ناکام بنا چکا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی اس ہزیمت کا ازالہ 1818ء میں کر لیا جبکہ اس نے ملتان کے افغان گورنر کو شکست دے کر اس صوبہ میں دریائے سندھ تک کے سارے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

جب رنجیت سنگھ اپنی سکھ سلطنت کی توسیع کے لئے یہ کارنامہ سرانجام دے رہا تھا تو کابل کی آئے دن کی بادشاہ گردی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا یعنی درانیوں کے ذیلی قبیلوں پلزئی کے خاندان سدوزئی کی جگہ ان کے بارک زئی ذیلی قبیلہ کے خاندان محمد زئی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سدوزئی کا شاہ محمود خود حکومت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اور وہ اس مقصد کے لئے زیادہ تر اپنے محمد زئی وزیر فتح خان پر انحصار کرتا تھا۔ 1818ء میں فتح خان ایرانیوں کے ایک حملے کو پسپا کرنے کے لئے ہرات گیا جہاں کی گورنری کے عہدہ پر شاہ محمود کا ایک بدکردار اور نااہل بیٹا کامران فائز تھا۔ فتح خان نے ایرانیوں پر فتح تو حاصل کر لی مگر اس موقع پر اسے گورنر کامران کی نااہلی اور بدنیتی کی وجہ سے بہت مشکل پیش آئی۔ اس نے کامران کو صوبائی خزانہ کھولنے کی ہدایت کی تو اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر فتح خان نے اپنے چھوٹے بھائی دوست محمد کو ہدایت کی کہ وہ محل میں زبردستی گھس کر کامران کو خزانہ کھولنے پر مجبور کر دے۔ دوست محمد اپنے بڑے بھائی کے حکم کی تعمیل کے لئے اپنے ایک سکھ حلیف جے سنگھ کو بھی ساتھ لے گیا۔ جے سنگھ امرتسر کے نزدیک اٹاری کا رہنے والا تھا اور رنجیت سنگھ کی جابرانہ حکومت سے برگشتہ ہو کر فتح خان سے مل گیا تھا۔ جب یہ دونوں زبردستی محل میں داخل ہوئے تو جے سنگھ نے ایک شہزادی پر دست درازی کی۔ کامران نے اس موقع پر غم وغصہ کا کوئی مظاہرہ نہ کیا بلکہ اس نے وزیر فتح خان کو ہرات کا نجات دہندہ قرار دے کر اسے ترغیب دی کہ وہ شاہ محمود کے دربار میں حاضر ہو کر انعام حاصل کرے۔ فتح خان اس فریب میں آ گیا اور جب وہ اپنی فوجی خدمات کا انعام حاصل کرنے کیلئے بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا تو کامران نے اسے دربار میں لانے کے اصلی مقصد کا اظہار کر دیا۔ اس نے اپنے باپ کو مجبور کیا کہ وہ فتح خان کو انعام دینے کی بجائے اس سے اس بات کا انتقام لے کہ اس نے ایک کافر کو اس کی بہن پر دست درازی کرنے کی اجازت دی تھی۔ چنانچہ کامران کی خواہش پر عمل ہوا اور فتح خان کے جسم کے چھوٹے چھوٹے

ٹکڑے کر کے اسے آہستہ آہستہ موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

شاہ محمود کی سلطنت کے سب سے بڑے ستون فتح خان کے اس وحشیانہ قتل کے بعد مقتول کے قبیلہ اور اس کے حامیوں نے وسیع پیمانے پر بغاوت کر دی۔ اس قبیلہ کا ایک سینئر رکن اعظم خان اس زمانے میں کشمیر کا گورنر تھا۔ جب اسے یہ ہولناک اطلاع ملی تو وہ اپنی فوج لے کر افغانستان پہنچ گیا۔ اس نے چند ہی ماہ میں شاہ محمود کو کابل، غزنی اور قندھار سے بھگا دیا اور اس کا بیٹا کامران بھاگ کر ہرات میں پناہ گزین ہوا لیکن اعظم خان کی اس فتح کے باوجود ملک کو سیاسی استحکام نصیب نہ ہوا اور خانہ جنگی کا سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک جاری رہا۔ اولف کیرو کے بقول رنجیت سنگھ ایسے سنہری موقع کو ضائع کرنے والا نہیں تھا۔ رنجیت سنگھ نے جب 1818ء میں دیکھا کہ کشمیر کا طاقتور افغان گورنر اعظم خان اپنے بھائی جبار خان کو اپنی جگہ گورنر مقرر کرنے کے بعد اپنی بہترین فوجیں لے کر افغانستان چلا گیا ہے تو وہ بھی دریائے سندھ کو عبور کر کے پشاور پہنچ گیا۔ اس وقت پشاور کے گورنر سردار یار محمد خان کے پاس کوئی فوج نہیں تھی تاہم رنجیت سنگھ وہاں نہ ٹھہرا۔ وہ پشاور کی وادی کا ''سروے'' کرنے کے بعد اٹک کے بالمقابل خیر آباد میں واپس آ گیا۔ یہاں اس نے دریائے سندھ کے کنارے کئی قلعے تعمیر کر کے جگہ بہ جگہ اپنی سلطنت کے پیلے جھنڈے لہرا دیئے۔ اس کی پشاور سے واپسی کا اولین مقصد یہ تھا کہ وہ درہ خیبر کے نزدیک اپنا جھنڈا لہرانے سے پہلے کشمیر فتح کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے 1819ء میں اپنے ایک ڈوگرہ صوبیدار گلاب سنگھ کے ہمراہ کشمیر پر حملہ کیا۔ تو اسے اس خوبصورت وادی پر قبضہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گورنر جبار خان کے پاس سکھوں کی مزاحمت کے لئے کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی اور پریم ناتھ بزاز کے بیان کے مطابق دوسری وجہ یہ تھی کہ وادی کشمیر کے عوام افغان گورنروں کے انتہائی ظالمانہ نظام حکومت سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ گورنر جبار خان اپنے بھائی سے بھی زیادہ ظالم و جابر تھا۔ اس کی جبر و تشدد کی پالیسی اس قدر ناقابل برداشت تھی کہ کشمیری عوام ہر قیمت پر اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے لہٰذا رنجیت سنگھ کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوئی۔ وہ آیا، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کر لیا۔ تین دن تک لاہور میں فتح کا جشن منایا گیا۔ افغان حکمرانوں کی حماقت، ان کی ہوس زر اور لوگوں سے زبردستی پیسہ وصول کرنے کی پالیسی ان کی شکست کا باعث بنی۔[2] بے چارے سادہ لوح کشمیری عوام کو معلوم

نہیں تھا کہ انہوں نے ظالم افغان حکمرانوں سے نجات حاصل کر کے اپنے آپ کو ان سے بھی زیادہ ظالم سکھ حکمرانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ سکھوں نے اپنے 27 سالہ عہد اقتدار میں ان پر افغانوں سے بھی زیادہ مظالم کئے۔ ولیم مور کرافٹ (William Moor Kraft) جس نے 1824ء میں کشمیر کا دورہ کیا تھا، کا بیان ہے کہ سکھ حکمران کشمیریوں کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کوئی سکھ کسی کشمیری کو قتل کر دیتا تھا تو اسے سولہ سے لے کر بیس روپے تک جرمانہ کیا جاتا تھا۔ اگر مقتول ہندو ہوتا تھا تو جرمانے کی اس رقم میں سے اس کے خاندان کو چار روپے دیئے جاتے تھے اور اگر مقتول مسلمان ہوتا تھا تو اس کے خاندان کو صرف دو روپے ملتے تھے۔ کشمیر پر افغانستان کے درانیوں یا ابدالیوں کا تقریباً 67 سال تک قبضہ رہا۔

رنجیت سنگھ نے کشمیر پر بآسانی قبضہ کرنے کے بعد کسی بڑی لڑائی کے بغیر ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا اور پھر اس نے ہزارہ کے اس علاقے پر بھی اپنا کنٹرول قائم کر لیا جہاں سے ایک راستہ کشمیر کی طرف جاتا تھا۔ جب کابل میں اعظم خان کو رنجیت سنگھ کی ان دست درازیوں کا پتہ چلا تو وہ 1822ء میں اس سے نبرد آزمائی کے لئے پشاور آ گیا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ خیر آباد پر حملہ کر کے سکھوں سے فیصلہ کن لڑائی لڑے گا مگر اسے فوراً واپس لوٹنا پڑا کیونکہ کابل میں پھر بدامنی شروع ہو گئی تھی اور رنجیت سنگھ بھی پشاور کے گورنر یار محمد خان سے گھوڑوں کا خراج وصول کر کے واپس آ چکا تھا کیونکہ وہ دریائے ستلج پر ایک قلعہ کے بارے میں تنازعہ کا تصفیہ کرنے کے بعد واپس شمال کی طرف آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اعظم خان نے گورنر پشاور کی جانب سے اسے خراج دینے کے واقعہ پر بہت برا منایا ہے اور وہ یار محمد خان کو سزا دینے کے لئے پھر پشاور کی جانب روانہ ہو گیا ہے۔ سردار یار محمد خان تو اعظم خان کے انتقام کے خوف کی بنا پر بھاگ کر سوات چلا گیا لیکن رنجیت سنگھ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ مارچ 1823ء میں نوشہرہ کے نزدیک مشہور و معروف گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں زیادہ تر یوسف زئی، خٹک اور پشاور کے گرد و نواح کے دوسرے غیر منظم قبائل نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا جبکہ اعظم خان اور اس کی افغان فوج نے اس فیصلہ کن تاریخی لڑائی میں تقریباً کوئی حصہ نہ لیا۔ وہ لڑائی کے میدان سے تین میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ لڑائی دو تین دن تک جاری رہی جس کے دوران حریت پسند قبائلیوں کا بے پناہ جانی نقصان ہوا۔ تاہم وہ پیچھے نہ ہٹے اور ایک

موقع پر انہوں نے اتنی زبردست یلغار کی کہ سکھوں کی باقاعدہ فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ یہ فوج پسپا ہونے ہی والی تھی کہ رنجیت سنگھ کی ایک گورکھا بٹالین موقع پر پہنچ گئی اور اس نے قبائلیوں کے حملے کو موثر طریقے سے روک کر انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

جب اعظم خان کو اس صورت حال کا پتہ چلا تو وہ خاموشی سے اسی شام پسپا ہو کر کابل روانہ ہو گیا۔ وہ 1826ء میں کابل میں مر گیا لیکن پشاور کی وادی کے قبائل اور دوسرے عوام نے درانی خاندان کی بزدلی اور غداری کو آج تک فراموش نہیں کیا۔ وہ کابل کے درانی خاندان سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ اس نے ان سے غداری کر کے انہیں انتہائی جابر و ظالم سکھا شاہی کے سپرد کر دیا تھا۔ الیگزینڈر برنز (Alexander Burnes) کی رائے یہ ہے کہ اعظم خان کے بھاگنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسے اپنے خزانے کے لٹنے کا خطرہ تھا اور دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کی افغان فوج سکھوں کے پر جوش نعروں سے خوفزدہ ہو گئی تھی لیکن اس معرکے میں سکھوں کی شاندار فتح اور درانیوں کی عبرتناک شکست کی اصلی اور بنیادی وجہ کچھ اور ہی تھی اور وہ یہ تھی کہ افغانستان میں ابدالیوں کے 76 سالہ عہد اقتدار میں وہاں عوام نے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی طور پر کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ وہ بالکل اسی طرح قبائلی طریقے سے زندگی گزارتے تھے جس طرح کہ ان کے آباؤ اجداد سینکڑوں سال پہلے گزارا کرتے تھے اور پشاور کی وادی کے عوام بھی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے وہیں کھڑے تھے جہاں کہ سینکڑوں سال قبل ان کے آباؤ اجداد نے ڈیرے ڈالے تھے۔ ان کے برعکس رنجیت سنگھ کے دور میں پنجاب کے سکھ عوام ایک ترقی یافتہ جاگیردارانہ دور میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی تنظیمی صلاحیت قبائلیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور معاشرتی طور پر ارتقا پذیر ہونے کے باعث ان میں اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے بے پناہ جوش و جذبہ پایا جاتا تھا۔ علاوہ بریں رنجیت سنگھ نے گورکھوں کی امداد سے بھی اپنی فوجی طاقت میں بہت اضافہ کیا ہوا تھا اور اس کی فوج نے فرانسیسیوں سے توپ خانے کے بہتر استعمال کا طریقہ بھی سیکھ رکھا تھا۔

رنجیت سنگھ نوشہرہ میں فتح حاصل کرنے کے بعد پشاور کی طرف بڑھا تو اس نے راستے میں ہر جگہ ایسی تباہی مچائی، ایسی لوٹ مار کی اور اتنا خون بہایا کہ اس علاقے کے لوگ آج تک اس عظیم المیہ کو فراموش نہیں کر سکے۔ اس نے پشاور میں بالا حصار کو تباہ و برباد کر دیا، باغات اجاڑ

دیئے اور مسجد یں پیوست زمیں کر دیں۔ ان میں وہ شاندار مسجد بھی شامل تھی جو اورنگ زیب نے تعمیر کرائی تھی۔ پشاور میں کئی دن تک اتنی تباہی ہوئی کہ آج بھی اس تاریخی شہر میں کوئی تاریخی عمارت نظر نہیں آتی۔ سکھوں نے چن چن کر ساری عمارتوں کو منہدم کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ اس بے مثال تباہ کاری اور غارت گری کے بعد واپس لوٹا تو وہ اپنے ایک جرنیل ہری سنگھ نلوا کو پشاور کی وادی کا کمانڈر مقرر کر گیا۔ ہری سنگھ بڑا وفادار اور بہادر جرنیل تھا اور اس کے ظلم وستم کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ تاہم وہ مقبوضہ علاقے میں امن وامان قائم نہ کر سکا۔ اعظم خان کی غداری اور بزدلی کے باوجود پشاور اور اس کے گردونواح کے حریت پسند قبائل سکھا شاہی کی غلامی قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ نوشہرہ کی لڑائی کے تقریباً ایک سال بعد 1824ء میں اٹک کے بالائی علاقے میں دریائے سندھ کی دونوں جانب یوسف زئی اور دوسرے قبائل نے ایک شخص سید اکبر شاہ کی زیر قیادت زبردست بغاوت کر دی۔ مغلوں نے اس شخص کے آباؤ اجداد کے تقویٰ، پرہیزگاری اور اثر ورسوخ کے پیش نظر انہیں سوات کے علاقے میں ایک جاگیر عطا کر رکھی تھی۔ اکبر شاہ خود بھی بہت نیک تھا اور قبائلی عوام اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ نوشہرہ کی لڑائی میں بھی بڑی بے جگری سے لڑا تھا۔ ہری سنگھ نے اس کی بغاوت کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اس نے اس مقصد کے لئے ہزارہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور وہ وہاں سے باغی قبائلیوں پر پے در پے حملے کرتا رہا۔ ایک مرتبہ اس نے تارا کے قبائلیوں پر بہت بڑا حملہ کیا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی اور اس کی باقاعدہ فوج کو بہت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نے کچھ عرصہ بعد سید اکبر شاہ کے ہیڈ کوارٹر ستانا پر حملہ کیا مگر اس مرتبہ بھی اسے ناکامی ہوئی۔ تیسری مرتبہ اس نے ایک فرانسیسی جرنیل ایلرڈ (Allard) کی امداد سے ٹوپی کے علاقے پر حملہ کیا جس میں اسے کچھ کامیابی ہوئی اور وہ راستے میں لوٹ مار وقتل وغارت کا بازار گرم کرتے ہوئے براستہ جہانگیر آباد واپس اٹک پہنچا۔ اس کی فوجی طاقت کے اس مظاہرے سے یوسف زئی اور خٹک قبیلوں کی بغاوتوں کا سلسلہ تو ختم نہ ہوا البتہ پشاور کے درانی گورنر یار محمد نے اسے اپنی وفاداری کا ایک مرتبہ اور یقین دلایا۔

1827ء میں سید اکبر شاہ کی جدوجہد آزادی کو بہت تقویت ملی جبکہ سید احمد شاہ بریلوی اپنے مجاہدین کے ہمراہ بریلی، گوالیار، راجپوتانہ، سندھ، کوئٹہ، قندھار اور کابل کے راستے تقریباً تین ہزار میل کی مسافت طے کر کے پشاور پہنچا۔ اس طویل سفر کے دوران سید احمد کو افغانستان کے

حکمرانوں سے کوئی امداد نہیں ملی تھی حالانکہ اس کے سارے جنگی منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ اسے سکھوں کے خلاف جہاد میں اسلامی مملکت افغانستان سے ہر طرح کی امداد ملتی رہے گی۔ غالباً اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ افغان حکمرانوں کو نوشہرہ کی لڑائی کے بعد سکھوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ 1826ء میں اعظم خان کا انتقال ہو چکا تھا اور ڈبلیو۔ کے۔ فریزر۔ ٹٹلر (W.K. Freser Tutler) کے بیان کے مطابق اس نئے حکمران کا دائرہ اختیار کابل سے تقریباً ایک سو میل تک ہی محدود تھا۔[3] ہرات پر شاہ محمود کا قبضہ تھا اور قندھار بھی دوست محمد خان کے کنٹرول سے باہر تھا۔ سید احمد کو پشاور میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پشاور کا بارک زئی گورنر یار محمد خان دو مرتبہ رنجیت سنگھ کو وفاداری کا یقین دلا چکا تھا اور اس بنا پر اس علاقے کے یوسف زئی اور دوسرے قبائل کے حریت پسند عوام افغان حکمرانوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ان قبائلیوں نے سکھوں کے سوا کبھی کسی سے شکست نہیں کھائی تھی اور وہ اس کی ذمہ داری کابل کے درانی غداروں پر عائد کرتے تھے۔ پورے علاقہ سرحد میں ہری سنگھ اور اس کی فوجوں نے ہر طرح کی تباہی مچا رکھی تھی اور پٹھان عوام کے جان و مال اور ان کی عزت و آبرو کی کوئی قیمت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ یوسف زئی، خٹک اور دوسرے قبائل کے حریت پسند عوام نے سید اکبر شاہ کی زیر قیادت سید احمد بریلوی کے نعرہ تکبیر پر لبیک کہا اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک ہزار مجاہدین کی فوج تیار ہوگئی۔ اس فوج کا پہلا معرکہ 1828ء میں اکوڑہ اور جہانگیرہ کے درمیان ایک سکھ جرنیل بدھ سنگھ سدھن والیا سے ہوا جس میں سید احمد کو پہلی فتح نصیب ہوئی۔ اس لڑائی میں بدھ سنگھ بھی مارا گیا تھا۔ سید احمد نے اپنی کامیابی کے بعد پشاور کے نام نہاد گورنر یار محمد سے ایک معاہدے پر دستخط کروائے جس میں قرار دیا گیا تھا کہ وہ آئندہ یوسف زئی کے علاقوں میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔ 1829ء میں سید احمد نے پہلے تو الزام عائد کیا کہ پشاور کا غدار گورنر یار محمد خان اسے زہر دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہے اور پھر اس الزام کی بنا پر اس نے پشاور پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں یار محمد خان مارا گیا مگر ایک فرانسیسی جرنیل کی زیر کمان سکھوں کی فوج کی بروقت مداخلت کی بنا پر سید احمد پشاور پر قبضہ نہ کر سکا۔ سکھوں نے یار محمد خان کی جگہ اس کے بھائی سلطان محمد خان کو پشاور کا گورنر مقرر کر دیا اور اس پٹھو نے اپنی شکر گزاری کے اظہار کے لئے رنجیت سنگھ کے لئے ایک اعلیٰ نسل کی گھوڑی کا خراج پیش کیا۔

سید احمد کے عزم وحوصلہ پر اس شکست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ فوراً ہی ہزارہ کی پہاڑیوں میں پہنچا اور وہاں اس نے قبائلیوں کا ایک لشکر جمع کر کے پہلے ہری سنگھ کی فوج پر اور پھر فرانسیسی جرنیل ایلرڈ کی زیر کمان سکھ فوج پر حملے کئے۔ ان دونوں حملوں میں اسے شکست ہوئی مگر وہ ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ اس نے ہزارہ سے پھر شمال کی طرف رخ کیا اور 1830ء میں سکھوں کے نئے پٹھو گورنر سلطان محمد کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کر لیا جو تقریباً دو ماہ تک قائم رہا۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے اپنا ایک سکہ بھی جاری کر دیا تھا۔ اولف کیرو کا کہنا ہے کہ اس دوران سید احمد بریلوی نے کچھ ایسی مذہبی سخت گیری کا مظاہرہ کیا کہ یوسف زئی کے لوگ اس سے برگشتہ ہو گئے۔ اس نے پہلے تو جنگی مہمات کے اخراجات کی تکمیل کے لئے دس فیصد ٹیکس (عشر) عائد کر دیا اور پھر یہ حکم صادر کیا کہ سارے قبائل کی جوان لڑکیوں کی اس کے ہندوستانی مجاہدین سے شادیاں کر دینی چاہئیں۔ یوسف زئی کے سرداروں کو پہلے حکم پر تو کوئی خاص اعتراض نہیں تھا لیکن انہوں نے دوسرے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان میں اپنے قبیلے سے باہر شادیاں کرنے کا رواج نہیں تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ دولہا کے خاندان سے بھاری رقم وصول کئے بغیر اپنی کسی لڑکی کی شادی نہیں کرتے تھے۔[4] چونکہ سید احمد بریلوی کا یہ اسلامی حکم یوسف زئی قبیلہ کی معاشرتی روایات اور مالی مفادات کے منافی تھا اس لئے وہ اپنے ہندوستانی لیڈر کی وفاداری سے منحرف ہو گئے۔ سید احمد اپنے حلیفوں کے اس رویے سے برگشتہ ہو کر نومبر 1830ء میں پشاور کی گورنری مقررہ خراج کے عوض پھر سلطان محمد خان کو دینے پر مجبور ہو گیا۔ وہاں سے وہ اپنے مٹھی بھر وفادار مجاہدین کے ہمراہ ہزارہ پہنچا جہاں اس کی سکھوں کے ساتھ چند ایک جھڑپیں ہوئیں۔ بالآخر مئی 1831ء میں سکھوں نے وادی کاغان میں بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد اور اس کے مجاہدین پر اچانک حملہ کر کے ان کا صفایا کر دیا۔ خود سید احمد بھی اس معرکے میں شہید ہو گیا۔ اس المیہ کے چند سال بعد تک سکھوں کے خلاف تحریک آزادی کی شمع ٹمٹماتی رہی لیکن بالآخر یہ سرحد کے عوام کے فرسودہ قبائلی نظام کی تاب نہ لا کر خاموش ہو گئی۔ اس زمانے میں پٹھان عوام کی دقیانوسی قبائلی روایات، رجعت پسندانہ رسوم ورواج اور باہمی رقابتیں وعداوتیں انہیں لمبے عرصے کے لئے منظم جدوجہد آزادی کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔

سید احمد کی شہادت کے بعد لدھیانہ میں شاہ شجاع کے سینے میں کابل کے تخت پر قبضہ

کرنے کی خواہش پھر پیدا ہوئی۔ اس نے 1832ء میں جبکہ ہرات پر ایرانیوں نے پھر حملہ کر دیا تھا اور سندھ کے امیروں نے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر کے ہر قسم کی امداد دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی، اپنی سلطنت کی بحالی کے لئے رنجیت سنگھ سے بات چیت کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ شاہ شجاع اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس قدر بیتاب تھا کہ اس نے اس بات چیت کے نتیجے میں اگست 1833ء میں رنجیت سنگھ سے ایک معاہدہ کیا جس میں قرار دیا گیا تھا کہ اگر وہ سکھوں کی امداد سے کابل کے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ دریائے سندھ کے شمال میں پشاور کا سارا علاقہ رنجیت سنگھ کو دے دے گا۔ اس معاہدے کے بعد اس نے جب اپنی مہم کا آغاز کیا تو سب سے پہلے سندھ کے امیروں کو شکست دی، جو اس کی امداد کے وعدے سے منحرف ہو گئے تھے۔ پھر اس نے براستہ درہ بولان قندھار کا رخ کیا جہاں اس نے جولائی 1834ء میں امیر دوست محمد خان سے نبرد آزمائی کے بعد بری طرح شکست کھائی۔ جب وہ 1835ء کے اوائل میں لدھیانہ واپس پہنچا تو اس کی ساری امیدیں خاک میں مل چکی تھیں جبکہ وہ خود ہی پشاور تک کا علاقہ سکھا شاہی کے حوالے کر چکا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اس اثنا میں دوست محمد خان کی قندھار کے نزدیک شاہ شجاع کے خلاف لڑائی میں مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر مئی 1834ء میں پشاور پر حملہ کر کے اسے بآسانی اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا تھا۔ جس سکھ فوج نے اس مقصد کے لئے خیر آباد سے حملہ کیا تھا اس کا کمانڈر ہری سنگھ تھا جو پہلے ہی کئی لڑائیوں میں اپنی شجاعت و بہادری کا سکہ جما چکا تھا۔ جب ہری سنگھ پشاور پہنچا تو بارک زئی گورنر سردار سلطان محمد خان بھاگ کر کابل میں دوست محمد خان کی پناہ لینے پر مجبور ہو گیا حالانکہ اس کے بھائی یار محمد خان کی اعظم خان کے خلاف غداری کے باعث ان دونوں کے خاندانوں میں مخاصمت پائی جاتی تھی۔ ہری سنگھ پشاور کا پہلا سکھ گورنر مقرر ہوا اور اس نے اپنے تین سالہ عہد اقتدار کے دوران عوام الناس پر اس قدر مظالم کئے کہ پٹھان مائیں ہری سنگھ کا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔

امیر دوست محمد خان کو سکھوں کی سلطنت کی اس توسیع سے سخت صدمہ پہنچا لیکن وہ فوری طور پر خود سکھوں کے مقابلے میں آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس نے اپنے ایک بھتیجے کو بظاہر بطور طالب علم لدھیانہ بھیج کر انگریزوں سے امداد طلب کی مگر وہاں سے اسے کوئی غیر مبہم جواب موصول نہ ہوا۔ دریں اثنا رنجیت سنگھ نے اپنے پٹھو سردار سلطان محمد خان سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کر کے اس

امر کو یقینی بنا لیا تھا کہ اگر کبھی دوست محمد خان نے پشاور پر حملہ کیا تو سلطان محمد خان کی غداری کے باعث اسے عبرتناک شکست ہوگی۔ سلطان محمد خان مجوزہ غداری پر اس خدشہ کی بنا پر آمادہ ہوگیا تھا کہ سکھوں کی شکست کی صورت میں اسے پشاور کی گورنری کبھی نہیں ملے گی۔ مئی 1835ء میں دوست محمد خان اپنا لشکر لے کر جمرود پہنچا تو رنجیت سنگھ نے اس سے فوراً لڑنے کی بجائے اسے گفت وشنید میں مصروف کر لیا۔ جب چند دن میں سکھوں کی فوجیں موقع پر جمع ہوگئیں تو 11 رمئی کو دوست محمد خان نے اپنے آپ کو ان کے محاصرے میں پایا۔ پروگرام کے مطابق سکھوں کا حملہ 12 رمئی کو ہونا تھا۔ جب دوست محمد خان کو اس سنگین صورت حال کا احساس ہوا تو وہ فوراً پسپا ہوگیا۔ اس کا نقصان صرف دو توپوں اور بے شمار شاہانہ وقار پر مشتمل تھا۔ اس کا اپنا منصوبہ یہ تھا کہ اس کا مصاحب سردار سلطان محمد خان سکھ نمائندوں کو اغوا کر لے گا اور پھر وہ انہیں بطور یرغمال استعمال کر کے رنجیت سنگھ سے پشاور کے بارے میں سودا بازی کرے گا۔ یہ منصوبہ محض اسے لئے کامیاب نہ ہوا کہ جس مصاحب، یعنی سردار سلطان محمد خان نے اسے جامہ عمل پہنانا تھا وہ خفیہ طور پر رنجیت سنگھ سے ملا ہوا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اس کی اس خدمت کے عوض اسے اور اس کے رشتہ داروں کو پشاور اور کوہاٹ میں بڑی بڑی جاگیریں دیں مگر پشاور کی گورنری کے بارے میں سلطان محمد خان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اس علاقے کا سول اور فوجی نظام ہری سنگھ کے ہاتھ میں ہی رہا۔

دوست محمد خان اپنی اس ہتک اور ہزیمت سے بہت رنجیدہ و ملول ہوا اس نے رنجیت سنگھ سے انتقام لینے کے لئے انگریزوں سے رابطہ قائم کیا تو وہاں سے حسب سابق کوئی واضح جواب نہ ملا۔ پھر اس نے رنجیت سنگھ سے صلح کے لئے رابطہ پیدا کیا تو اس نے بطور خراج گھوڑے طلب کئے۔ ہری سنگھ نے جمرود کے نزدیک پہلے ہی قلعے کی تعمیر شروع کر دی تھی اور وہ درہ خیبر پر قبضہ کرنے کے بعد جلال آباد پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ لہٰذا دوست محمد خان کے پاس لڑنے کا فیصلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے اپنے بیٹے اکبر خان کی زیر کمان ایک لشکر بھیجا۔ اکبر خان اپریل 1837ء کے وسط میں خیبر پہنچا اور 30 راپریل کو اس نے جمرود کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ اس کی فوج اس حملے میں قلعہ تو فتح نہ کر سکی البتہ اس قلعہ کی فوج کی امداد کے لئے ہری سنگھ کی زیر کمان پشاور سے جو کمک آئی تھی اس میں بھگدڑ مچ گئی۔ قبائیلیوں نے درہ کے دونوں طرف کی پہاڑیوں سے سکھوں پر حملے کئے تو وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے اور اس پسپائی کے دوران

جرنیل ہری سنگھ نلوا ہلاک ہو گیا لیکن اکبر خان اس کے باوجود نہ تو جمرود کا قلعہ فتح کر سکا اور نہ ہی اس سے پشاور پر قبضہ ہوا۔ اس کی فوج نے باڑہ کے نزدیک پشاور کے گردونواح کے دیہات میں لوٹ مچائی اور بالآخر کوئی فوجی مقصد حاصل کئے بغیر جلال آباد واپس ہو گیا۔ سکھوں نے اپنے جرنیل ہری سنگھ کی موت کے بعد اکبر خان کی قدم قدم پر مزاحمت کی تھی اس لئے اس لڑائی کے نتیجے میں سکھا شاہی کا خاتمہ نہیں ہو سکا تھا۔ رنجیت سنگھ کو جب اپنے بہادر اور وفادار جرنیل ہری سنگھ کی موت کی خبر ملی تو وہ بہت اشکبار ہوا۔

اس نے اس کی موت کا انتقام لینے کے لئے اپنے ایک ڈوگرہ جرنیل دھیان سنگھ کی زیر کمان ایک بہت بڑی فوج پشاور بھیجی اور ہری سنگھ کی جگہ اپنی فوج کے ایک اطالوی جرنیل ایوتابل (Avitabile) کو پشاور کا گورنر مقرر کر دیا۔ یہ شخص عوام الناس پر جبر و استبداد کے معاملے میں ہری سنگھ سے بھی دو قدم آگے تھا۔ یہ ہر مقدمے کی سرسری سماعت کے بعد فیصلہ کرتا تھا اور جسے مجرم قرار دیتا تھا اسے فوراً مسجد مہابت خان کے مینار کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دے دیتا تھا۔

باب:2

برطانیہ کی فارورڈ پالیسی کے تحت افغانستان کی بفرسٹیٹ

جب 1838ء میں جمرود کی لڑائی ہو رہی تھی تو برصغیر کے بیشتر علاقوں پر برطانوی سامراج کا اقتدار اعلیٰ قائم ہو چکا تھا اور اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ 1812ء میں نپولین کی روس میں عبرتناک شکست کے بعد فرانسیسی سامراج عالمی سطح پر اس کا رقیب نہیں رہا بلکہ اس کی جگہ روسی سامراج لے رہا ہے۔ روس نے نپولین کو شکست دینے کے بعد دس پندرہ سال میں اتنی فوجی طاقت مجتمع کر لی تھی کہ وہ اپنے گرد و نواح کی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کو اپنے زیر نگیں کرنے لگا تھا۔ اس کی زیادہ تر توجہ وسطی ایشیا کی طرف تھی اور اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ اس علاقے کو زیر تسلط کرنے کے بعد برصغیر کی سونے کی چڑیا کی طرف رخ کرے گا۔ اس نے 1828ء میں ایران کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے اس سے کاکیشیا کا علاقہ ہتھیا لیا تھا اور اس طرح ترکستان کی طرف اس کی پیش قدمی کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں رہی تھی۔ ایک انگریز سفارتی نمائندے الیگزینڈر برنز کی 1832ء کی رپورٹ یہ تھی کہ روسی ایشیا اور ہندوستان کی برطانوی سلطنت کے درمیان اب صرف وسطی ایشیا میں بخارا، خیوا اور کوہ قند کی چھوٹی چھوٹی قرون وسطیٰ کی دقیانوسی ریاستیں اور افغانستان و شمالی ہندوستان میں درانیوں اور سکھوں کی غیر مستحکم سلطنتیں باقی رہ گئی ہیں۔

روسی سامراج کے عزائم کے بارے میں الیگزینڈر برنز کی یہ رپورٹ اور اس کے بعد کی موصول شدہ اطلاعات قدرتی طور پر برطانوی سامراج کی ایجنٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت

کے لئے پریشان کن تھیں۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ (Auckland) نے یہ فیصلہ کیا کہ سکھوں اور افغانوں میں کوئی مفاہمت کرا کے اس سارے علاقے میں سیاسی استحکام پیدا کرنا چاہیے۔ ان دونوں کے درمیان تنازعہ کی اصل وجہ پشاور کی سرسبز وشاداب وادی تھی اور اس تنازعہ کے پرامن تصفیہ کے بغیر شمالی علاقے میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ آک لینڈ اپنے سفارتی نمائندے الیگزینڈر برنز کی ابتدائی رپورٹوں سے متاثر ہوا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر یہ وادی دوست محمد خان کو مل جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اولف کیرو کے بیان کے مطابق اسے نہیں معلوم تھا کہ اس وادی کے یوسف زئی اور دوسرے قبائل درانیوں سے اتنی ہی نفرت کرتے ہیں جتنی کہ وہ سکھوں سے کرتے تھے لیکن الیگزینڈر برنز لارڈ آک لینڈ کا پیغام لے کر کابل پہنچا اور کیپٹن کلاڈ ویڈ (Claude Wade) لاہور میں رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوا۔ کیپٹن ویڈ کو لاہور میں کوئی سفارتی کامیابی نہ ہوئی کیونکہ رنجیت سنگھ پشاور کی وادی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ البتہ کابل میں دوست محمد خان نے انگریزوں کے مصالحتی کردار کا خیر مقدم کیا کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ پشاور اور اس کے گردونواح کے تین چار اضلاع افغانستان کو ملنے چاہئیں۔ موہن لال کے بیان کے مطابق برنز اس میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا کہ پشاور کا علاقہ معزول سردار سلطان محمد خان کی تحویل میں دیدیا جائے۔ دوست محمد خان اس تجویز کے سخت خلاف تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ یہ علاقہ اگر سردار سلطان محمد خان کی بجائے سکھوں کے قبضے میں ہی رہے تو اس کے حق میں بہتر ہوگا لیکن رنجیت سنگھ کو ان دونوں تجویزوں میں سے کوئی بھی منظور نہیں تھی۔ پشاور اس کے قبضہ میں تھا اور وہ اس سے دستبردار ہونے پر ہرگز آمادہ نہیں تھا۔

لارڈ آک لینڈ اس مشن میں ناکام ہوا تو اس نے الیگزینڈر برنز کے مشورے کے مطابق لدھیانہ میں شاہ شجاع الملک کی طرف توجہ کی اور یہ فیصلہ کیا کہ کابل میں اس شخص کو دوست محمد خان کی جگہ تخت نشین کرا دیا جائے۔ شاہ شجاع قبل ازیں 1833ء میں ایک معاہدے کے ذریعے دریائے سندھ کے شمال میں پشاور تک کا علاقہ رنجیت سنگھ کو دے چکا تھا۔ آک لینڈ کا خیال تھا کہ شاہ شجاع انگریزوں کے ایک طفیلی بادشاہ کی حیثیت سے افغانستان پر حکومت کرے گا اور رنجیت سنگھ سرحدی اضلاع پر اپنے قبضہ کو تسلیم کروانے سے مطمئن ہو جائے گا۔ چنانچہ 25 رجون 1838ء کو تینوں فریقوں میں ایک معاہدہ ہوا جس میں 1833ء کے معاہدے کی توثیق کر کے

پشاوراوردوسرے سرحدی اضلاع پر رنجیت سنگھ کے قبضہ کو قانونی طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ معاہدے کی پہلی شق یہ تھی کہ شاہ شجاع، اس کے وارث، جانشین اور سدوزئی کے سارے ارکان کشمیر، اٹک، چھچھ، ہزارہ، کبل، امب اور اس کی ذیلی ریاستوں، پشاور اور اس کے ساتھ یوسف زئی کے علاقوں، خٹکوں کے علاقوں، ہشت نگر، مچنی، کوہاٹ، ہنگو اور پشاور سے ملحقہ درہ خیبر کے علاقوں بنوں، وزیرستان، دور، ٹانک، کورانگ، کالا باغ وخوشحال گڑھ اور اس سے ملحقہ اضلاع، ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان، بالائی سندھ میں کچے کے تین علاقوں اور صوبہ ملتان پر سے اپنے سارے حقوق اور دعاوی سے دستبردار ہوتے ہیں اور ان علاقوں پر رنجیت سنگھ کے قبضے کو قانونی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ معاہدے کی دوسری شق یہ تھی کہ شاہ شجاع مہاراجہ کو 55 خوش رنگ اور دل پسند چال ڈھال کے گھوڑے دے گا اور مہاراجہ اس کے بدلے میں شاہ شجاع کو 55 کشمیری شالیں دے گا۔ شاہ شجاع دریائے کابل کے راستے میٹھے سردے پیش در بھیجے گا اور مہاراجہ اس کے بدلے میں پشاور کے باڑہ چاول کی 55 بوریاں دے گا اور جب کبھی دونوں کی فوجیں ایک ہی جگہ پڑاؤ کریں گی تو گائے کا ذبیحہ نہیں کیا جائے گا۔ ایک اور شق میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب کبھی شاہ شجاع اور انگریزوں کی فوجیں کابل میں دوست محمد خان کی حکومت کے خلاف کاروائی کریں گی تو وہ اپنی فوج میں سے پانچ ہزار مسلمان سپاہی بطور امداد کرے گا۔

اس معاہدے کے تقریباً ایک سال بعد 1839ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو اس کے خاندان کے مختلف ارکان کے درمیان اقتدار کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی اور اس طرح انگریزوں کے نقطہ نگاہ سے اس معاہدے کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ ان کا منصوبہ تو یہ تھا کہ کابل میں اپنے ایک پٹھو بادشاہ شاہ شجاع کو تخت پر بٹھایا جائے گا۔ پشاور تک کے شمال مغربی علاقے پر رنجیت سنگھ کے قانونی قبضہ کو تسلیم کیا جائے گا اور اس طرح روسی وسط ایشیا اور برصغیر کی برطانوی سلطنت کے درمیان اس سارے علاقے کو اپنی بالادستی کے تحت ایک بفر (Buffer) علاقہ بنایا جائے گا لیکن رنجیت سنگھ کی موت کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان کے پیش نظر اس منصوبے کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا انگریزوں نے 1840ء میں افغانستان پر حملہ کر دیا۔ نومبر میں دوست محمد خان کی فوجوں نے ہتھیار ڈالے تو اسے گرفتار کر کے ہندوستان میں قید کر دیا گیا اور اس کی جگہ شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس کامیابی کے بعد کابل میں

انگریزوں کے سفیر سرولیم میکناٹن (Macnaughten) نے کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو یہ تجویز پیش کی کہ شاہ شجاع کے اقتدار کو مستحکم کرنے کی غرض سے دریائے سندھ تک ان علاقوں کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے جن سے وہ خود دو مرتبہ دستبردار ہو چکا ہے لیکن اس تجویز کے بارے میں کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے 1841ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے پیش نظر انگریزوں کو شمال مغربی ہندوستان اور افغانستان کے بارے میں اپنی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کرنا پڑی۔ یہ واقعہ نومبر 1841ء میں رونما ہوا۔ اس کی تفصیل یہ تھی کہ افغانستان کے عوام نے انگریزوں کے پٹھو بادشاہ شاہ شجاع کے خلاف کامیاب بغاوت کر کے نہ صرف اسے قتل کر دیا بلکہ بعض انگریز فوجی افسروں کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ جنوری 1842ء میں کابل میں مقیم برطانوی فوج نے باغیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ اپنے مشن میں ناکام و نامراد ہو کر واپس ہندوستان آنے پر آمادہ ہو گئی مگر اس فوج کے بیشتر ارکان ہندوستان کی سرحد تک نہ پہنچ سکے۔ وہ یا تو راستے میں سخت سردی کی وجہ سے مارے گئے یا انہیں افغان چھاپہ ماروں نے ہلاک کر دیا۔ انگریزوں نے اپنی اس شکست کا بدلہ اسی سال اکتوبر میں لیا جبکہ انہوں نے افغانستان پر ایک اور حملہ کر کے کابل کو فتح کر لیا۔ اس حملے میں بہت سے افغان عوام اور فوجی جاں بحق ہوئے اور روس کے وسطی ایشیا کے علاقوں سے متصل افغانستان میں برطانوی سامراج کی بالادستی کا جھنڈا لہرانے لگا۔ 1843ء میں دوست محمد خان کو انگریزوں کی شرائط کے تحت واپس کابل آنے کی اجازت دے دی گئی کیونکہ افغان عوام کی 1841ء کی زبردست بغاوت کے بعد شاہ شجاع کے خاندان کے کسی رکن کی تخت نشینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پروفیسر نارمن براؤن (Norman Brown) اور بعض دوسرے امریکی اور یورپی مؤرخین کا بیان ہے کہ انگریزوں نے پہلی افغان جنگ میں جو ہزیمت اٹھائی تھی اس کے پیش نظر انہوں نے برصغیر کے شمال مغربی علاقوں میں روس کے خلاف گرینڈ سٹرٹیجی (Grand Strategy) یا فارورڈ پالیسی پر عمل شروع کیا تھا۔ انہوں نے اسی سٹرٹیجی یا پالیسی کے تحت 1843ء میں سندھ پر قبضہ کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ سندھ کے میروں نے پہلی افغان جنگ میں انگریزوں کی ہزیمت کے بعد سر چارلس نیپیئر (Charles Napier) کے مطالبے کے مطابق معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انہوں نے میانی اور حیدر آباد کی لڑائیوں میں بڑی سخت مزاحمت کے بعد

ہتھیار ڈالے تھے۔ بعد ازاں انگریزوں نے اسی گرینڈ سٹریٹجی یا فارورڈ پالیسی کے تحت 1845-46ء میں سکھوں کو شکست دے کر پنجاب میں ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقے پر قبضہ کرلیا اور وادی کشمیر کے علاقے کو سکھوں کے ایک صوبیدار گلاب سنگھ کے پاس 15 لاکھ پونڈ کے عوض فروخت کر دیا۔ گلاب سنگھ پر یہ عنایت اس لئے کی گئی تھی کہ اس نے 1840-41ء میں پہلی افغان جنگ اور 1845-46ء میں پہلی سکھ جنگ میں انگریزوں سے تعاون کیا تھا۔ لیکن پشاور کے ایک سابق گورنر سردار سلطان محمد خان نے انگریزوں اور سکھوں کے درمیان اس پہلی جنگ میں سکھوں سے تعاون کیا تھا اور سکھوں نے اسے پھر پشاور کا گورنر بنا دیا تھا کیونکہ اس نے پشاور میں متعین ایک انگریز ایلچی جارج لارنس (George Lawrence) کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ وہی سردار سلطان محمد خان تھا جس نے 1835ء میں امیر دوست محمد خان سے غداری کر کے رنجیت سنگھ سے جاگیریں حاصل کی تھیں۔ اپریل 1848ء میں سکھوں نے ملتان میں انگریزوں کے دو ایلچیوں ایگنیو (Agnew) اور اینڈرسن (Anderson) کو قتل کر دیا تو بظاہر یہ واقعہ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری جنگ کا باعث بنا لیکن اس فیصلہ کن جنگ کی اصلی اور بنیادی وجہ برطانوی سامراج کی فارورڈ پالیسی میں ہی مضمر تھی۔ انگریز دوست محمد خان کی وفاداری پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور ان کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ شمال مغربی ہندوستان کے سارے علاقے کو براہ راست اپنے زیر تسلط کر کے اور پھر کابل پر اپنی بالادستی کو مستحکم کر کے افغانستان کو روس اور برصغیر کے درمیان ایک قابل اعتماد بفر سٹیٹ بنایا جائے۔

1848ء میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری لڑائی شروع ہوئی تو دوست محمد خان کو اس میں پشاور کی وادی پر قبضہ کرنے کے اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دریائے سندھ تک کے علاقے پر قبضہ کرلے گا تو وہ سکھوں اور انگریزوں کے لئے ایسی صورت حال پیدا کر دے گا کہ ان دونوں ہی کو اس قبضے کی حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی۔ وہ اس طرح اپنے سوتیلے بھائی سردار سلطان محمد خان سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا تھا جو قبل ازیں کئی مرتبہ سکھوں کا ساتھ دے چکا تھا۔ دوست محمد خان دسمبر 1848ء میں پشاور پہنچا اور اس نے اس شہر پر قبضہ کرنے کے بعد دریائے لنڈائی (زیریں دریائے کابل) کے جنوبی علاقے پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ پھر اس نے اپنے ایک پوتے کو پشاور کا گورنر مقرر کیا جبکہ سکھوں کا گورنر سردار سلطان محمد خان اور اس کے

دوسرے سوتیلے بھائی فرار ہو کر کوہاٹ چلے گئے تھے۔ اس کاروائی کے بعد دوست محمد خان نے جنوب کی طرف پیش قدمی کر کے خیر آباد پر قبضہ کر لیا اور پھر سکھوں کے ایک باغی جرنیل چھتر سنگھ سے یہ وعدہ کیا کہ اگر اس کی انگریزوں کے ساتھ لڑائی ہوئی تو وہ اس کی امداد کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے انگریزوں کے ایک ایلچی کو اس مضمون کی چٹھی لکھی کہ میں پشاور، ڈیرہ جات اور ہزارہ پر قبضہ کرنے کے لئے آیا ہوں۔ جب میں اپنی یہ کاروائی مکمل کرلوں گا تو پھر میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان بخوشی مصالحتی کردار ادا کروں گا لیکن بعد میں اس نے موعودہ مصالحتی کردار تو ادا نہ کیا البتہ اس نے گجرات میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان آخری لڑائی میں سکھوں کی امداد کے لئے اپنی گھوڑ سوار فوج کا ایک بہت بڑا دستہ بھیجا۔ اس لڑائی میں سکھوں کو قطعی طور پر شکست ہوئی تو اس کے حلیف دوست محمد خان نے بھی راہ فرار اختیار کر لی۔ انگریزوں کی فوج نے سالٹ رینج اور مرگلہ کی پہاڑیوں اور دریائے سندھ کو عبور کر کے درہ خیبر تک افغان فوج کا تعاقب کیا۔ اس تاریخی پسپائی کے بعد 1947ء تک انگریزوں کے عہد اقتدار میں کابل کے حکمرانوں نے کبھی پشاور کی طرف رخ نہ کیا۔ اولف کیرو لکھتا ہے کہ اگرچہ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان 1845-46ء کی پہلی جنگ کے پس پردہ انگریزوں کی روس کے خلاف گرینڈ سٹریٹجی کارفرما تھی لیکن اس کی مقامی وجہ یہ تھی کہ سکھوں کو پشاور کی وادی کے بارے میں انگریزوں کی نیت پر شبہ تھا۔ سکھوں کا خیال تھا کہ انگریز، پشاور کا صوبہ سر ولیم میکناٹن کی 1840ء کی تجویز کے مطابق یا تو اپنے پٹھو افغان بادشاہ کے حوالے کر دیں گے یا اسے خود ہتھیا لیں گے۔ انگریزوں اور سکھوں کی 1847-48ء کی دوسری جنگ کے دوران افغانستان کے حکمران دوست محمد خان کی فوجی مداخلت بھی پشاور کی وادی پر قبضہ کے لالچ کے تحت ہی ہوئی تھی لیکن ان ساری کاروائیوں میں اس علاقے کے عوام الناس کے صلاح و مشورہ کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ وہ درانیوں سے بھی اتنی ہی نفرت کرتے تھے جتنی کہ وہ سکھوں سے کرتے تھے۔ درانیوں کے سدوزئی یا بارک زئی حکمرانوں نے ہمیشہ ان کا استحصال کیا تھا اور پشاور کے درانی سرداروں نے تو انہیں ایک سے زیادہ مرتبہ سکھوں کے پاس معمولی عہدے اور مالی منفعت کے عوض بیچ دیا تھا۔

اولف کیرو لکھتا ہے کہ "شاہ شجاع اور دوست محمد خان کے حملوں سے پشاور کی وادی کے عوام الناس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا بلکہ ان حملوں نے انہیں محض جنگ اور بدامنی میں مبتلا کر دیا

تھا۔قبل ازیں سکھ شاہی پشاور، کوہاٹ، بنوں یا ڈیرہ جات کی پہاڑیوں کے دامن تک ہی پہنچی تھی۔ سکھ حکمران یاغستان کے باغیوں سے پٹھان سرداروں کے توسط سے ہی رابطہ قائم کرتے تھے۔ یہ دلال زیادہ تر پشاور کے گردونواح خلیل کے اور مہمند ارباب ہوتے تھے سکھوں نے پہاڑیوں پر قبضہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی انہوں نے یاغستان کے لوگوں سے براہ راست رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ کبھی سوات، بونیر، باجوڑ، وادی قرم یا وزیرستان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ پہاڑی علاقوں کے قبائلیوں سے براہ راست سیاسی تعلقات قائم کرنے اور کابل کے حکمرانوں کے ساتھ سرحد بندی کرنے کا کام برطانوی راج کے دور میں ہی ہوا۔اس کے بعد انگریزوں نے انتظامیہ کی علاقائی حدود مقرر کرنے کے علاوہ جو کچھ بھی کیا اس کی ابتدا دراصل سکھا شاہی کے دور میں ہی ہوئی تھی کابل کی موجودہ حکومت لسانی بنیاد پر جو علاقائی مطالبہ کر رہی ہے اس کا تاریخی پس منظر انیسویں صدی کے پہلے پانچ عشروں کے واقعات میں ہی پنہاں ہے۔ پشاور درانیوں کا سرمائی دارالخلافہ ہوتا تھا۔ پشاور کی وادی اور شمال مغربی سرحدی میدانوں کے بعض دوسرے علاقے درانیوں کے بہترین صوبے ہوتے تھے۔ اس علاقے سے بہت سے قبائلیوں نے قبیلہ سدوزئی کی خاطر لڑائیاں لڑی تھیں۔ سدوزئی یا بارک زئی میں سے کسی نے بھی پشاور کو کبھی لڑائی کے بغیر نہیں چھوڑا۔ سردار سلطان محمد خان کا خاندان مصاحبین سالہا سال سے پشاور میں رہتا تھا اور وہ اس علاقے سے بہت پیار کرتے تھے۔ کابل کے موجودہ حکمران پشاور مصاحبین کے اس خاندان سے تعلقات رکھتے ہیں اس لئے یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ وہ تقریباً ایک سو سال کے بعد بھی بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے اس دلپسند علاقے کو واپس حاصل کرنے کے لئے اس قدر بے تاب ہیں۔ عصر حاضر میں پختونستان کی تحریک کی اصلیت کو سمجھنے کے لئے اس سیاسی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے لیکن جو لوگ اس تحریک کی حمایت کرتے ہیں انہیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اولاً 1846ء سے لے کر 1947ء تک کی ایک صدی نے قبائلیوں کی نظروں میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے اور اب وہ اپنے مستقبل کو کابل کے تخت کے لئے ایک یا دوسرے خاندان کی حمایت سے وابستہ نہیں کرتے اور ثانیاً آج کل درانی جن قبائل کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں اس کے پاس ان کے آباؤ اجداد کا شکر گزار ہونے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اگرچہ یہ صحیح ہے کہ سردار داؤد خان ایک پرانے دعوے کا اعادہ کر رہا ہے لیکن اس کے اس حق کو

وہی لوگ تسلیم نہیں کریں گے جن سے وہ اپیل کر رہا ہے سکھوں کے خلاف جن پٹھانوں نے جدوجہد کی تھی وہ درانی نہیں تھے۔ وہ شاہ شجاع نہیں تھا اور نہ ہی دوست محمد خان تھا اور ان میں سلطان محمد خان تو ہرگز شامل نہیں تھا حالانکہ وہ اتنا عرصہ قبل پشاور اور کوہاٹ میں رہا تھا۔ یہ حریت پسند پٹھان یوسف زئی اور خٹک قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں اپنی جدوجہد آزادی کے درمیان اس کی قیمت کا کبھی خیال نہیں ہوتا تھا اور انہوں نے نوشہرہ کے نزدیک پیر سبک کی لڑائی میں رنجیت سنگھ کی فوج کی ان بٹالینوں کے پاؤں تقریباً اکھاڑ دیئے تھے جنہیں فرانسیسی جرنیلوں نے تربیت دے رکھی تھی۔ ان میں ان قبائلیوں کے لیڈر سید احمد بریلوی اور سید اکبر بھی شامل تھے۔ سید اکبر شاہ کے پسماندگان آج کل بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ سید احمد بریلوی ایک مجدّد کی حیثیت سے سرحد میں آیا۔ ان کے آباؤ اجداد نے اس کے گرد جمع ہو کر اسے اپنی وفاداری کا تحفہ پیش کیا۔ وہ سرحد کے مظلوموں کو سکھ جابروں کے پنجوں سے نجات دلانے کے لئے آیا تھا۔ اس نے خود اس نصب العین کی تکمیل میں اپنی عزیز جان کی عظیم ترین قربانی دی اور ساری دنیا کو معلوم ہے کہ سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد پندرہ سال کے اندر سکھا شاہی بھی نیست و نابود ہو گئی تھی۔[1]

انگریزوں نے 1849ء میں سکھوں کی سلطنت کا خاتمہ کرنے کے بعد پانی پت سے لے کر پشاور تک پنجاب کے صوبے سے جو نظام حکومت رائج کیا اس کا ابتداً سرحد کے عوام الناس نے محض اس لئے خیر مقدم کیا کہ یہ نظام درانی گردی اور سکھا شاہی سے بہتر تھا۔ انگریزوں کا سرمایہ دارانہ نوآبادیاتی نظام درانیوں کے قبائلی نظام اور سکھوں کے جاگیرداری نظام سے بہر صورت نسبتاً زیادہ مہذب اور قابل قبول تھا۔ حالانکہ اس کا مفتوحہ شمال مغربی علاقے کا انتظامی ڈھانچہ جنگی مصلحتوں کی بنا پر برصغیر کے دوسرے علاقوں کے انتظامی ڈھانچے سے مختلف تھا اور فوجی افسروں کو بھی سول بیوروکریسی کے وسیع اختیارات حاصل تھے اور انہیں سول سروسز میں شامل کیا جاتا تھا۔ سکھوں کی طرح انگریزوں نے بھی اپنے ابتدائی دور میں قبائلی علاقے میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سارے علاقے پر نہ تو انگریزوں کا اور نہ ہی دوست محمد خان کی افغان حکومت کا کوئی کنٹرول تھا۔ یہ علاقہ عملاً آزاد تھا اور اسے عام طور پر غیر علاقہ یا یاغستان کہتے تھے۔ افغان حکمرانوں نے بھی اسے یہ نام دے رکھا تھا۔ امیر عبدالرحمان کی سوانح حیات میں اس علاقے کو یاغستان . باغیوں کی سرزمین . ہی لکھا ہے۔ انگریزوں نے چار پانچ سال میں

اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد اس ''غیر علاقے'' کی سرحد بند کر کے قبائلیوں کے آئے دن کے حملوں کا سدباب کرنے کی کوشش کی تو قبائلیوں اور انگریزوں کے درمیان مسلح تصادموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ انگریزوں نے سرکش قبائلیوں کی سرکوبی کے لئے 1857ء سے 1877ء تک کے بیس سال کے عرصے میں گیارہ فوجی کاروائیاں کیں اور پھر 1877ء سے 1881ء تک صرف پانچ سال کی مدت میں 12 فوجی مہمات بھیجیں۔ وار برٹن (Warburton) کا خیال ہے کہ اس قسم کے زیادہ تر فوجی تصادم ارباب کی سازشوں کی وجہ سے ہوتے تھے کیونکہ اس طرح انہیں دلالی کا زیادہ معاوضہ ملتا تھا۔ تاہم انگریزوں نے باغی قبائلیوں کے خلاف تعزیری کاروائی کے علاوہ انہیں بذریعہ رشوت یا مواجبات رام کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی۔ یہ رشوتی یا مواجباتی نظام کچھ اس طرح کا تھا کہ انگریز ڈپٹی کمشنر ہر قبیلے کے سرداروں سے ایک تحریری معاہدہ کرتا تھا جس میں وہ اپنے قبیلے کی امن پسندی اور نیک چلنی کا وعدہ کرتے تھے اور اس وعدے کے بدلے میں انہیں باقاعدگی سے الاؤنس یا مواجب دیا جاتا تھا۔ اس بلیک میلی یا رشوتی نظام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سرکش قبائلی غیر قبائلی علاقے میں لوٹ مار اور اغوا کی وارداتیں نہ کریں اور نہ ہی اپنے علاقوں میں غیر قبائلی علاقوں کے مجرموں کو پناہ دیں۔ اگر کوئی قبائلی سردار اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتا تھا تو اس کے علاقے کی بندش یا ناکہ بندی کر دی جاتی تھی یا اس کی ذات اور جائیداد پر قبضہ کر لیا جاتا تھا تا کہ وہ اس دباؤ کے تحت اپنے کردار کی اصلاح پر مجبور ہو جائے۔ 1872ء میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے نام سے ایک قانون نافذ کر دیا گیا جس میں یہ قرار دیا گیا کہ آئندہ قبائلیوں کے خلاف اغوا، ڈکیتی اور دوسرے اسی قسم کے مقدمات کی سماعت عام عدالتوں کی بجائے سرکردہ قبائلیوں پر مشتمل جرگہ میں ہوگی۔ مجسٹریٹوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ قبائلی اور غیر قبائلی علاقے کے جس مقدمے کو چاہیں جرگہ کے سپرد کر سکتے ہیں۔

جرگہ کسی قانونی شہادت کا پابند نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی وکیل ملزم کی طرف سے پیش ہو سکتا تھا۔ اس قانون کا بظاہر مقصد تو یہ تھا کہ لمبی چوڑی موشگافیوں میں پڑے بغیر سنگین اخلاقی جرائم کے مرتکب افراد کو بلا تاخیر سزا دی جائے لیکن بعد میں اس وحشیانہ قبائلی قانون کا سیاسی قیدیوں کے خلاف بھی استعمال ہوتا رہا اور بعض اعلیٰ حکام اپنے مخالفین یا نکتہ چینوں سے انتقام لینے کے لئے بھی اس قانون کا غلط استعمال کرتے رہے۔ برطانوی سامراج کو صوبہ سرحد کے قبائلی اور غیر قبائلی

عوام کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چاہتا صرف یہ تھا کہ اس قسم کے قوانین کے ذریعے جنگی اہمیت کے اس سرحدی علاقے میں امن وامان قائم رکھا جائے۔

1857ء میں دہلی کی جنگ آزادی یا بغاوت کی اطلاع سرحد میں پہنچی تو مردان اور نوشہرہ کی ہندوستانی رجمنٹوں نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا لیکن ان کی سرکشی کو جلدی ہی بری طرح کچل دیا گیا۔ اس بغاوت میں مقامی پٹھانوں نے کوئی خاص حصہ نہ لیا اور وہ اکثر و بیشتر انگریزوں کے وفادار ہی رہے۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً یہ تھی کہ پٹھان عوام کو تاریخی وجوہ کی بنا پر دہلی کے حکمران طبقے کی انگریزوں کے خلاف بغاوت میں دلچسپی نہیں تھی اور اولف کیرو کے بیان کے مطابق اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ افغانستان کا امیر دوست محمد خان اس موقع پر پشاور کے لالچ کے باوجود انگریزوں کے ساتھ اپنی امن پسندی کے وعدے کی پابندی کر رہا تھا۔ اس کے ایفائے وعدہ کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے حکمران سر جان لارنس (John Lawrence) کا خیال تھا کہ چونکہ برصغیر کی شمال مغربی سرحدیں غیر تسلی بخش تھیں اس لئے انگریز دریائے سندھ تک کے علاقے سے دستبردار ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔[2] اس کا مزید خیال یہ تھا کہ اس طرح برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات مضبوط ہوں گے اور ہندوستان کا دفاع کمزور نہیں ہوگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دریائے سندھ ہماری سلطنت کی قدرتی اور مضبوط ترین سرحد ہے[3] لیکن گورنر جنرل کو ان دونوں سے شدید اختلاف تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ہمیں پشاور پر ہر صورت آخر وقت تک اپنا قبضہ رکھنا چاہیے۔ تاہم غالباً اس زیر غور تجویز کی بنا پر دوست محمد خان کو امید لگی ہوئی تھی کہ شاید اسے غدر کے دوران انگریزوں سے وفاداری کے انعام کے طور پر دریائے سندھ تک کا علاقہ مل جائے گا۔ گویا اس وقت تک کابل کے حکمرانوں کی جنگ جوئی یا امن پسندی کا واحد مقصد یہی تھا ہوتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو پشاور کی وادی انہیں مل جائے۔

لیکن امیر دوست محمد خان اور پشاور کے سدوزئی سرداروں کی انگریز نوازی کے باوجود سوات اور بونیر کے پہاڑی علاقوں میں سید احمد بریلوی کے مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف زبردست بغاوت کر دی۔ وہ انگریزوں کو بھی سکھوں کی طرح کافر سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کے خلاف جہاد کرنا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے۔ ان حریت پسندوں کی قیادت سید احمد شہید کے ایک وفادار ساتھی سید اکبر شاہ کے بھائی سید عمر، بیٹے سید مبارک اور بھتیجے سید محمد کے ہاتھوں میں تھی

اوران سب کا یوسف زئی کے علاقے میں بہت اثر تھا۔ انگریزوں نے مجاہدین کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کے لئے ان کے علاقوں پر پے در پے کئی حملے کئے۔ 1858ء میں جب انگریزوں نے ستیانا میں سید اکبر شاہ مرحوم کے قلعے پر حملہ کیا تو اس معرکے میں سید عمر شاہ شہید ہو گیا اور سید مبارک زخمی ہوا۔ اس کے بعد سید مبارک شاہ اپنے ہندوستانی مجاہدین کے ہمراہ چندویلی کے نسبتاً زیادہ دشوار گزار علاقے میں منتقل ہو گیا۔ 1863ء میں انگریزوں نے امبیلہ میں مجاہدین کے مضبوط مرکز کو تباہ کرنے کے لئے بھرپور حملہ کیا تو تقریباً چھ ہفتے تک گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں فریقین کے ہزاروں سپاہی مارے گئے۔ بالآخر انگریزوں کو خٹکوں، آفریدیوں اور یوسف زئی کی امداد سے فتح نصیب ہوئی اور ایک بونیر سردار زید اللہ کی وساطت سے مقامی قبائلیوں اور انگریزوں میں مفاہمت ہو گئی لیکن انگریزوں کو اس کے بعد بھی تقریباً 20 سال تک سوات اور بونیر کے علاقوں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

1863ء میں امبیلہ میں انگریروں اور سید احمد بریلوی کے مجاہدین کے درمیان معرکہ آرائی ہو رہی تھی تو کابل میں امیر دوست محمد خان کا انتقال ہو گیا اور حسب معمول حکمران درانی خاندان کے ارکان میں اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ دوست محمد خان کی وصیت یہ تھی کہ اس کے بیٹے شیر علی کو تخت نشین کیا جائے کیونکہ وہ درانی بیوی سے پیدا ہوا تھا لیکن شیر علی کے بڑے بھائیوں افضل اور اعظم نے جو غیر درانی بیوی کے اولاد تھے، اس وصیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے کچھ عرصے کے لئے اقتدار پر قبضہ کر لیا لیکن بالآخر فیصلہ شیر علی کے ہی حق میں ہوا اور اس نے 1869ء میں مسند اقتدار پر مضبوطی سے قبضہ کر لیا۔ 1874ء میں برطانیہ میں ڈیزرائیلی (Disraeli) کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے 1857ء کی جنگ آزادی کے پس منظر اور وسطی ایشیا میں روسی سامراج کی سلطنت کی توسیع کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ برصغیر کی شمال مغربی سرحدوں پر دفاعی لائن کو مضبوط کرنا چاہیے اس کے خیال میں سرجان لارنس کا متذکرہ خیال قابل عمل نہیں تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے پہلے تو افغانستان کی مغربی اور شمالی سرحدوں کے تعین کے لئے ایران اور روس سے بات چیت کی گئی اور پھر برطانیہ نے سیستان کے علاقے میں افغانستان اور ایران کے درمیان سرحد بندی کے لئے ایک ثالثی فیصلہ صادر کیا۔ شیر علی نے اس ایوارڈ کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس بنا پر افغانستان اور برطانیہ کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔

1876ء میں جب روسی سامراج نے وسطی ایشیا کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا اور برطانوی سامراج کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ یہ ریچھ عنقریب کابل اور قندھار کو بھی نگل لے گا تو انہوں نے افغانستان کی ایک ذیلی ریاست قلات کے حکمران سے بات چیت کر کے اس سے درہ بولان اور کوئٹہ کا علاقہ پٹہ پر حاصل کرلیا۔ مقصد یہ تھا کہ روس کے خلاف فارورڈ پالیسی یا گرینڈ سٹریٹجی کے تحت کوئٹہ کے نزدیک ایک چھاؤنی قائم کر کے اس کی اس علاقے میں پیش قدمی کا سد باب کیا جائے۔ شیر علی نے جو سیستان کے سرحد بندی کے بارے میں انگریزوں کے ایوارڈ سے پہلے ہی بہت خفا تھا، قلات اور برطانیہ کے درمیان اس معاہدے کو بہت ناپسند کیا۔ اسے جائز طور پر یہ خدشہ تھا کہ برطانوی سامراج کی پیش قدمی اپنی گرینڈ سٹریٹجی یا فارورڈ پالیسی کے تحت کوئٹہ تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر افغانستان کے علاقے پر بھی قبضہ کرلے گا۔ حکومت ہندوستان کے سیکرٹری خارجہ سر الفرڈ لائل (Alfred Lyall) کے بقول ان دنوں بے چارے افغان حکمران کی حالت بہت پتلی تھی۔ وہ ایک طرف روسی سامراج اور دوسری طرف برطانوی سامراج کے عزائم کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ اسے اپنے لئے کوئی راہ نجات نظر نہیں آتی تھی۔ لائل نے امیر شیر علی کی اس کیفیت کا اپنی ایک نظم میں بہت خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ اس نظم کا ایک بند یہ ہے۔

کیا میں اپنا دایاں ہاتھ دریائے سندھ کی طرف پھیلاؤں
جسے ممکن ہے کہ انگلستان سونے سے بھر دے
یا میں اپنا بایاں ہاتھ دریائے اوکسس کی طرف بڑھاؤں
جہاں روسی کبھی دھمکیاں دیتے ہیں اور کبھی صلح کی باتیں کرتے ہیں
افغان ان دونوں کی چکی میں اناج کی حیثیت رکھتا ہے
اور پانی اس چکی کو تیزی سے چلا رہا ہے
چکی کا پتھر اوپر کا ہو یا نیچے کا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
اناج بالآخر ان دونوں کے درمیان پس کر رہے گا[4]

برطانوی سامراج نے افغان حکمران کی اس بیچارگی اور زبوں حالی کے پیش نظر خود پہل کر کے عالمی سامراج کی چکی کا اوپر کا پتھر بننے کا فیصلہ کیا۔ اس نے 1878ء میں افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ بہانہ یہ تھا کہ امیر شیر علی نے روسی مشن کا تو کابل میں خیر مقدم کیا ہے

لیکن برطانوی مشن کو افغانستان کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

جبکہ افغانستان کے عوام الناس اس وقت تک قرون وسطی کے قبائلی دور میں ہی زندگی بسر کررہے تھے اس لئے امیر شیر علی انیسویں صدی کے صنعتی دور کے برطانوی سامراج کے دوطرفہ حملے کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا اور نہ کرسکا۔ جدید ہتھیاروں سے مسلح برطانوی فوجوں نے غیر تربیت یافتہ و غیر منظم قبائلی افغان لشکروں کو بآسانی شکست دے کر کابل پر قبضہ کرلیا۔ برطانوی سامراج کا بالائی پتھر بہت بھاری تھا۔ انگریزوں نے کابل میں پہلا کام یہ کیا کہ شیر علی کو معزول کر کے اس کی جگہ اس کے بیٹے یعقوب خان کو تخت نشین کردیا اور پھر اس سے مئی 1879ء میں معاہدہ گنڈامک (Gandammak) پر دستخط کرائے جس کے تحت افغان حکمران نہ صرف خیبر اور قرم کے علاقے سے دستبردار ہوگیا بلکہ اس نے پشین، سبی اور لورالائی کے پٹھان علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔ اس معاہدے کی ایک اور اہم شق یہ تھی کہ افغان امیر برطانیہ کے سوا کسی اور غیر ملک سے تعلقات قائم نہیں کرے گا اور کابل میں ایک مستقل برطانوی ریذیڈنٹ کا تقرر کیا جائے گا جس کی حفاظت کے لئے ایک چھوٹی سی فوج بھی متعین ہوگی۔ جواباً برطانیہ نے اس امر کی ضمانت دی کہ اگر افغانستان پر کسی بیرونی ملک کی طرف سے حملہ ہوا تو برطانیہ اس کا دفاع کرے گا۔ بالفاظ دیگر اس معاہدے کے مطابق افغانستان کی آزاد و خود مختار حیثیت ختم ہوگئی اور اس کے دفاع اور امور خارجہ پر برطانیہ کے کنٹرول کو تسلیم کرلیا تھا لیکن اس معاہدے کے چند ماہ بعد یعنی ستمبر 1879ء میں ایک افغان لشکر نے برطانیہ کے سفارت خانے پر حملہ کر کے اس کے نئے ریذیڈنٹ اور دوسرے سفارت کاروں کو قتل کردیا۔ اس پر برطانیہ کی فوج نے جنرل رابرٹس (Roberts) کی زیر کمان پھر افغانستان پر حملہ کر کے کابل پر قبضہ کرلیا۔ امیر یعقوب خان کو معزول کر کے ہندوستان میں نظر بند کردیا گیا اور اس کی جگہ امیر دوست محمد کے پوتے امیر عبدالرحمان کو تخت اقتدار پر بٹھادیا گیا۔ امیر عبدالرحمان، دوست محمد خان کے بڑے بیٹے امیر افضل خان جو غیر درانی بیوی کی اولاد تھا اور 1865ء سے 1867ء تک صرف دوسال برسر اقتدار رہا تھا، کا بیٹا تھا۔ جب دوست محمد کی وصیت کے مطابق اس کی درانی بیوی کے بیٹے شیر علی نے 1869ء میں شاہی تخت سنبھالا تھا تو امیر عبدالرحمان اپنے چچا کے انتقام کے خوف سے بھاگ کر روسی ترکستان چلا گیا تھا اور وہ گیارہ سال سے انتظار کررہا تھا کہ کبھی اس کے نصیب بھی جاگیں گے۔ چنانچہ 1879ء میں

برطانوی سامراج کی نظرعنایت سے اس کی امید برآئی اور بالآخر وہ افغانستان کا حکمران بن گیا اگرچہ اس کی یہ حکمرانی برائے نام تھی کیونکہ اصل حکم برطانوی ریذیڈنٹ کا ہی چلتا تھا۔ امیر عبدالرحمان کی حیثیت ہندوستان کے دوسرے ریاستی حکمرانوں سے زیادہ نہیں تھی۔

ایس۔ ایم۔ برک کہتا ہے کہ یہ محض تاریخ کا اتفاق تھا کہ انگریزوں نے افغانستان کو اپنی ہندوستانی سلطنت میں مدغم نہیں کیا تھا۔ اگر اس وقت یہ فیصلہ کرلیا جاتا تو جغرافیائی لحاظ سے برصغیر کی سلطنت کی قدرتی سرحد ڈیورنڈ لائن کی بجائے ہندوکش کی پہاڑیوں میں ہوتی لیکن سرپرسی سائیکس (Percy Sykes) اس بات کو محض تاریخ کے اتفاق سے تعبیر نہیں کرتا۔ وہ لکھتا ہے کہ برطانوی پالیسی کا مفاد یہ تھا کہ برطانیہ اور اس کی سلطنتوں کے درمیان ایک افغان علاقہ موجود ہوتا کہ اگر کبھی سرحدی جھڑپیں ہوں تو وہ براہ راست برطانیہ اور روس کی فوجوں کے درمیان نہ ہوں۔[5] گنارمرڈل (Gunnar Myrdal) کا بیان ہے کہ ''افغانستان پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہونے کے بعد روسیوں نے اس تجویز سے اتفاق کرلیا تھا کہ افغانستان ان کے دائرہ اثر سے باہر رہے گا اور برطانیہ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب تک افغانستان برطانیہ کے سیاسی کنٹرول کو تسلیم کرتا رہے گا اس وقت تک نہ تو اسے برصغیر کی سلطنت میں مدغم کیا جائے گا اور نہ ہی اس پر قبضہ کیا جائے گا۔''[6] تاریخ کے بعض طالب علم اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ افغان حکمرانوں نے روس اور برطانیہ کے درمیان غیر جانبدارانہ پوزیشن اختیار کر کے اپنی آزادی وخودمختاری کو برقرار رکھنے کا جو ''کارنامہ'' سرانجام دیا ہے وہ ان کی سیاسی بصیرت اور سفارتی تدبر کا ثبوت ہے۔ اس قسم کی سطحی رائے صرف وہی لوگ قائم کرتے ہیں جنہیں ایشیا کے اس علاقے میں روس، برطانیہ اور امریکی سامراج کی پالیسی اور افغانستان کی تاریخ کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم تک افغانستان کی ''بفرسٹیٹ'' کی نام نہاد آزادی وخودمختاری وہاں کے رجعت پسند حکمرانوں کی سیاسی بصیرت یا سفارتی تدبر کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ روس اور برطانیہ کی مفاہمت کی پیداوار تھی۔ برصغیر کے مشرق میں سیام (جسے آج کل تھائی لینڈ کہتے ہیں) کی بفر سٹیٹ کی ''آزادی وخودمختاری'' بھی اسی قسم کی وجہ سے قائم رہی تھی۔ اس ملک کے بارے میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان ایسی ہی مفاہمت ہوئی تھی جیسی کہ روس اور برطانیہ کے درمیان افغانستان کے بارے میں ہوچکی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اس علاقہ میں برطانوی

سامراج کی بجائے امریکی سامراج کا بول بالا ہونے لگا تو امریکی سامراج نے افغانستان کے بارے میں برطانیہ کی پرانی پالیسی پر ہی عمل جاری رکھا۔

امیر عبدالرحمان نے برطانیہ کی دعوت پر عنان اقتدار سنبھالنے سے پہلے یہ استفسار کیا تھا کہ اس کی سلطنت کی سرحدیں کہاں ہوں گی اور برطانوی حکومت کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس پر برطانوی ریذیڈنٹ کا جواب یہ تھا کہ ”سارا صوبہ قندھار ایک دوسرے حکمران کو دے دیا گیا ہے البتہ پشین اور سبی پر برطانیہ کا قبضہ قائم رکھا گیا ہے۔ لہٰذا حکومت اس سلسلے میں تم سے کوئی گفت وشنید نہیں کرے گی اور نہ ہی شمال مغربی سرحد کے بارے میں کوئی بات چیت ہوگی کیونکہ یہ معاملہ بھی سابق امیر محمد یعقوب خان سے طے ہو چکا ہے۔ البتہ افغانستان کے دوسرے علاقوں پر تمہیں وہ سارے اختیارات حاصل ہوں گے جو تمہارے خاندان کے سابق امیروں کو حاصل تھے۔ تم جس طرح چاہو ہرات پر قبضہ کرلو۔ برطانیہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا جہاں تک تمہاری حکومت کے برطانیہ کے ساتھ روابط کی نوعیت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کابل کا حکمران برطانیہ کے سوا کسی دوسری غیر ملکی طاقت سے سیاسی تعلقات قائم نہیں کر سکتا۔“ برطانوی ریذیڈنٹ نے یقین دلایا کہ کابل میں کسی برطانوی باشندے کو ریذیڈنٹ مقرر نہیں کیا جائے گا البتہ حکومت برطانیہ باہمی سمجھوتے کے تحت کسی ہندوستانی مسلمان کو اس عہدہ پر فائز کرے گی۔ امیر عبدالرحمان نے اپنی سلطنت سے قندھار کی علیحدگی کو تو منظور نہ کیا البتہ اس نے باقی ساری شرائط تسلیم کرلیں۔ چنانچہ برطانوی ریذیڈنٹ نے 22 رجولائی 1880ء کو اعلان کر دیا کہ آئندہ عبدالرحمان افغانستان کا امیر ہوگا۔[7] اس طرح عبدالرحمان افغانستان کا حکمران تو بن گیا لیکن جن شرائط کے تحت اس نے یہ مقام حاصل کیا تھا ان سے تین چار باتیں بالکل واضح تھیں۔ پہلی یہ کہ اس کی تخت نشینی برطانوی سامراج کی مرہون منت تھی اور وہ شاہ شجاع کی طرح برطانیہ کا ایک پٹھو امیر تھا۔ دوسری یہ کہ برطانیہ نے اسے امیر محض اس لئے بنایا تھا کہ وہ روس سے مفاہمت کی وجہ سے افغانستان کو دوسری ہندوستانی ریاستوں کی طرح برصغیر کی سلطنت میں مدغم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ برطانیہ نے نیپال، تبت اور سیام کے بارے میں بھی یہی پالیسی اختیار کی تھی۔ تیسری یہ کہ عبدالرحمان کی خارجہ پالیسی برطانیہ کے کنٹرول میں تھی اور وہ اس معاملے میں آزاد و خود مختار نہیں تھا۔ چوتھی یہ کہ وہ برصغیر کے شمال مغربی سرحد کے بارے میں

سابق امیر محمد یعقوب خان کے معاہدہ گنڈامک کا پابند تھا۔ وہ اس سلسلے میں از سر نو گفت وشنید نہیں کر سکتا تھا اور پانچویں یہ کہ اسے افغانستان کے غریب و پسماندہ عوام الناس پر ظلم وستم کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ برطانیہ اس سلسلے میں افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر برطانوی سامراج کو افغان عوام کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی فلاح وترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ افغانستان کو عملی طور پر اپنی برصغیر کی سلطنت اور روس کے درمیان ایک غیر آباد علاقہ تصور کرتا تھا اور روسی سامراج نے بھی افغانستان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔

خود امیر عبدالرحمان نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ان تلخ حقائق کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''جب میں تخت نشین ہوا تو مجھے چاروں طرف سے بے شمار مشکلات نے گھیر لیا۔ مجھے اپنے رشتہ داروں اور اپنی رعایا اور اپنے عوام سے سخت لڑائی لڑنا پڑی۔ تخت کے دعویداروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کے ناموں کی فہرست بنانا ممکن نہیں ہر روز ملک کے طول وعرض سے بغاوتیں اور بدامنی کی خبریں آتی تھیں۔ مجھے چار مرتبہ خانہ جنگی میں الجھنا پڑا اور چھوٹے فسادات کو کچلنے کے لئے تو کئی مرتبہ کاروائی کرنا پڑی میری خواہش تھی کہ معاشرہ میں کچھ اصلاحات ہوں تا کہ افغانستان ایک قوم بن سکے لیکن ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک یہ پتا نہ چلتا کہ ملک کی سرحدیں کہاں ہیں اور دراصل کون سے صوبے افغانستان میں شامل ہیں۔'' امیر عبدالرحمان مزید لکھتا ہے کہ ''ان دنوں افغانستان کی حیثیت ایک بے یار و مددگار بکری کی سی تھی جس پر شیر (برطانیہ) اور ریچھ (روس) نے نظریں جمائی ہوئی تھیں میں نے برطانیہ کی مدد سے پہلے روس کے ساتھ اپنی سرحدوں کا تعین کیا اور پھر میں نے سوچا کہ میرے ملک اور ہندوستان کے درمیان بھی سرحد بندی ہونی چاہیے تا کہ میرے ملک کے چاروں طرف ایک ایسی سرحدی لائن کھینچی جائے جو اس کے تحفظ کے لئے ایک مضبوط دیوار ثابت ہو چنانچہ میں نے ہندوستان کے وائسرائے سے درخواست کی کہ حکومت ہندوستان کے سیکرٹری خارجہ سر مورٹیمر ڈیورنڈ (Mortimer Durand) کو کابل بھیجا جائے لیکن وائسرائے نے اس مقصد کے لئے لارڈ رابرٹس (Roberts) کا تقرر کر دیا میرے خیال میں اس کام کے لئے رابرٹس کا انتخاب غیر دانشمندانہ تھا کیونکہ اس نے دوسری افغان جنگ میں حصہ لیا تھا اور یہ برطانیہ کی فارورڈ پالیسی کا

زبردست حامی تھا وائسرائے کو اپنے نمائندے کے اس انتخاب پر اصرار تھا لیکن میں اس معاملے کو ٹالتا رہا تا آنکہ رابرٹس ریٹائر ہو گیا اس کے فوراً بعد میں نے وائسرائے کو خط لکھا جس میں برطانوی مشن کو کابل آنے کی دعوت دی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ سرحدی قبائل کو میری ڈومینین میں شامل کیا جائے کیونکہ میں بطور مسلمان انہیں رفتہ رفتہ برطانیہ عظمیٰ کی امن پسند رعایا اور اچھے دوست بنا سکوں گا لیکن میرے اس مشورے کو پسند نہ کیا گیا۔ البتہ میری خواہش کے مطابق ڈیورنڈ کی زیر قیادت ایک برطانوی سرحدی مشن کا تقرر کیا گیا جو ستمبر 1893ء میں کابل پہنچا اور پھر خوشگوار ماحول میں 12 نومبر کو سرحدی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اگلے دن دربار عام میں، میں نے ڈیورنڈ مشن کا شکریہ ادا کیا کیونکہ اس نے بڑی دانشمندی سے سرحدی تنازعات کا تصفیہ کیا تھا میری سلطنت کے سارے نمائندے اور حکام اس موقع پر موجود تھے اور انہوں نے بھی معاہدات اور سمجھوتوں پر اپنی مہریں ثبت کر کے نہ صرف ان پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا بلکہ اس کی رسمی طور پر منظوری دی اگرچہ اس معاہدے میں مجھے وہ سب کچھ نہیں ملا جو میں چاہتا تھا تاہم موجودہ حالات میں، میں بہت مطمئن ہوں کہ میں نے برطانیہ سے دوستی کی وجہ سے جو کچھ کھویا ہے اس سے زیادہ پایا ہے۔"[8] اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ حکومت ہندوستان میں اس سرحدی لائن سے افغانستان کی جانب کے علاقے میں کسی حالت میں بھی مداخلت نہیں کرے گی اور ہز ہائینس امیر بھی اس لائن سے ہندوستان کی جانب کے علاقے میں کسی صورت میں بھی مداخلت نہیں کرے گا۔ ایک اور شق میں طفیلی افغان امیر کی امدادی رقم یا وظیفہ میں اضافہ کیا گیا تھا۔

اولف کیرو نے اس سرحدی معاہدے کے بارے میں امیر عبدالرحمان کی سوانح حیات سے ایک طویل پیراگراف نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امیر نے اس معاہدے پر کسی مجبوری کے تحت دستخط نہیں کئے تھے وہ اس سرحدی تصفیہ سے بالکل مطمئن اور خوش تھا۔ اولف کیرو کے بیان کے مطابق امیر عبدالرحمان نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ "سر مورٹیمر ڈیورنڈ 19 ستمبر 1893ء کو پشاور سے کابل کے لئے روانہ ہوا۔ جب یہ مشن کابل پہنچا تو میرے جنرل غلام حیدر خان نے اس کا خیر مقدم کیا اور میں نے اپنے بیٹے حبیب اللہ خان کے مکان میں اس کی رہائش کا بندوبست کیا۔ ابتدائی درباری رسومات کے بعد فوراً ہی بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈیورنڈ، بہت ہوشیار، مدبر تھا اور اسے فارسی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔

ساری بات چیت بہت صحیح خطوط پر شروع ہوگئی لیکن میں نے اس بات چیت میں سر مور ٹیمر ڈیورنڈ، اپنے اور مشن کے دوسرے شرکا کے ہر لفظ کا ریکارڈ رکھنے کے لئے انتظام کر رکھا تھا کہ میرا میر منشی سلطان محمد خان ایک پردے کے پیچھے بیٹھ کر انگریزی یا فارسی زبان میں جو کچھ فریقین کی طرف سے کہا جائے اسے لفظاً لفظاً قلم بند کر لے۔ وہ پردے کے پیچھے اس طرح بیٹھا تھا کہ کسی کو اس کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ میری اور ڈیورنڈ کی بات چیت کے ہر لفظ کو شارٹ ہینڈ میں قلم بند کر لیا گیا اور یہ ساری بات چیت ابھی تک ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس بات چیت کا خلاصہ یہ تھا کہ چترال اور درہ بارو غل سے پشاور تک اور پھر وہاں سے کوہ ملک سیاہ تک حد بندی پر اس طرح اتفاق ہو گیا کہ وخن، کافرستان، اسمار مہمند آف لال پور، وزیرستان (برمل) کا ایک حصہ میرے زیر اقتدار آ گیا اور میں نئے چمن کے ریلوے سٹیشن، چاغی، وزیری کے بقیہ علاقے بلند خیل، قرم، آفریدی، باجوڑ، سوات، بونیر، دیر، چلاس اور چترال سے دستبردار ہو گیا۔ برطانوی مشن 14 نومبر کو واپس پشاور چلا گیا۔ ان سرحدی معاملات کے بارے میں جو غلط فہمیاں رونما ہو رہی تھیں اور جو تنازعات پیدا ہو رہے تھے وہ بالکل ختم ہو گئے اور جب دونوں حکومتوں کے کمشنروں نے متذکرہ معاہدے کے مطابق سرحدی لائن کی نشاندہی کر دی تو امن وامان قائم ہو گیا۔ میری دعا ہے کہ یہ فضا ہمیشہ کے لئے جاری وساری رہے۔"[9]

سرحد بندی کے دوران صرف دو علاقوں میں مشکلات پیش آئی تھیں۔ ایک علاقہ چترال کی سرحد کا تھا جہاں کی پہاڑیاں نہایت دشوار گزار تھیں۔ تاہم دوسری جنگ عظیم کے دوران اس علاقہ میں سرحدی ستون نصب کر دیئے گئے تھے۔ دوسرا علاقہ کنڑ اور باجوڑ کے درمیان نواں سر اور سفید کوہ کے مغربی پر سکارم چوٹی کا تھا۔ یہ سیکٹر مہمند علاقے سے گزرتا ہے اور اس میں افغانستان کی جانب خیبر اور آفریدی سرحدی علاقے شامل ہیں۔ تیسری افغان جنگ کے بعد 1919ء میں درہ خیبر کے مغربی حصے کے ایک چھوٹے سے علاقے میں موقع پر سرحد بندی کی گئی تھی لیکن اس سیکٹر کے بقیہ علاقے کی باقاعدہ سرحد بندی کبھی بھی نہیں ہوئی۔ تاہم یہ بات دس ہزار فٹ سے لے کر سولہ ہزار فٹ تک کی بلندی کے سفید کوہ کے اس علاقے میں کوئی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے بالخصوص ایسی حالت میں کہ آفریدیوں اور افغانستان کے درمیان سرحد بالکل واضح اور تسلیم شدہ ہے لیکن اس بنا پر دریائے کابل کے شمال میں مہمند کے علاقے میں کچھ مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔

حکومت ہندوستان نے نومبر 1893ء کے معاہدے کے چند سال بعد ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے افغان امیر کو مشرق کی جانب مہمند کے علاقے میں ایک متبادل سرحد بندی کی تجویز پیش کی تھی مگر کابل کے حکمران نے اسے قابل اعتنا نہ سمجھا۔[10]

امیر عبدالرحمان کا یہ بیان صحیح نہیں کہ اس معاہدے کے مطابق سرحدی لائن کی موقع پر نشاندہی کے بعد علاقے میں امن دامان قائم ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انگریزوں نے وزیرستان، دیر، سوات اور چترال میں سرحدی لائن کی نشاندہی کرنے کی کاروائی کی تھی تو اس کے دوران اور اس کے بعد دو ایک سال تک ان کی مسلح مزاحمتیں ہوئی تھیں۔ 1895ء میں انگریزوں نے دیر، سوات اور چترال کے علاقوں میں اپنا کنٹرول قائم کرنے کے لئے ایک پولیٹکل ایجنسی کی تشکیل کی تھی تو اس وقت اور اس کے بعد 98-1897ء میں بھی مسلح تصادم ہوئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مغل شہنشاہ اکبر کے بعد کسی بیرونی طاقت نے کبھی اس علاقے میں مداخلت کی جرأت نہیں کی تھی۔ انگریزوں نے ایسی کاروائی اپنی فارورڈ پالیسی کے تحت بہ امر مجبوری کی تھی کیونکہ روس نے پامیر میں پیش قدمی کی تھی اور چترال اس علاقے سے صرف چند میل کے فاصلے پر تھا۔[11] ان دنوں برطانیہ کے اخبارات اور حکومتوں کو برصغیر کی شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقوں کی ہر بدامنی میں روس کی سازش کی بو آتی تھی۔ برطانوی فوجی افسروں کی رائے یہ تھی کہ روسی قازق ان کے مسلمہ دشمن ہیں۔ برطانیہ کے درمیانہ طبقہ کے جن لوگوں نے ہندوستان میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی وہ اپنے ہم وطنوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ برصغیر کی شمال مغربی سرحد کا دفاع دراصل خود برطانیہ کا دفاع ہے اور برطانوی حکمرانوں کے ذہن میں روس کے اثر و رسوخ کے خوف کی بنا پر ہندوستان کے ہمسایہ ممالک کی اہمیت کے بارے میں بالکل نیا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ لارڈ کرزن (Curzon) نے 1899ء میں ہندوستان کے وائسرائے کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اسی احساس کے تحت لکھا تھا کہ "ہندوستان کی حیثیت ایک قلعے کی سی ہے۔ جس کے دو طرف سمندر کی وسیع و عریض خندق ہے اور اس کی دوسری دونوں طرف پہاڑوں کی دیواریں کھڑی ہیں۔ یہ دیواریں کئی جگہ پر زیادہ بلند نہیں ہیں۔ ان میں بآسانی مداخلت کی جاسکتی ہے اور ان کی دوسری جانب اونچی نیچی ڈھلوان ہے۔ ہم اس پر قبضہ نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اس پر ہمارا دشمن قبضہ کر لے۔ یہ ڈھلوان ہمارے اتحادیوں اور دوستوں کے پاس رہے تو ہم بالکل مطمئن

رہیں گے لیکن اگر یہاں رقیبانہ اور غیر دوستانہ اثرات پھیلنے لگیں اور وہ ہماری دیواروں کے قریب آ جائیں تو ہم مداخلت کرنے پر مجبور ہوں گے کیونکہ ایسا نہ کیا جائے تو خطرہ بڑھ جائے گا اور اس سے کسی نہ کسی دن ہماری اپنی سلامتی مخدوش ہو جائے گی۔ عرب، پرشیا، افغانستان، تبت اور سیام میں اپنی ساری پوزیشن کے پس پردہ یہی راز پنہاں ہے۔ جو کمانڈر صرف ہندوستان کی برجی پر پہرہ لگائے گا اور اس سے آگے نظر نہیں ڈالے گا وہ کوتاہ اندیش ہو گا۔ [12] برطانوی سامراج نے لارڈ کرزن کی اس گرینڈ سٹریٹجی (Grand Strategy) کے تحت شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقوں میں دوراندیشی کا مظاہرہ کیا۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے خود ان وسیع و عریض علاقوں پر براہ راست کنٹرول قائم نہ کیا تو روس ان کے لئے مشکلات پیدا کرتا رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے 1895ء میں مالاکنڈ ایجنسی کی تشکیل کے بعد مزید چار ایجنسیوں یعنی خیبر، قرم، شمالی وزیرستان کی تشکیل کی۔ برطانیہ کی جانب سے یہ کام سرانجام دینے کے دوران اور اس کے بعد بہت خون خرابہ ہوا لیکن بالآخر بندوق کے علاوہ روپے، سڑکوں اور ریلوے کی قوت موثر ثابت ہوئی۔ فلپ وڈرف (Philip Woodruff) کے بقول 1900ء کے بعد انگریزوں کے عہد اقتدار میں شمال مغربی سرحد کے قبائلیوں کی حالت نیشنل پارک کے چیتوں کی سی تھی۔ وہ اپنے پارک کے اندر حسب خواہش ہر ہرن کا شکار کر سکتے تھے لیکن اگر وہ پارک سے باہر آ کر کسی گاؤں کے مویشی پر حملہ کرتے تھے تو انہیں گولی مار دی جاتی تھی۔ 1947ء تک قبائلیوں کی پوزیشن یہی تھی۔" [13]

باب:3

افغان حکمرانوں کے توسیع پسندانہ عزائم

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں روسی ریچھ کی پامیر کے علاقے میں پیش قدمی کے سد باب کے لئے مالاکنڈ اور دوسرے قبائلی علاقوں پر پولیٹکل ایجنٹوں کے ذریعے کنٹرول کرنے کی پالیسی پر عمل درآمد کے دوران دہلی اور لندن کے برطانوی سامراجیوں کو یہ احساس ہوا کہ شمال مغربی سرحدی اضلاع اوران سے متصدقبائلی علاقوں کا انتظام پنجاب کی صوبائی حکومت کی وساطت سے نہیں ہونا چاہیے۔اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان 1893ء کی سرحد بندی کے بعد صوبائی حکام کی چھوٹی موٹی غلطی کی وجہ سے بین الاقوامی کشیدگی پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔دوسری وجہ یہ تھی کہ 77-1876ء میں سنڈیمن سکیم کے تحت بلوچستان کے سرحدی علاقے کے براہ راست مرکزی حکومت کے زیر انتظام آنے کے بعد شمال مغربی سرحدی علاقے میں ویسا ہی نظام رائج کرنا ضروری ہو گیا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ مالاکنڈ کے علاقے میں 98-1897ء کے مسلح تصادموں کے بعد جنگی اہمیت کے سرحدی علاقوں کے نظم ونسق کی ذمہ داری کو صوبائی حکام کے پاس رکھنا مناسب نہیں تھا۔اس علاقے کو پنجاب سے الگ کرنے کی تجویز دراصل قبل ازیں 1877ء میں لارڈلٹن (Lytton) کے عہد اقتدار میں زیرغور آئی تھی لیکن دوسری افغان جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے اس پر عمل نہیں ہوسکا تھا۔ 1899ء میں لارڈ کرزن وائسرائے مقرر ہوا تو اس نے متذکرہ فارورڈ پالیسی یا گرینڈ سٹریٹجی کے تحت جن تجاویز پر سب سے پہلے غور کیا ان میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ شمال مغربی سرحدی اضلاع اوران سے متعلقہ قبائلی علاقے کو پنجاب کے صوبے سے الگ کرکے وہاں براہ راست مرکزی حکومت کا کنٹرول قائم کیا جائے۔صوبہ کے انگریز گورنر اور بعض دوسرے انگریز اعلیٰ حکام نے اس

تجویز کی سخت مخالفت کی اور ابتداً برطانیہ کی حکومت نے بھی کرزن کی تجویز سے اتفاق نہ کیا لیکن بالآخر دو سال بعد لارڈ کرزن کی تجویز کو منظور کر لیا گیا اور ملک معظم کے یوم پیدائش کے موقع پر یعنی 9 نومبر 1901ء کو شمال مغربی سرحدی علاقے کو پنجاب سے الگ کر کے اسے مرکز کے ماتحت اسی طرح صوبہ کا درجہ دے دیا گیا جس طرح کہ قبل ازیں بلوچستان کو دیا جا چکا تھا۔ اس نئے صوبہ میں پشاور، کوہاٹ اور بنوں کے علاوہ ڈیرہ اسماعیل خان اور ہزارہ کے اضلاع بھی شامل کئے گئے۔ آخر الذکر میں پنجابی بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ اس نئے صوبے کا انتظام ایک چیف کمشنر کے سپرد کیا گیا جو مرکزی حکومت کی طرف سے متذکرہ اضلاع کے علاوہ ان سے متصل قبائلی علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ قبائلی علاقوں میں انتظامی ڈھانچہ اس طرح کا تھا کہ بیشتر علاقوں میں پولیٹیکل ایجنٹ بندوق، رشوت اور سیاست کاری کے ذریعے نظم و نسق قائم رکھتے تھے اور دوسرے علاقوں میں یہی کام متصلہ اضلاع کے ڈپٹی کمشنر کرتے تھے۔ ان پولیٹیکل ایجنٹوں اور ڈپٹی کمشنروں کی بھرتی برطانیہ کی سول اور فوجی سروسز کے حکام میں سے کی جاتی تھی اور انہیں اس مقصد کے لئے خاص تربیت دینے کے بعد وسیع اختیارات دیئے جاتے تھے۔ پنجاب کی بیورو کریسی میں اس فیصلہ کا غیر موافق رد عمل نہ ہوا۔ اس کے برعکس چار پانچ سال بعد کرزن نے جب بنگال کو انتظامی مصلحتوں کی بنا پر تقسیم کیا تو وہاں کے ہندوؤں کے سارے بالائی طبقوں میں اس قدر شدید رد عمل ہوا کہ وائسرائے کو یہ فیصلہ 1911ء میں منسوخ کرنا پڑا تھا۔ انتظامی لحاظ سے صوبہ سرحد کی علیحدگی کا فیصلہ مفید ثابت ہوا کیونکہ 1901ء کے بعد وزیرستان اور مالاکنڈ کے قبائلیوں سے مسلح تصادموں کی تعداد میں نمایاں کمی ہو گئی تھی اور فرنٹیئر سروس کے جن سول اور فوجی افسروں کو خصوصی تربیت دی جاتی تھی انہیں عوام اور قبائلیوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات پیدا کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔

جس سال ہندوستان کے شمال مغربی صوبہ سرحد کی الگ انتظامیہ کی تشکیل ہوئی اسی سال کابل میں امیر عبدالرحمان کا انتقال ہو گیا اور اس کے تقریباً چار سال بعد یعنی 1905ء میں امیر عبدالرحمان کے جانشین امیر حبیب اللہ نے حکومت ہندوستان کے ساتھ ایک اور معاہدے پر دستخط کئے جس میں وعدہ کیا گیا کہ وہ اپنے والد محترم کی جانب سے کئے گئے مواعید اور سمجھوتوں کا پابند رہے گا اور کسی بھی صورت میں ان کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ چنانچہ جب 1914ء میں

پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو امیر حبیب اللہ نے برطانوی سامراج کے لئے کوئی مشکل پیدا نہ کی حالانکہ ترکی اور جرمنی کا ایک مشن انگریزوں کے خلاف افغانستان کی امداد حاصل کرنے کے لئے کابل آیا تھا۔ البتہ 1917ء میں روس کے پرولتاری انقلاب نے دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح افغانستان پر بھی بہت اثر ڈالا۔ ملک کا مختصر سا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ برطانوی سامراج سے سخت نفرت کرتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح برطانوی سامراج کے غلبہ سے نجات حاصل کر کے وطن عزیز کو صحیح معنوں میں آزادی وخود مختاری سے ہمکنار کیا جائے مگر امیر حبیب اللہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے اپنے پسماندہ قبائلی عوام، خانہ بدوش چرواہوں اور بے زمین غریب کسانوں کے معاشرتی ومعاشی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ برطانوی سامراج کے زیر سایہ ''عزت کا کلچہ'' کھانے پر مطمئن تھا۔

لیکن جب فروری 1919ء میں حبیب اللہ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا امان اللہ تخت پر بیٹھا تو ملک کی آزادی وترقی کی کوئی امید پیدا ہوئی کیونکہ وہ محب الوطن اور سامراج دشمن عناصر کا نمائندہ تھا۔ اس کے باپ کے قتل کا پس منظر یہ تھا کہ روس کے 1917ء کے طبقاتی انقلاب کے بعد ترکیہ کی طرح افغانستان میں ایک ینگ افغان تحریک شروع ہوگئی تھی۔ یہ تحریک چند روشن خیال زمینداروں اور تعلیم یافتہ سرکاری ملازمین پر مشتمل تھی۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی واضح بورژوا پروگرام نہیں تھا تاہم وہ اپنے وطن عزیز کی سیاسی ومعاشی آزادی کے خواہاں تھے اور اس بنا پر وہ برطانوی سامراج کے خلاف تھے۔ ان کی اس وجہ سے بہت حوصلہ افزائی ہوئی تھی کہ لینن کی انقلابی حکومت نے وسطی ایشیاء میں برطانوی سامراج کی فوجی مداخلت کو ناکام کردیا تھا۔ برطانوی سامراج کو امان اللہ خان کی تخت نشینی پر بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ روسی سامراج کا ریچھ کمیونزم کا سرخ لبادہ پہن کر بہت ہی زیادہ خونخوار ہوگیا ہے۔ لہٰذا وہ آئندہ افغانستان کی ایک طفیلی بفرسٹیٹ کی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ امان اللہ خان سامراج دشمن ینگ افغان تحریک سے ہمدردی رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے تخت پر بیٹھنے کے فوراً ہی بعد ترکیہ کے مصطفیٰ کمال اتاترک کی طرح ایک منشور جاری کیا جس میں افغانستان کے لئے مکمل آزادی حاصل کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس نے اپریل میں اپنے ایک خصوصی ایلچی کے ذریعے لینن کے نام ایک خط بھیجا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یکم مئی 1919ء کو لینن کی حکومت نے سب سے پہلے افغانستان کی

آزادی وخودمختاری کوتسلیم کرلیا اور برطانوی سامراج نے 3رمئی کو افغانستان پر چڑھائی کردی۔

جی۔این۔مولس ورتھ (G.N.Molesworth) کے بیان کے مطابق اس جنگ کی ابتدادراصل امان اللہ نے کی تھی۔اس نے ہندوستان میں عوامی بدامنی سے فائدہ اٹھا کر شمال مغربی سرحدی علاقے پر اس امید میں حملہ کیا تھا کہ اس طرح وہ پشاور اور ڈیرہ جات کے علاقے حاصل کرلے گا۔[1] اس جنگ میں افغان فوجوں کی کئی جگہ پسپائی ہوئی لیکن انگریزوں کو سخت برفباری اور سردی کی وجہ سے افغانستان کے اندرونی علاقوں میں بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن اس کی دوسری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں زبردست بدامنی پیدا ہوگئی تھی۔13راپریل 1919ء کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے بعد اس بدامنی نے ایک عوامی بغاوت کی صورت اختیار کرلی تھی اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ ہندوستانی فوج کے بعض افسر اور جوان افغان فوج سے جاملیں گے۔تیسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے اس حملے کے دوران امیر امان اللہ خان نے اپنے ایک بریگیڈیئر شاہ دولہ کو وزیرستان بھیج کر قبائلیوں کو یہ تاثر دیا تھا کہ برطانوی حکومت دریائے سندھ تک دستبردار ہونے والی ہے اس لئے سارے قبائلیوں کا فرض ہے کہ وہ امیر کے جھنڈے تلے جمع ہوجائیں اور انگریزوں کی فوجی چوکیوں پر قبضہ کرلیں۔ بریگیڈیئر شاہ دولہ کا یہ مشن خاصی حد تک کامیاب ہوا تھا اور انگریزوں کو قبائلیوں کے پے در پے حملوں کے باعث وانا کا علاقہ خالی کرنا پڑا تھا۔قبائلیوں کی اس مسلح جدوجہد آزادی کی شدت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے وانا کے اسلحہ خانہ پر قبضہ کرنے کے بعد تقریباً چھ ماہ کے عرصے میں ایک سو حملے کئے تھے[2] اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ روس میں 14 غیرملکی طاقتوں کی فوجی مداخلت اور داخلی رجعت پسند افواج کے مشترکہ حملوں کے باوجود لینن کی انقلابی فوج فتح یاب ہورہی تھی اور یہ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ دنیا کا پہلا طبقاتی انقلاب کامیاب وکامران ہوگا۔انگریزوں کو خطرہ تھا کہ اگر لینن کی سرخ فوج امان اللہ کی امداد کے لئے افغانستان میں داخل ہوگئی تو اسے برصغیر میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ پورے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف عوامی غم وغصہ کے فلک بوس شعلے بھڑک رہے تھے جبکہ یہاں برطانیہ کے فوجیوں کی تعداد صرف 15 ہزار تھی۔

اس صورت حال کے پیش نظر انگریزوں کو اپنے سامراجی مقصد کی تکمیل کئے بغیر

26رجولائی 1919ء کوامن کانفرنس پر رضامند ہونا پڑا۔ 3راگست کولڑائی بند ہوئی اور 8راگست کو راولپنڈی میں افغانستان اور حکومت ہندوستان کے درمیان عارضی صلح نامے پر دستخط ہوئے جبکہ برصغیر میں گاندھی اور علی برادران کی زیر قیادت عدم تعاون کی پر تشدد تحریک جاری تھی۔ اگر چہ اس عارضی صلح نامے میں اس سرحدی معاہدے کا تو ذکر نہیں تھا جو کہ نومبر 1893ء میں امیر عبدالرحمان اور سر مور ٹیمر ڈیورنڈ کے درمیان طے ہوا تھا لیکن اس میں اپریل 1905ء کے اس معاہدے کے بالواسطہ طور پر توثیق کی گئی جس پر امان اللہ کے والد امیر حبیب اللہ نے دستخط کئے تھے۔ اس سلسلے میں صلح نامے کی پانچویں شق کا مضمون یہ تھا کہ افغان حکومت ہندوستان اور افغانستان کی اس سرحد کو تسلیم کرتی ہے جسے امیر حبیب اللہ نے تسلیم کیا تھا۔ ایک اور شق میں اس امر پر اتفاق کیا گیا تھا کہ خیبر کے چھوٹے سے مغربی علاقے میں موقع پر سرحد بندی کی جائے گی اور کچھ عرصہ بعد اس شق کی باقاعدہ تعمیل کی گئی۔ جواباً انگریزوں نے صلح نامے میں تسلیم کیا کہ آئندہ افغانستان اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں آزاد و خود مختار ہوگا یعنی دوسری افغان جنگ کے بعد 1879ء میں کئے گئے معاہدہ گنڈامک کی اس توہین آمیز شق کو بالواسطہ طور پر منسوخ کر دیا گیا تھا کہ افغانستان برطانیہ کے سوا کسی دوسرے ملک سے سیاسی تعلقات قائم نہیں کرے گا اور اگر افغانستان پر کسی بیرونی طاقت نے حملہ کیا تو برطانیہ اس کا دفاع کرے گا۔ اس صلح نامہ کے چار ماہ بعد یعنی دسمبر 1919ء میں سوویت یونین اور افغانستان کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا اور تقریباً دو سال بعد یعنی نومبر 1921ء میں اس عارضی صلح نامے کو ایک مستقل معاہدے کی صورت دی گئی۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ فریقین ہندوستان اور افغانستان کے درمیان اس سرحد کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ اپنی سرحدوں کے نزدیک رہائش پذیر قبائلیوں کے بارے میں فیاضانہ ارادے رکھتے ہیں اس لئے یہ عہد کرتے ہیں کہ آئندہ اگر کبھی کسی فریق کو اپنے علاقے کے قبائلیوں میں امن وامان قائم کرنے کے لئے کسی بڑی فوجی کاروائی کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ ایسا کرنے سے پہلے دوسرے فریق کو اس کے بارے میں مطلع کرے گا۔ اس معاہدے کے کچھ عرصہ بعد برطانیہ کے نمائندے نے افغانستان کے وزیر خارجہ کے نام ایک خط میں اس شق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ''چونکہ حکومت افغانستان دونوں حکومتوں کے سرحدی قبائل کے حالات کے بارے میں دلچسپی رکھتی ہے لہٰذا میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ حکومت برطانیہ سارے سرحدی قبائل کے

بارے میں خیر سگالی کے جذبات کی حامل ہے اوران سے فراخدلانہ سلوک کرنے کا ارادہ رکھتی ہے بشرطیکہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے خلاف سنگین جرائم کا ارتکاب نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ اس خط سے آپ مطمئن ہو جائیں گے۔"

برطانوی سامراج کی طرف سے اس معاہدے پر دستخط کرنے کا پس منظر یہ تھا کہ اس وقت تک روس میں لینن کے عالمگیر اہمیت کی پرولتاری انقلاب کی فتح ہو چکی تھی امیر امان اللہ خان اسی سال سوویت یونین کے ساتھ دوستی کے معاہدے پر دستخط کر چکا تھا جس کی رو سے سوویت یونین نے افغانستان کو مالی امداد دینی شروع کر دی تھی اسے یہ اجازت بھی دیدی تھی کہ وہ غیر ملکی تجارت کے لئے روس کے ذرائع مواصلات کو استعمال کر سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 1919ء میں گاندھی کی عدم تعاون کی پر تشدد تحریک اور پھر علی برادران کی تحریک خلافت نے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے اقتدار کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ چونکہ تحریک کے دوران لاکھوں ہندوستانی مسلمان براستہ وزیرستان ہجرت کر کے جا رہے تھے اور اس علاقے کے قبائلی عوام ہندوستانی مہاجرین کے سامراج دشمن مذہبی جذبے سے متاثر ہو کر حکومت ہندوستان کی فوجی چوکیوں پر حملے کر رہے تھے اس لئے انگریزوں کی خواہش تھی کہ حکومت افغانستان کے تعاون سے قبائلی علاقے میں امن و امان قائم رکھا جائے۔ قبل ازیں امیر امان اللہ خان کا ایک فوجی افسر اس علاقے میں زبردست گڑبڑ پھیلا چکا تھا اور اس بنا پر انگریزوں کو 1919ء کی جنگ میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج کو پہلی جنگ عظیم کے نقصانات و ہندوستان کی بدامنی پر قابو پانے اور پھر امیر امان اللہ خان کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے کے لئے وقت درکار تھا اس لئے اس نے مصلحتاً اور وقتی طور پر یہ تسلیم کر لیا کہ حکومت افغانستان کو ہندوستان کے علاقے کے قبائلیوں کے حالات کے بارے میں دلچسپی رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس کی جانب سے افغانستان کو دی گئی اس پہلی شق میں اس معاہدے کی تیسری مرتبہ باقاعدہ توثیق کی گئی تھی۔ تاہم 1947ء کے بعد بھی حکومت افغانستان کا موقف یہ رہا کہ اسے اس معاہدے کی رو سے ڈیورنڈ لائن کی دونوں جانب کے قبائلیوں کے حق میں آواز اٹھانے کا حق حاصل ہے۔

اس معاہدے کے بعد امان اللہ خان نے 1926ء میں بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا جس پر حکومت برطانیہ نے نہ صرف کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ 1919ء کے عارضی صلح نامے میں

افغانستان کو داخلی امور میں مکمل طور پر آزاد وخود مختار تسلیم کر چکی تھی بلکہ اس کے بادشاہ جارج پنجم نے امان اللہ کے نام ایک خط میں اسے ہز میجسٹی کے لقب سے خطاب کیا تھا۔ افغانستان کے حکمران نے تیمور شاہ کے بیٹوں میں اقتدار کے لئے خانہ جنگی کے بعد بادشاہ کا لقب ترک کر کے 1826ء میں امیر کا لقب اختیار کیا تھا جبکہ سدوزئی کی جگہ بارک زئی نے دوست محمد خان کی وساطت سے عنان اقتدار سنبھالی تھی۔ چونکہ افغانستان کے سارے قبیلوں کو بارک زئی کی بادشاہت منظور نہیں تھی اسے لئے دوست محمد خان نے اپنے لئے امیر کا لقب اختیار کر کے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ مختار کل بادشاہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا امیر ہے جو سارے قبیلوں کے سرداروں کی مرضی کے مطابق کاروبار حکومت چلائے گا۔ برطانوی سامراج کے لئے بھی ایسی صورت حال پسندیدہ تھی کیونکہ روس سے متصل افغانستان میں ایک آزاد وخود مختار بادشاہ کا وجود اس کے مفادات کے لئے نقصان دہ ہو سکتا تھا لیکن اب 1926ء میں روس کے انقلاب کے مستحکم ہونے کے باعث نہ صرف عالمی صورت حال مختلف ہو گئی تھی بلکہ افغانستان کے اندر ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ امان اللہ کا تختہ الٹنا آسان نہیں ہوگا۔ اس نے گزشتہ چار پانچ سال میں متعدد معاشرتی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی اصلاحات نافذ کر کے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی بظاہر کامیاب کوشش کی تھی۔ اس نے مصطفیٰ کمال کی طرح ملاؤں سے عدالتی اختیارات چھین کر جدید طرز کا بورژوا عدالتی نظام رائج کر دیا تھا۔ اس نے بورژوا دیوانی وفوجداری قوانین نافذ کر کے مغربی لباس کو سرکاری لباس قرار دے دیا تھا۔ بردہ فروشی پر پہلے 1921ء میں ایک سرکاری حکم کے ذریعہ اور پھر 1923ء میں آئینی طور پر پابندی عائد کر دی تھی۔ عورتوں کے پردہ کے خلاف مہم چلائی تھی اور چھ سے گیارہ برس کے بچوں کے لئے مخلوط تعلیم رائج کی تھی۔ مزید برآں سیاسی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے قانون ساز ادارے بنائے گئے تھے اور ترکی کے ماہرین کی مدد سے جدید قوانین کے مسودے تیار کئے گئے تھے جو کونسل اور امیر کی منظوری کے بعد نافذ العمل ہوئے۔ مذہبی اصلاحات کے تحت نہ صرف محتسب کا عہدہ ختم کر دیا گیا تھا بلکہ فوج کے افسروں اور سپاہیوں کے لئے پیری مریدی کی ممانعت کر دی تھی۔ 1924ء میں رجعت پسند قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور دقیانوسی ملاؤں نے ان اصلاحات کی بنا پر امان اللہ کے خلاف اسلام کے نام پر بغاوت کی جسے 1925ء میں کچل دیا گیا تھا۔ تاہم اس بغاوت کا یہ اثر ہوا تھا کہ لڑکیوں کے سکول

بند کر دیئے گئے۔ ملاؤں کو پھر کچھ عدالتی اختیارات دے دیئے گئے اور جو تھوڑی بہت زرعی اصلاحات کی گئی تھیں وہ ختم کر دی گئیں۔ امان اللہ خان کا خیال تھا کہ رجعت پسند اور عوام دشمن عناصر کو یہ رعایت دے کر اس کے اقتدار کو لاحق شدہ خطرہ ٹل جائے گا اور اس نے اسی خوش فہمی کے تحت 1926ء میں بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔

1927ء کے اواخر میں وہ اپنی ملکہ اور متعدد سیاسی مدبروں کے ہمراہ غیر ممالک کے دورے پر گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف ممالک سے براہ راست روابط قائم کر کے برطانوی سامراج کے خلاف افغانستان کی پوزیشن کو بہتر کیا جائے۔ جب وہ اس دورے کے لئے ہندوستان سے گزرا تو جگہ جگہ اس کے حق میں اور برطانیہ کے خلاف مظاہرے ہوئے اور جب وہ مصر پہنچا تو برطانوی سامراج کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا۔ مئی 1928ء میں وہ سوویت یونین پہنچا تو ماسکو کے ارباب اقتدار اور اخبارات نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اخبار ''ازویستیا'' نے ایک مضمون میں امان اللہ خان کی ترقی پسندانہ اصلاحات کی بھرپور تائید وحمایت کی اور مزید لکھا کہ ''آزاد قبائل کا علاقہ'' جہاں برطانیہ نے بزور قوت امن وامان قائم کیا ہے اور جسے اس نے اپنی جارحانہ پالیسی کی تکمیل کے لئے اگلی چوکیوں میں تبدیل کر دیا ہے، افغان نیشنل پالیسی کے تحت لازمی طور پر افغانستان میں شامل ہونا چاہیے کیونکہ اس کے قبائلی تعلقات اور معاشی روابط کا تقاضا یہی ہے۔''[3] ماسکو کے اخبار میں یہ تبصرہ اس مقصد کے تحت کیا گیا تھا کہ اس طرح نہ صرف سوویت یونین اور افغنستان کے تعلقات مزید استوار ہوں گے بلکہ حکومت افغانستان کی جانب سے آزاد قبائل کے علاقہ میں گڑ بڑ پیدا کرنے کی وجہ سے برطانوی سامراج کے لئے مزید مشکلات پیدا ہوں گی لیکن برطانوی سامراج کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھا۔ اسے سامراجیت کا سب سے زیادہ تجربہ تھا۔ وہ 1919ء کی تیسری افغان جنگ میں ہزیمت اٹھانے کے بعد ترقی پسند امان اللہ خان کا تختہ الٹنے کی مسلسل سازش کر رہا تھا۔ 1924ء کی بغاوت میں اس کی سازش کا خاصا حصہ تھا۔ رجعت پسند قبائلی سرداروں، عوام دشمن جاگیرداروں اور دقیانوسی ملاؤں پر مشتمل باغی عناصر کو برطانوی سامراج کی تائید وحمایت حاصل تھی۔

اگست 1928ء میں جب امان اللہ ہندوستان، مصر، سوویت یونین اور بعض یورپی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد واپس آیا اور اس نے مزید کچھ سیاسی، آئینی اور انتظامی اصلاحات

نافذ کرنے کی کوشش کی تو متذکرہ سامراج نواز عناصر نے پھر بغاوت کردی۔ اس مقصد کے لئے ملاؤں نے امان اللہ کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے اور ثبوت کے طور پر امان اللہ کی ملکہ کی ایسی تصویریں عوام الناس میں تقسیم کیں جن میں وہ بے پردہ تھی اور اس نے یورپی لباس پہنا ہوا تھا۔ ملاؤں کا اصرار یہ تھا کہ اسلام کے تحفظ کے لئے یعنی قبائلی و جاگیرداری نظام کے تحفظ کے لئے ایسے بادشاہ کا تختہ الٹنا ضروری ہے۔ ملک گیر بدامنی کے اسی دور میں یعنی 1928ء کے اواخر میں افغان فوج کے ایک تاجک نان کمیشنڈ آفیسر حبیب اللہ نے جو بعد میں ''بچہ سقہ'' کے نام سے مشہور ہوا، پہلے غریب کسانوں کی امداد کے گمراہ کن نعرے لگائے اور پھر اس نے کابل میں داخل ہو کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ امان اللہ نے اس صورت کے پیش نظر پہلے تو اپنا دارالخلافہ قندھار منتقل کرلیا مگر جب وہاں بھی اسے ہزیمت اٹھانا پڑی تو وہ فرار ہو کر یورپ چلا گیا۔ ''بچہ سقہ'' کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ امان اللہ خان کے غیر ملکی دورے کے دوران تاجک کسانوں میں دو وجوہ کی بنا پر زبردست بدامنی پھیل گئی تھی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ امان اللہ خان کی سطحی اصلاحات نے ان پر جاگیردارانہ مظالم میں کوئی کمی نہیں کی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ محض تاجک ہونے کی حیثیت سے بھی حکومت کی انتظامی مشینری اور ملک کے حکمران طبقوں کے جبر و تشدد کا شکار تھے۔ ان غریب کسانوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ ''بچہ سقہ'' نے ان کی حمایت میں علم بغاوت بلند کیا ہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس شخص کو دراصل اندرونی و بیرونی رجعت پسندوں کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ اس نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے اس وعدہ کی بنا پر اقتدار وقتی طور پر مستحکم کرلیا کہ وہ ٹیکسوں میں کمی کرے گا اور جن سرکاری واجبات کی ابھی تک ادائیگی نہیں ہوئی انہیں منسوخ کر دے گا۔ جاگیرداروں اور ملاؤں نے اسے فوراً اپنا امیر تسلیم کرلیا کیونکہ اس نے امان اللہ کے سارے قوانین منسوخ کر کے ان کی مراعات بحال کردی تھیں۔

تاہم 1929ء کے اوائل میں ملک میں پھر بدامنی کا دور شروع ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ''بچہ سقہ'' کی حکومت برائے نام تھی دراصل عنان اقتدار عوام دشمن قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں تھی۔ انہوں نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق عوام الناس پر بے پناہ مظالم کئے۔ انہوں نے نہ صرف ٹیکسوں میں اضافہ کردیا بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ کئی سال کے پیشگی ٹیکس ادا کئے جائیں۔ برطانوی سامراج نے ''بچہ سقہ'' کو محض امان اللہ خان کی سامراج دشمن

حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے استعمال کیا تھا، چونکہ اس کا شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا اور انگریزوں کو معلوم تھا کہ اس بنا پر اس کا اقتدار دیر پا ثابت نہیں ہو سکے گا، لہٰذا انہوں نے ''بچہ سقہ'' کی جگہ لینے کے لئے ایک متبادل شاہی گھوڑے کو طلب کر لیا۔ یہ گھوڑا پشاور میں سکھوں کے پٹھو گورنر سردار سلطان محمد خان کا پڑپوتا تھا اور اس کا نام جرنیل نادر شاہ تھا۔ یہ شخص 1913ء میں انگریزوں کی افغانستان سے تیسری جنگ کے دوران امان اللہ خان کا ساتھی تھا لیکن اس نے 1924ء میں امان اللہ کے خلاف بغاوت کو کچلنے سے انکار کر دیا تھا اور پھر فرار ہو کو پیرس چلا گیا تھا جہاں برطانوی سامراج ''داشتہ آید بکار'' کے اصول کے تحت گزشتہ چار پانچ سال سے اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ یہ 1928ء میں انگریزوں کی دعوت پر اپنے دو بھائیوں ہاشم اور شاہ ولی کے ہمراہ ہندوستان پہنچے جہاں اس کو فوجی ساز و سامان سے لیس کیا گیا۔ اس نے مارچ 1929ء میں افغانستان پر حملہ کیا جو اسی سال اکتوبر میں کامیابی پر ختم ہوا اور اس طرح کابل کے تخت پر پھر برطانوی سامراج کے ایک پٹھو کا قبضہ ہو گیا۔ نادر شاہ نے حبیب اللہ اور اس کے قریبی ساتھیوں کو قتل کر کے 15 راکتوبر 1929ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اس طرح افغانستان عملاً ایک مرتبہ پھر اپنی آزادی و خود مختاری کھو بیٹھا اور اس کی حیثیت پھر روس اور برصغیر کی برطانوی سلطنت کے درمیان ایک بفر سٹیٹ کی ہو گئی۔ امان اللہ خان اپنے اقتدار کو 9 سال سے زیادہ عرصہ تک محض اس لئے قائم نہ رکھ سکا کہ اس نے اندرون ملک جو سیاسی، آئینی، عدالتی، انتظامی، معاشرتی، ثقافتی، فوجی اور مذہبی اصلاحات کی تھیں وہ نہ صرف سطحی تھیں بلکہ ان کو مؤثر طریقے سے جامہ عمل پہنانے کے لئے اس کے پاس کوئی منظم سیاسی جماعت نہیں تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کوئی قوم محض بیوروکریسی کی وساطت سے اور کاغذی قوانین کے ذریعے پرانے طریقہ زندگی میں سطحی تبدیلی کر کے ترقی نہیں کر سکتی۔ ایک انقلابی اور نظریاتی تنظیم کی نگرانی میں فرسودہ معاشی نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کئے بغیر باقی شعبہ ہائے زندگی میں سطحی اصلاحات غیر مؤثر اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں۔ نادر شاہ نے انگریزوں کی امداد سے افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جاگیرداری نظام کے تحفظ، تاجروں کی عزت کے تحفظ، ''اسلام پسندی'' اور شریعت کے قانون کے نفاذ کے وعدے کئے اور ان پر اس طرح عمل کیا کہ ظالمانہ قبائلی و جاگیرداری نظام پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا اور ملک کی داخلی و خارجی پالیسی پھر برطانوی کنٹرول میں چلی گئی۔

اولف کیرو لکھتا ہے کہ نادر شاہ 1929ء میں افغانستان پر حملہ کرنے کے لئے محسود اور وزیری قبائل کی عملی امداد حاصل کرنے میں اس لئے کامیاب ہو گیا تھا کہ اس کے بھائیوں ہاشم اور شاہ ولی خان نے قبائلیوں کو یہ تاثر دیا تھا کہ وہ امان اللہ خان کی تخت پر بحالی کے لئے جنگ کر رہا ہے۔ ان قبائل میں امان اللہ خان کا اثر تھا اور وہ قبل ازیں 1919ء کی جنگ میں اس کی امداد کر چکے تھے۔ چونکہ ان قبائل کی زمینیں ڈیورنڈ لائن کی دوسری جانب افغانستان کے علاقے میں بھی تھیں اس لئے وہ انگریزوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ترغیب پر فوج در فوج نادر شاہ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ اکتوبر 1929ء میں یہی قبائل سب سے پہلے کابل میں داخل ہوئے تھے اور چونکہ اس موقع پر نادر شاہ کے پاس انہیں معاوضہ دینے کے لئے کوئی پیسہ نہیں تھا اس لئے اس نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ کابل شہر میں لوٹ مار کر کے اپنے لئے مال غنیمت جمع کر لیں۔ تاہم جن قبائلیوں کو حسب خواہش مال غنیمت نہ مل سکا انہیں نادر شاہ کی تخت نشینی پر بہت غصہ آیا۔ ان کا شکوہ یہ تھا کہ انہوں نے امان اللہ خان کے لئے جنگ لڑی ہے لیکن تخت پر کسی اور نے قبضہ کر لیا ہے۔[4]
تاہم نادر شاہ نے چند ماہ میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا اور پھر اس نے اپنے محسن برطانوی سامراج کو یقین دلایا کہ وہ ہندوستان کی مسلمہ سرحد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اس مقصد کے لئے مئی 1930ء میں لندن میں افغانستان کے سفیر اور برطانیہ کے وزیر خارجہ کے درمیان خط و کتابت ہوئی۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ نے 6رمئی 1930ء کے خط میں لکھا تھا کہ ''ہم اس امر پر متفق ہیں کہ ہز میجسٹی محمد نادر شاہ کی حالیہ تخت نشینی کے پیش نظر 22رنومبر 1921ء کے معاہدے کی از سر نو توثیق کرنا مناسب ہوگا لہٰذا میں یہ بات بطور ریکارڈ لکھ رہا ہوں کہ یہ معاہدات بدستور پوری طرح مؤثر ہیں اور افغان سفیر کا جواب یہ تھا کہ میں بھی برائے ریکارڈ لکھ رہا ہوں کہ یہ دونوں معاہدات بدستور کلی طور پر کارآمد اور مؤثر ہیں۔'' 1933ء کے اوائل میں حکومت ہندوستان نے عملی طور پر ان معاہدات کی پابندی کی جب کہ اس نے وزیرستان کے ان قبائل کے گھروں پر بمباری کی جنہوں نے ڈیورنڈ لائن کو عبور کر کے امان اللہ خان کی بحالی کے لئے افغانستان پر حملہ کر دیا تھا۔''[5] لیکن نادر شاہ کا اقتدار پھر بھی محفوظ نہ رہا۔ اسی سال کے اواخر میں اسے قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ظاہر شاہ تخت نشین ہو گیا۔

برطانوی سامراج نے پھر 1938ء میں بھی اپنے پٹھو افغان بادشاہ ظاہر شاہ کے اقتدار

کے تحفظ کے لئے مؤثر کاروائی کی جبکہ وزیرستان کے محسود اور وزیری قبائل نے ایک ''پیر صاحب'' کے حکم کے مطابق امان اللہ خان کو کابل کے تخت پر بحال کرنے کے لئے افغانستان پر حملہ کر دیا تھا۔ان کا یہ لشکر بہت بڑا تھا اور حکومت ہندوستان نے اس لشکر کی سرکوبی کے لئے بہت فوجی طاقت استعمال کرنے کے علاوہ ''پیر صاحب'' کو بہت بڑی رشوت دی تھی۔ برطانوی مؤرخین کا بیان یہ ہے کہ 1938ء میں برصغیر کے شمال مغربی قبائلی علاقے اور افغانستان میں یہ خطرناک صورتحال ہٹلر کے ایجنٹوں نے پیدا کی تھی۔ان کا مقصد یہ تھا کہ افغانستان اور شمال مغربی سرحدی علاقے میں بدامنی جاری رہے تاکہ برطانیہ کی بہت سی فوجیں یہاں پابند ہو جائیں۔ چونکہ سرحد کے عوام قدامت پسند حنفی ہیں اسے لئے وہ بغداد کے پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بہت عقیدت مند ہیں۔ہٹلر نے ان کی اس مذہبی عقیدت مندی سے فائدہ اٹھایا۔اس نے پہلے تو یروشلم کے سابق مفتی سید امین الحسینی کی خدمات حاصل کیں اور پھر اس کی وساطت سے شام کے ایک تربیت یافتہ فسطائی ایجنٹ کو بطور ''جیلانی پیر'' وزیرستان بھیجا۔اس شخص نے یہاں آکر مقامی لوگوں کو اپنے تقویٰ و پرہیز گاری سے بہت متاثر کیا۔ جب بہت سے محسود اور وزیری قبائل اس کے معتقد بن گئے تو اس نے کھلم کھلا ترغیب دی کہ وہ افغانستان پر حملہ کر کے امان اللہ خان کو کابل کے تخت پر بحال کریں۔اس کے اس حکم کی تعمیل ہوئی اور ظاہر شاہ کی حکومت ڈانواں ڈول ہونے لگی تو انگریزوں کی بروقت فوجی اور مالی مداخلت سے صورت حال پر قابو پالیا گیا۔ تاہم وزیرستان کے قبائل نے یہ بات کبھی فراموش نہیں کہ نادر شاہ نے 1929ء میں محض ان کی امداد سے کابل کے تخت پر قبضہ کیا تھا اور وہ جب چاہیں گے اس کے خاندان کو اقتدار سے محروم کر دیں گے۔وہ اب بھی امان اللہ خان کے شاہی خاندان کے حق میں ہیں اور نادر شاہ کے خاندان کو کابل کے تخت کا مستحق نہیں سمجھتے۔انہیں اچھی طرح یاد ہے کے یہ خاندان پشاور کے غدار سردار سلطان محمد خان کی اولاد میں سے ہے جس نے معمولی پوزیشن اور مالی منفعت کے لئے صوبہ سرحد کو سکھا شاہی کے پاس فروخت کر دیا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران اگرچہ افغانستان سرکاری طور پر غیر جانبدار رہا لیکن عملاً اس کی یہ غیر جانبداری انگریزوں اور دوسرے اتحادیوں کے حق میں تھی۔ظاہر شاہ نے اس عرصے میں وزیرستان میں کوئی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی حالانکہ ہٹلر انگریزوں کی زیادہ سے زیادہ

فوجیں اس جگہ مصروف رکھنا چاہتا تھا اور ہندوستان میں کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی پرتشدد تحریک نے حکومت ہندستان کے لئے خاصی مشکلات پیدا کی تھیں۔ قبل ازیں امیر دوست محمد خان اور امان اللہ خان نے ایسے ہی حالات میں بزورقوت دریائے سندھ تک کا علاقہ لینے کی کوشش کی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نومبر 1945ء میں یہ بات تقریباً واضح ہوگئی کہ برطانیہ برصغیر سے دست بردار ہورہا ہے تو ظاہر شاہ نے اپنے ان توسیع پسندانہ عزائم کی سفارتی ذرائع سے تکمیل کرنے کی کوشش کی جنہیں امیر دوست محمد خان اور امان اللہ خان بزورقوت پورا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ حکومت افغانستان نے حکومت برطانیہ کے نام ایک مراسلے میں یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی آزادی کی صورت میں سرحد کے ان علاقوں کو اپنی ''مادروطن'' سے ملاپ کی اجازت دی جائے جنہیں برطانیہ نے گزشتہ صدی میں اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ چونکہ یہ مطالبہ 1893ء کے سرحد بندی معاہدے کے منافی تھا اس لئے حکومت برطانیہ نے اسے فوراً مسترد کر دیا۔ 1946ء میں حکومت افغانستان نے ہندوستان کی عبوری حکومت سے بھی اسی قسم کی درخواست کی مگر نئی دہلی سے بھی اسے کورا جواب ملا تھا حالانکہ ان دنوں جواہر لال نہرو ہندوستان کے محکمہ خارجہ کا انچارج تھا اور کچھ عرصہ قبل اس کے دورہ سرحد کے موقع پر لاکھوں پٹھان عوام نے کانگرس کے خلاف اور مسلم لیگ کے حق میں پرجوش اور پرتشدد مظاہرے کئے تھے۔ مالاکنڈ اور دوسری ایجنسیوں کے قبائلی عوام نے اس پر بالکل واضح کردیا تھا کہ انہیں پاکستان میں شمولیت کے سوا کوئی اور صورت قبول نہیں ہوگی۔ نہرو کے محکمہ خارجہ کا سرکاری موقف یہ تھا کہ اگر ہندوستان اور افغانستان کی سرحد کے مستقبل کا تعین ماضی کی تاریخ کی بنیاد پر ہی ہونا ہے تو پھر نئی سرحد ڈیورنڈ لائن کے بہت دور مغرب میں مقرر کی جائے گی۔ نہرو کے اس جواب کی سیاسی بنیاد یہ تھی کہ اس وقت تک برصغیر کی تقسیم کا کوئی رسمی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور کانگرس اپنے آپ کو برصغیر کے سارے علاقے کا جائز اور قانونی وارث تصور کرتی تھی۔ کانگرسی لیڈروں کا خیال تھا کہ اگر انہیں یہ امر مجبوری اپنے ''ملک'' کی تقسیم منظور کرنا بھی پڑی تو وہ عارضی ہوگی۔ پاکستان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا اور پورا برصغیر بہت جلد پھر ان کے زیر تسلط آجائے گا۔ وہ افغان حکمرانوں کو برصغیر کا ایک انچ دینے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ ہندوؤں کا بورژوا طبقہ ساری دنیا کے بورژوا طبقوں کی طرح فطرتاً توسیع پسند تھا۔ وہ تو افغانستان سمیت ہندوستان کے گردونواح کے چھوٹے ممالک کو بھی اپنے

زیر تسلط یا زیر اثر لانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ صوبہ سرحد کا جنگی اہمیت کا علاقہ ایک ایسے ملک کے حوالے کر دے جہاں ابھی تک قرون وسطیٰ کا قبائلی وجاگیرداری نظام رائج تھا۔

باب:4

آزاد پختونستان کا شوشہ......انگریزوں اور کانگرس کی ملی بھگت کا نتیجہ

ہندوستان کا نیا وائسرائے ماؤنٹ بیٹن (Mount Batten) 4/مارچ 1947ء کے تیسرے ہفتے میں نئی دہلی پہنچا تو صوبہ سرحد میں کانگرس کی حکومت کے خلاف مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک جاری تھی اور اس بنا پر اس صوبہ کے امن وامان کی صورت روز بروز خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے تقریباً تین ہفتے تک دہلی میں کانگرسی اور مسلم لیگی لیڈروں سے اقتدار کی منتقلی کے مختلف منصوبوں کے بارے میں بات چیت کی۔ 16/اپریل کو ماؤنٹ بیٹن نے تمام صوبوں کے گورنروں کو دہلی میں طلب کیا۔ دوروزہ گورنروں کی کانفرنس کا مقصد ہندوستان میں انتقال اقتدار کے برطانوی منصوبے پر گورنروں سے مشورہ حاصل کرنا تھا۔ صوبہ سرحد کا گورنر اولف کیرو تقسیم ہند کا مخالف تھا اور اس کا خیال تھا کہ صوبہ سرحد کی مخصوص صورتحال کو ہندوستان کو متحد رکھنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور کانگرسی اور لیگی رہنماؤں کو وزارتی مشن منصوبے کے دائرے میں متحدہ ہند کے کسی حل پر متفق ہونے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اولف کیرو نے رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ''وزارتی مشن منصوبہ کے خطوط پر کسی تصفیے تک پہنچنے کی خاطر صوبہ سرحد اور سرحدی قبائل کو ایک مضبوط لیور (Lever) کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مستقبل کے ہندوستان میں سرحدی قبائل اور صوبہ سرحد کس قدر اہم حیثیت کے حامل ہوں گے، ابھی تک اس سے اغماض برتا گیا ہے مضبوط فرنٹیئر کے بغیر نہ تو ایک ہندوستان اور نہ ہی دو ہندوستان ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ صوبہ سرحد کی کل ہند کے دفاع کے لحاظ سے جو عمومی اہمیت پائی جاتی ہے اس کے

علاوہ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ پارٹیشن سکیم کے اندر تجویز کردہ حقیقی پاکستان کے تحت نہ تو سرحدی قبائل اور نہ صوبہ سرحد (جو اس وقت بھاری سرکاری امداد پر انحصار کرتے ہیں) معاشی طور پر گزارہ کر سکیں گے۔ اس وقت مرکز صرف قبائل کو اڑھائی کروڑ روپے سالانہ ادا کرتا ہے اور صوبہ کو پہلے ہی ایک کروڑ روپے سالانہ دیتا ہے جب کہ صوبہ اب اس میں اضافے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ صوبائی حکومت خواہ کانگرس کی ہو، خواہ لیگ کی، خواہ کوئی اور، وہ مجبوراً اس امداد کے جاری رہنے پر اصرار کرے گی بلکہ یقیناً اس میں اضافے کا مطالبہ کرے گی اگر تمام فریق اور بالخصوص لیگ ہائی کمان اس حقیقت کو تسلیم کر لیں تو اس سے کانگرس اور لیگ کے مابین کل ہند سطح کے مسائل اپنے صحیح تناظر میں دیکھے جا سکیں گے۔'' کیرو نے تجویز کیا کہ صوبہ سرحد میں جلد از جلد دوبارہ انتخابات کرا دینے چاہئیں۔ اگر کانگرس دوبارہ کامیاب ہو گئی تو اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ فرنٹیئر بہر طور ایک کل ہند مسئلہ ہے، کانگرس کی پوزیشن مزید مضبوط ہو جائے گی اور اگر لیگ جیت گئی تو اس اہم پہلو کو تسلیم کر لینے کی وجہ سے وہ ایک اعتدال پسند راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور بٹوارے پر زیادہ زور نہ دے سکے گی۔'' اگلے روز کے اجلاس میں ماؤنٹ بیٹن نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے بارے میں رائے دی کہ ''یہاں کے عوام الناس کی سیاسی اور جذباتی خواہشات سے قطع نظر اس صوبہ کے معاملات چلانے کے لئے اتنی بھاری قیمت درکار ہوگی کہ مسلم لیگ اسے لینے میں کم دلچسپی رکھے گی۔'' اس کی مزید رائے یہ تھی کہ ''اگر مسٹر جناح صوبہ سرحد کو نہ لینے کا چوائس کریں تو ان کے حصے میں جو پاکستان آئے گا وہ زیادہ قابل عمل (Viable) ہوگا جبکہ کانگرس تو بقیہ ہندوستان لے ہی لے گی۔''[1] گویا برطانوی سامراج کے کارندوں کی رائے میں عوام الناس کی ''سیاسی اور جذباتی خواہشات'' کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ وہ صوبہ سرحد کے مخصوص قبائلی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح صوبہ سرحد کو پاکستان سے الگ رکھنے کا جواز بنایا جائے اور پھر اسے ''مضبوط لیور'' کے طور پر استعمال کرتے ہوئے تقسیم ہند کو سبوتاژ کر دیا جائے اور اگر بالفرض محال تقسیم کرنا ہی پڑے تو پاکستان اتنا چھوٹا اور کٹا پھٹا ہو کہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے۔ تاریخ عوام الناس کی ''سیاسی اور جذباتی خواہشات'' کو کوئی اہمیت دے یا نہ دے لیکن تاریخ کے سنجیدہ طالب علموں کو معلوم ہے کہ انسانی تاریخ کے دھارے میں عوام الناس کی سیاسی اور جذباتی خواہشات کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے، چنانچہ سرحد میں عوامی خواہشات بالآخر رنگ لائیں۔

صوبہ سرحد میں کانگرسی وزارت کے خلاف مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی اور پشاور اور ایبٹ آباد کے علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی اقلیت پر حملے شروع ہو چکے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ صوبہ سرحد میں لوگوں کے پاس بندوقوں اور دوسرے ہتھیاروں کی کمی نہیں اور اگر ان ہتھیاروں کا وسیع پیمانے پر استعمال شروع ہو گیا اور ملحقہ علاقوں کے قبائلیوں نے قتل وغارت اور لوٹ مار کے بازار گرم کر دیئے تو صورت حال پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔

فرقہ وارانہ فساد کی ابتدا سب سے پہلے 15 اپریل کو ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل میں ہوئی جو مسلم لیگی نظر بندوں سے بھری پڑی تھی۔ فساد کے شعلے فوراً ہی شہر تک پہنچ گئے اور لوٹ مار، قتل وغارت اور آتشزدگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پولیس کی امداد کے لئے منزئی سے فوج طلب کی گئی مگر لوٹنے اور آتشزدگی کی اکا دکا وارداتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ کے دو ارکان موقع پر پہنچے تو انہوں نے فسادیوں کے خلاف ٹینک اور توپیں استعمال کرنے پر زور دیا۔ ان کی اس خواہش کی تعمیل ہوئی اور بندوقچیوں کے ایک مورچے کو گولہ باری سے اڑا دیا گیا۔ سرکاری اعلان کے مطابق چھ دن کے فساد میں 900 دکانیں نذر آتش کی گئیں اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کتنے ہندوؤں اور سکھوں کی جانیں گئیں۔

شہر میں کچھ امن ہوا تو فساد قریبی دیہات میں پھیل گیا۔ گول بازار، پہاڑ پور، کوٹلہ اور موسیٰ زئی میں بہت سے ہندو اور سکھ مارے گئے اور ان کے گھروں اور دکانوں کو لوٹ لیا گیا۔ 17 اپریل کو ٹانک میں صورت حال بہت سنگین ہوئی۔ فساد ایک بازار میں معمولی تنازعے پر شروع ہوا اور فوراً ہی مقامی مسلمانوں اور راہ گیر قبائلیوں نے ہندوؤں کی دکانوں اور گھروں پر حملہ کر دیا۔ بہت سی عمارتوں کو آگ لگائی گئی جو تین چار دن تک بھڑکتی رہی۔ بعض خوشحال ہندوؤں نے اپنی حفاظت کے لئے محسود قبائلیوں کی خدمات حاصل کی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان قبائلی محافظوں اور فسادیوں کے درمیان خوب گولیاں چلیں۔ یہ محسود قبائلی ہندوؤں سے فی گھنٹہ کے حساب سے معاوضہ وصول کرتے تھے اور ہر گھنٹے کے بعد ان کے معاوضے کی شرح میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ساؤتھ وزیرستان سکاؤٹس کے ایک یونٹ نے تین چار دن کے بعد بڑی مشکل سے صورت حال پر قابو پایا۔

اگرچہ اس فساد میں انسانی جانوں کا اتلاف نہیں ہوا تھا لیکن نذر آتش ہونے والی

عمارتوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فسادیوں کو ہندوؤں کے قتل میں اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ لوٹ مار میں تھی۔ تجارت اور ساہوکار پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ اناج، کپڑے اور دوسری ضروریات زندگی کی بہت قلت تھی مگر ہندوؤں کو اس قسم کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ ان کے پاس بے شمار ریشمی کپڑے تھے اور ان کے گودام اناج سے بھرے رہتے تھے۔ غریب مسلمانوں اور قبائیلیوں کو موقع ملا تو انہوں نے خوب لوٹا۔ تین چار دن میں بہت سے خوشحال ہندوؤں کا سب کچھ لوٹ لیا گیا، ان کے گھر جلا دیئے گئے اور وہ خانماں برباد ہو گئے۔

ماؤنٹ بیٹن کو شمال مغربی سرحدی صوبے میں بدامنی کی اطلاع ملی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس لئے کہ یہ علاقہ سوویت یونین کے نزدیک واقع ہونے کے باعث انتہائی فوجی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ صورت حال کا موقع پر جائزہ لینے کے لئے 28 راپریل کو پشاور پہنچا۔ ابھی وہ گورنر ہاؤس میں پہنچا ہی تھا کہ صوبائی گورنر سر اولف کیرو نے سراسیمگی کی حالت میں اس کے کمرے میں آ کر بتایا کہ گورنر ہاؤس کے قریب ہی مسلم لیگ کا ایک بہت بڑا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ مظاہرین اس کے سامنے اپنی شکایات کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس مقصد کے لئے جلوس کی صورت میں گورنر ہاؤس آنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ مظاہرین کی تعداد 70 ہزار سے زیادہ تھی اور ان میں بہت سے دور دراز علاقوں سے کئی دن تک پیدل سفر کر کے آئے ہوئے تھے۔ گورنر نے کہا کہ صورت حال پر محض اسی طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ وائسرائے خود مظاہرین کے پاس جا کر ان کی شکایات سنے۔ ماؤنٹ بیٹن نے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب سے مشورہ کیا اور پھر خود کننگھم پارک میں مظاہرین کے پاس چلا گیا۔ وہ وہاں تقریباً نصف گھنٹہ رہا۔ اس نے کوئی تقریر تو نہ کی لیکن اس کی موجودگی سے مظاہرین کا غصہ فرو ہو گیا اور اس طرح شہر میں بہت بڑی بدامنی کا خطرہ ٹل گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے صوبہ سرحد میں اپنے تین روزہ قیام کے دوران بعض قبائلی علاقوں کا دورہ کرنے کے علاوہ مقامی کانگرسی اور مسلم لیگی لیڈروں سے بات چیت کی اور یہ تاثر لے کر واپس دہلی آیا کہ صوبہ سرحد میں کانگرس کا سیاسی جنازہ نکل چکا ہے۔ لہٰذا اب برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہو گئی ہے۔

واپس دہلی پہنچ کر 30 راپریل کو ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو ایک خط کے ذریعے اپنے دورہ سرحد کے تاثرات سے آگاہ کیا۔ اس نے لکھا کہ "صوبے میں واضح طور پر فرقہ وارانہ جذبات کی لہر اٹھی ہوئی ہے جس کا اظہار ایک ایسی وزارت کے خلاف ایجی ٹیشن کی صورت میں ہو رہا ہے جو

ہندو کانگرس کے غلبے کے زیر اثر سمجھی جاتی ہے خالص فرقہ واریت پر مبنی سیاست پر خواہ کتنا ہی افسوس کیوں نہ کیا جائے، اس جذبے کی موجودگی اور اس کی قوت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے قبائلیوں کے بارے میں تاثر بیان کرتے ہوئے لکھا کہ'' وہ اپنی قوت اور حیثیت کے بارے میں پر اعتماد ہیں۔ وہ کسی ایسے ملک میں شامل ہونے کا سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں کہ جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہاں ہندوؤں کے غلبے کا امکان ہوگا آفریدیوں نے تو یہاں تک واضح کر دیا ہے کہ اگر جانشین حکومت ہند کے ساتھ ان کا تسلی بخش طور پر کوئی قابل عمل تصفیہ طے پا گیا تو ٹھیک ہے ورنہ وہ خود کو اس امر میں کلی طور پر آزاد سمجھتے ہیں کہ وہ افغانستان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔[2]

یکم مئی کو ماؤنٹ بیٹن نے جو ہفتہ وار رپورٹ لندن ارسال کی اس میں بھی دورہ سرحد کے تاثرات ریکارڈ کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ میرے دو روزہ قیام پشاور کے دوران'' مجھے موصول ہونے والی ٹیلی گرام، خطوط اور پوسٹ کارڈوں کی تعداد 3129 رہی۔ ان میں سے زیادہ تر میں کانگرس حکومت پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا اور دفعہ 93 کے تحت از سر نو انتخابات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔'' ماؤنٹ بیٹن اپنے قیام کے دوسرے روز خیبر ایجنسی کے علاقے میں گیا اور وہاں لنڈی کوتل میں اس نے قبائلی جرگہ منعقد کیا۔ اس کے بارے میں اس نے رپورٹ میں لکھا کہ ''اس جرگہ میں آفریدیوں، شنواریوں، سلمانیوں اور کلاغوریوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ بعد ازاں گورنمنٹ ہاؤس میں وزیرستان کے علاقے سے تعلق رکھنے والے محسود، وزیری اور دور قبائل کے نمائندوں نے مجھ سے ملاقات کی۔ تمام قبائل میں موجود اتفاق رائے قابل ذکر ہے۔ وہ یقین دہانی چاہتے ہیں کہ خیبر اور باقی علاقے ان کو واپس کر دیئے جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم موجودہ ایک پارٹی کمیٹی کے ساتھ کوئی معاملے طے نہیں کریں گے اور ہم کسی صورت میں بھی ہندو غلبے کے ماتحت نہیں رہیں گے، اس کے بجائے ہم بہت جلد افغانستان کے ساتھ تعلقات قائم کر لیں گے۔ محسودوں اور وزیریوں نے پاکستان کے حق میں پر زور مطالبہ کیا ہے اور کانگرس حکومت توڑنے کا مطالبہ کیا ہے۔''[3]

ان تاثرات کے ذریعے ماؤنٹ بیٹن یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ جہاں تک صوبہ سرحد کے مستقبل کے فیصلے کا تعلق ہے، وہاں کی کانگرس وزارت کی نمائندہ حیثیت مجروح

ہو چکی ہے، وہاں رائے عامہ کا ازسر نو تعین کرنا ضروری ہے لیکن 30 اپریل کو ایرک میول (Eric Mıevelle) نے انتقال اقتدار کے مجوزہ منصوبے کا مسودہ جب نہرو کو دکھایا تو نہرو نے سرحد میں مجوزہ نئے انتخابات کو رد کر دیا تھا۔ 22 اپریل کی ملاقات میں نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ تاثر دیا تھا کہ اگر رائے عامہ کو صرف انتقال اقتدار کی حد تک دریافت کیا جائے تو انتخابات ہو سکتے ہیں۔[4] گویا وہ ریفرنڈم کے لئے آمادہ تھا۔

مجوزہ اعلان کا جو مسودہ لندن ارسال کیا گیا تھا اس میں سرحد کے لئے نئے انتخابات کی سفارش کی گئی تھی لیکن لارڈ اسے (Ismay) جو اس مسودے پر برطانوی کابینہ کے اجلاسوں میں ماؤنٹ بیٹن کی نمائندگی کے لئے گیا تھا، اسے جاتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے یہ سمجھا دیا تھا کہ سرحد میں انتخابات کی تجویز کو ریفرنڈم سے بدل دیا جائے۔ یکم مئی کو ماؤنٹ بیٹن نے وزیر ہند ارل آف لسٹوول (Earl of Listowell) کے نام مراسلے میں بھی لکھ دیا تھا کہ "اسمے آپ کو صوبہ سرحد کی پیچیدہ صورت حال کے پس منظر کے بارے میں آگاہ کر دے گا اور یہ بھی بتا دے گا کہ نہرو صرف ریفرنڈم کو قبول کرنے پر آمادہ ہے جس میں یہ پوچھا جائے کہ آیا صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہو گا یا ہندوستان میں؟ اگر ہم نے مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک کے دباؤ میں آ کر انتخابات کرانے کی کوشش کی تو کانگرس نامنظوری کا شدید اظہار کرنے کے لئے ان انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کر دے گی۔"[5] اگرچہ ماؤنٹ بیٹن خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا کہ سرحد میں کانگرس کا جنازہ نکل چکا ہے اور وزارت اپنی حیثیت کھو چکی ہے لیکن وہ کانگرس کی خوشنودگی کی خاطر وہاں تازہ انتخابات کرانے کے اپنے فیصلے سے انحراف کر رہا تھا۔

2 مئی کو ماؤنٹ بیٹن نے جناح اور لیاقت کے ساتھ ملاقات کی جس میں زیادہ گفتگو صوبہ سرحد کے بارے میں رہی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اگرچہ یہ تسلیم کیا کہ صوبہ سرحد میں تازہ انتخابات کے لئے کیس واضح طور پر موجود ہے لیکن اس بات پر اڑا رہا کہ "میں کسی صورت میں بھی تشدد اور طاقت کے سامنے نہیں جھکوں گا۔" اس پر جناح نے موقف اختیار کیا کہ "اس وقت لوگوں کو نہ آپ کنٹرول کر سکتے ہیں اور نہ میں۔" جناح نے مطالبہ کیا کہ کانگرس وزارت کو توڑ دیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس مطالبے کو سختی سے رد کر دیا اور کہا کہ پہلے کانگرس میرے اس رویئے پر ناراض ہے جو میں نے سرحد کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ کانگرس حکومت بدستور برقرار

رہے گی اور اگر کوئی انتخاب ہوگا تو وہ فقط یہ جاننے کے لئے ہوگا کہ صوبہ کو پاکستان میں شامل ہونا ہے یا ہندوستان میں؟ جناح کا موقف تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کے ہوتے ہوئے یہ انتخاب منصفانہ نہیں ہوسکتا لیکن ماؤنٹ بیٹن خان وزارت کو برطرف کرنے پر بالکل آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بجائے اس نے جناح پر زور دیا کہ سرحد میں مسلم لیگ کو اپنی ایجی ٹیشن ختم کر دینی چاہیے۔ جناح نے کہا کہ جب تک وہاں خان وزارت موجود ہے میں کوئی امید نہیں کر سکتا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا ''اس کا جواب تو پھر یہ ہے اب میرے لئے ضروری ہو جائے گا کہ اگر لیگ وہاں گڑبڑ پھیلانے پر تلی ہوئی ہے تو میں وہاں مسلح افواج بھیجوں اور فضائیہ کے طیاروں کو حرکت میں لانے پر مجبور ہو جاؤں۔'' [6] اس کھلی دھمکی سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ انگریز حکمران سرحد میں خان وزارت کو ہر قسم کا تحفظ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان حالات میں انگریز برصغیر میں اپنی جانشین بڑی پارٹی کانگرس کو خفا کرنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

جنوبی ہندوستان میں ہندو۔ مسلم تضاد اس قدر شدید نہیں تھا اس لئے وہاں سے تعلق رکھنے والے ہندو رہنما اس تضاد کے بارے میں زیادہ معروضی رویہ کے حامل تھے۔ 2 رمئی کو جنوبی ہند کی ریاست ٹراونکور کے دیوان سی۔ پی۔ راما سوامی آئیار نے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ملاقات کے دوران صوبہ سرحد کے حالات پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا ''اگرچہ میں ہندو ہوں لیکن میں یہ بے دھڑک ہو کر کہتا ہوں کہ کانگرس صوبہ سرحد کو پرلے درجے کی دھونس جمانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ دونوں خان برادران کانگرس کی جانب سے محض شور شرابا کرنے والوں میں سے ہیں جنہیں کانگرس اس مقصد کے لئے پیسے دیتی ہے کہ وہ 94 فیصد اکثریت کے مسلم صوبے کو پاکستان میں شامل ہونے سے باز رکھے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس کا اثر قبول نہیں کریں گے۔'' [7] لیکن ماؤنٹ بیٹن نے اس مشورہ کا اثر قبول نہ کیا۔

برطانوی کابینہ نے مجوزہ مسودہ اعلان پر ابھی غور وخوض شروع بھی نہیں کیا تھا کہ اس کے اہم نکات کانگرس کے پریس میں لیک ہو گئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ منصوبہ ابھی صرف نہرو اور پٹیل کو اعتماد میں لے کر دکھایا تھا۔ 3 رمئی کو کانگرس کے ترجمان اخبار ہندوستان ٹائمز نے منصوبے کے اہم نکات شائع کر دیئے اور اس میں صوبہ سرحد کے لئے مجوزہ نئے انتخابات اور پنجاب و بنگال کی تقسیم پر سخت تنقید کی۔ اخبار نے لکھا کہ ''کانگرس نے وائسرائے پر واضح کر دیا ہے کہ اگر سرحد

وزارت کو توڑا گیا اور وہاں نئے انتخابات کرائے گئے تو کانگرس برطانوی حکومت کے بارے میں اپنا رویہ تبدیل کر دے گی۔" اس روز نہرو نے بھی اپنے ایک خط میں ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ "اگر صوبہ سرحد میں انتخابات کرائے گئے اور وزارت توڑ کر دفعہ 93 نافذ کی گئی تو حالات بہت سنگین ہو جائیں گے۔" چنانچہ اسی روز ماؤنٹ بیٹن نے اپنی سٹاف میٹنگ میں کانگرس کے دباؤ کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا گیا کہ صوبہ سرحد میں نہ تو خان وزارت برخاست کی جائے اور نہ ہی اسمبلی کے انتخابات نئے سرے سے کروائے جائیں بلکہ فقط صوبے کے پاکستان یا ہندوستان میں شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کروایا جائے۔ اگرچہ 2 رمئی کو لارڈ اسمے کو لندن کے لئے رخصت کرتے وقت ماؤنٹ بیٹن نے اس قسم کا تاثر دے دیا تھا، لیکن 3 رمئی کو ماؤنٹ بیٹن نے اسمے کو بذریعہ تار لندن یہ ہدایت ارسال کی کہ زیر غور منصوبہ میں سرحد کے نئے انتخابات کی تجویز میں ترمیم کر کے ریفرنڈم کی تجویز شامل کر دی جائے۔ 4 رمئی کو اسی مضمون کا ایک اور تار اسمے کو ارسال کیا گیا جس میں زور اس بات پر دیا گیا تھا کہ خان وزارت کو برقرار رکھتے ہوئے ریفرنڈم کرایا جائے گا۔ ریفرنڈم کا انعقاد براہ راست وائسرائے کی زیر نگرانی ہوگا جس کے لئے وہ خصوصی طور پر افسروں کو تعینات کرے گا اور وزارت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اس نے یہ توقع بھی ظاہر کی کہ ریفرنڈم منعقد کرانے کے بارے میں مجھے کانگرس کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔[8]

4 رمئی کو ماؤنٹ بیٹن نے جناح اور لیاقت کے ساتھ ملاقات کی اور انہیں مجوزہ منصوبے میں سرحد سے متعلق تجویز کردہ ترمیم کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس نے صوبے میں جاری مسلم لیگ کی ایجی ٹیشن کو بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ جناح نے موقف اختیار کیا کہ اگر وائسرائے برطانوی حکومت سے منظوری لے کر ریفرنڈم کے انعقاد کے بارے میں ایک اعلان جاری کر دے تو میں سرحد میں مسلم لیگ کی ایجی ٹیشن بند کرا دوں گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو انتخاب کے بجائے ریفرنڈم پر بھی رضامند اور اس کے نتائج کے بارے میں پرامید دیکھ کر جناح کو سرحد کے بارے میں خائف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ "وہاں موجودہ حکومت کو قبائل کے خاموش کرنے کے لئے ساڑھے تین کروڑ روپے سالانہ ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے مسلم لیگ والے اچھی طرح سوچ لیں کہ آیا وہ واقعی صوبہ سرحد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟" جناح نے جواب دیا کہ "ایک بار وائسرائے کی جانب سے ریفرنڈم کے بارے میں اعلان جاری ہو جائے تو پھر میں بذات خود

ان قبائل کے پاس جاؤں گا اور مجھے امید ہے کہ مجھے ان کو کچھ بھی ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ اور بفرض محال ادا کرنا ہی پڑا تو یہ ساڑھے تین کروڑ کی رقم گھٹ کر بہت تھوڑی رہ جائے گی۔ میرا ان کے ساتھ کوئی معاملہ طے پا جائے گا۔''[9] اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن آمادہ ہو گیا کہ وہ اس ضمن میں علیحدہ مسودہ اعلان تیار کر کے برطانوی حکومت کو بھیج دے گا اسی روز اس نے اسمے کے نام لندن تار بھیج کر اسے جناح اور لیاقت کے ساتھ اپنی بات چیت سے آگاہ کرنے کے علاوہ سرحد کے ریفرنڈم سے متعلق اعلان کے مسودے کی تیاری سے بھی مطلع کر دیا۔

7 رمئی کو برطانوی کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کا اجلاس وزیر اعظم اٹیلی (Attlee) کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں صوبہ سرحد کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کی تجویز کردہ ترمیم کو منظور کر لیا گیا اور طے پایا کہ اسے مطلع کر دیا جائے کہ ''برطانوی حکومت کو صوبہ سرحد میں ریفرنڈم منعقد کرانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' چنانچہ 8 رمئی کو ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو اپنی سٹاف میٹنگ میں شریک کیا اور سرحد میں ریفرنڈم کے بارے میں اپنے موقف سے آگاہ کیا۔ نہرو نے کہا کہ ''اگر صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کروایا گیا تو ہندوستان میں سینکڑوں مقامات سے ریفرنڈم کے مطالبات اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ''اگر پنجاب اور بنگال کے دو الگ الگ حصوں کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ پاکستان میں شامل ہوں یا ہندوستان میں تو پھر یہ اختیار سرحد کو بھی دیا جا سکتا ہے۔'' یاد رہے کہ مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کو یہ اختیار کانگرس کے مطالبے پر دیا گیا تھا اس لئے وہ اسی قسم کا اختیار سرحد کو دیئے جانے کے منکر نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم نہرو نے سرحد کو ریفرنڈم کے حق سے محروم کرنے کے لئے ہر ممکن دلائل دیئے۔ ایک دلیل یہ دی کہ ''گزشتہ دو ماہ میں دو لاکھ ہندو اور سکھ سرحد سے نقل مکانی کر کے شمالی پنجاب میں آ چکے ہیں۔ اس سے صوبے کی آبادی پر فرق پڑا ہے۔ یہ نقل مکانی روزانہ جاری ہے۔ سرحد کی معیشت کا دارومدار ہندوؤں اور سکھوں پر ہے ان کے بغیر وہاں کا معاشی ڈھانچہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔''[10]

یہاں نہرو کا یہ کھلا اعتراف کہ 94 فیصد مسلم آبادی والے صوبہ سرحد پر تمام تر معاشی غلبہ ہندوؤں اور سکھوں کو حاصل تھا اور اس کا یہ موقف کہ ناانصافی پر مبنی اس معاشی ڈھانچہ کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے، تاریخ کے ایک سنجیدہ طالب علم کو یہ سمجھانے کے لئے کافی ہے کہ وہاں غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل عام کیوں ہوا اور وہاں ہندو۔ مسلم تضاد میں اس قدر شدت کیوں پیدا

ہوئی؟ بنی نوع انسان کی تاریخ میں مادی محرکات ہی فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ برصغیر کا ہندو۔ مسلم تضاد اب ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔

کافی بحث و تکرار کے بعد بالآخر نہرو نے سرحد میں ریفرنڈم کرائے جانے کے ساتھ اتفاق کر لیا۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن نے یہ اختیار نہرو کو دے دیا کہ وہ خود اس اعلان کا مسودہ تیار کر کے دے جو برطانوی حکومت کی جانب سے سرحد کے ریفرنڈم کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ چنانچہ میٹنگ کے بعد نہرو نے وائسرائے کے سیاسی مشیر وی۔ پی۔ مینن کو یہ مسودہ خود ڈکٹیٹ کروایا۔ اس میں لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بعد کہا گیا کہ ''اگر پنجاب نے کلی یا جزوی طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ یونین آف انڈیا میں شامل نہیں ہو گا تو پھر صوبہ سرحد کے لئے ایک مخصوص نوعیت کی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ ان حالات میں ضروری ہو گا کہ صوبہ سرحد کے عوام یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ یونین آف انڈیا میں شامل ہوں گے یا نہیں۔ اس ہنگامی صورت حال میں اس سوال پر صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا انعقاد تجویز کیا جاتا ہے۔''[11]

ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کا ڈکٹیٹ کرایا ہوا مسودہ لفظ بہ لفظ بذریعہ تار اسی روز لندن ارسال کر دیا اور اسے کو ایک علیحدہ تار میں یہ بھی مطلع کر دیا کہ ''نہرو اگرچہ ریفرنڈم سے اتفاق کرتا ہے مگر دہلی میں منعقدہ ایک حالیہ میٹنگ کے بعد جس میں عبدالغفار خاں اور دوسرے کانگرسی رہنما بشمول گاندھی کے شریک ہوئے تھے، وہ خاصا پریشان نظر آتا ہے۔ ریفرنڈم کی صورت میں صوبائی کانگرسی حکومت گڑبڑ پھیلانے کا ارادہ رکھتی ہے جسے کانگرس ہائی کمان کی اشیرباد بھی حاصل ہے۔ ادھر سرحد کے گورنر اولف کیرو کا کہنا ہے کہ اگر اعلان میں سرحد میں انتخاب یا ریفرنڈم کا ذکر نہ ہوا تو پورے صوبہ میں صحیح معنوں میں ہنگاموں کی آگ بھڑک اٹھے گی۔''[12] تاہم اس وقت کانگرسی رہنماؤں میں سے نہرو کا ریفرنڈم کے بارے میں رضامند یا نیم رضامند اور مسودہ اعلان ڈکٹیٹ کروانا اس سلسلے میں خاصا مددگار ثابت ہوا اور بالآخر ریفرنڈم کا فیصلہ ہو گیا۔

ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے انتقال اقتدار کا پہلا منصوبہ جو 10 مئی کو برطانوی حکومت نے منظور کر کے بھیجا تھا، اس میں ہر صوبے کو تین چوائس دیئے گئے تھے۔ یہ کہ ہندوستان میں شامل ہو یا پاکستان میں شامل ہو یا خود ایک آزاد ریاست بن جائے۔ اس پر کانگرس نے شدید ردعمل ظاہر کیا اور نہرو نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اس سے ہندوستان بلقان کی ریاستوں کی

طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا اور یہاں بہت سارے السٹر (شمالی آئرلینڈ) پیدا ہوجائیں گے۔ کانگرس کا مطالبہ تھا کہ صوبے کو آزاد ریاست بن جانے کا جو تیسرا چوائس دیا گیا تھا اسے ختم کر دیا جائے۔[13] اس کی بڑی وجہ دراصل یہ تھی کہ متحدہ بنگال کے قریباً تمام رہنما اسے ایک علیحدہ ریاست بنا کر رکھنے پر متفق ہو چکے تھے۔ جناح کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں سہروردی کو پورا اختیار دے دیا تھا لیکن کانگرس ہائی کمان اس رائے سے متفق نہیں تھی۔ کانگرس کے شدید ردعمل کی وجہ سے یہ منصوبہ ترمیم کے لئے واپس لندن بھیجا گیا اور خود ماؤنٹ بیٹن کو لندن جا کر برطانوی کابینہ کو اس ترمیم پر قائل کرنا پڑا اور جاری ہونے والے 3 رجون کے اعلان میں صوبوں کے لئے آزاد رہنے کا تیسرا چوائس ختم کر دیا گیا۔

جب پہلا منصوبہ منظوری کے لئے لندن بھیجا گیا تو صوبہ سرحد میں خونریز فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے اور ماؤنٹ بیٹن وہاں کا دورہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس صوبے کے مستقبل کا فیصلہ عوامی رائے عامہ کا ازسرنو تعین کرنے کے بعد کیا جائے تب ہی یہاں امن قائم ہوسکتا ہے جس کے لئے نئے عام انتخابات کرائے جائیں گے یا ریفرینڈم کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ عام انتخابات کا مطالبہ منوانے کے لئے صوبائی مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک چلائی ہوئی تھی۔ عام انتخابات کے لئے ضروری تھا کہ صوبائی اسمبلی جس میں کانگرس کی سادہ اکثریت تھی اور جس کے بل بوتے پر وہاں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت قائم تھی، کو توڑ کر وہاں گورنر راج نافذ کر دیا جاتا لیکن یہ بات کانگرس کو منظور نہیں تھی۔ تاہم اسمبلی اور وزارت کو چھیڑے بغیر فقط ریفرنڈم کرانے پر کانگرس کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ ریفرنڈم کا راستہ اختیار کیا گیا اور 10 رمئی کے منصوبے میں صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کی تجویز شامل کر دی گئی جبکہ شروع میں جب یہ منصوبہ تیار کر کے لندن بھیجا جا رہا تھا تو اس میں سرحد کے لئے عام انتخابات ہی تجویز کئے گئے تھے۔

پچھلے چند ماہ میں جب یہ واضح ہو گیا کہ وزارتی مشن منصوبہ مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے اور برصغیر کی تقسیم ہونے جا رہی ہے تو صوبہ سرحد میں جہاں آبادی کی بھاری اکثریت مسلمان تھی، یہ عمومی رجحان پایا جاتا تھا کہ تقسیم کی صورت میں ہندوستان میں شمولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ہندو۔ مسلم تضاد کو مزید شدید کر دیا تھا اور متذکرہ رجحان کو

تقویت ملی تھی۔ اس لہر کا اثر تھا کہ صوبائی کانگرس کے رہنما خان برادران کے لئے بھی اب ہندوستان میں شمولیت کا نعرہ لگانا لائق تحسین امر نہیں رہا تھا۔ ان حالات میں انہوں نے پاکستان سکیم کو سبوتاژ کرنے کی خاطر ایک دوسرا نعرہ بلند کرنا شروع کیا جو انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے پختون نیشنلزم کو ہوا دے کر آزاد پختونستان کے قیام کا نعرہ بلند کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ریفرنڈم میں اسے تیسرے چوائس کے طور پر شامل کیا جائے۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے جب بھی پختون یا پٹھان نیشنلزم کی بات ہوتی تھی تو یہ حضرات انڈین نیشنلزم کے نام پر اسے رد کر دیا کرتے تھے۔

سرحد کا گورنر اولف کیرو انڈین سول سروس کے ان انگریز بابوؤں میں سے تھا جو کسی ایک علاقے کے مطالعے پر تعین کئے جاتے تھے، وہ ان علاقے کی تاریخ، ثقافت، معیشت اور سیاست کا گہرا مطالعہ کرتے، لوگوں میں گھل مل کر ان کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور ان سے معاملہ بندی کے اصول دریافت کرتے تھے۔ پھر اس ساری تحقیق کو مربوط کر کے ایک رپورٹ یا کتاب کی شکل میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ اس تمام مشق کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ سامراج کے مختلف پالیسی ساز ادارے اس علاقے میں سامراجی مفادات کے تحفظ اور استحکام کی خاطر مناسب منصوبہ بندی کر سکیں اور جو انگریز سول یا فوجی افسر اس علاقے میں تعینات ہو کر آئیں وہ اس رپورٹ یا کتاب کا مطالعہ کر کے اس علاقے کی اونچ نیچ سے واقف ہو سکیں۔ اولف کیرو کی زیادہ تر ملازمت محکمہ خارجہ میں گزری اور شمال مغربی سرحد اس کے مطالعے اور فرائض کا خاص موضوع رہی۔ اس نے پٹھانوں کے بارے میں خصوصی مطالعہ و مشاہدہ کیا اور ایک کتاب ''دی پٹھانز'' (The Pathans) تالیف کی۔

اس نے چند ماہ پیشتر خان برادران کو تجویز دی تھی کہ آپ پٹھان نیشنلزم کی بنیاد پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں لیکن اس وقت انہوں نے انڈین نیشنلزم کے علمبردار کی حیثیت سے اسے رد کر دیا تھا مگر جب 10 مئی کو برطانوی حکومت نے انتقال اقتدار کا پہلا منصوبہ منظور کر کے بھیجا اور اس میں صوبہ سرحد کے لئے ریفرنڈم بھی منظور کر دیا تو خان برادران کی جانب سے یکا یک پٹھان وطنیت کی مہم کا آغاز کر دیا گیا۔

22 مئی کو اولف کیرو نے قائم مقام وائسرائے کولول (Colville) کے نام اپنے خط

میں اس بارے میں لکھا کہ ''سیاست کے میدان میں ایک دلچسپ مقامی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ میری وزارت (یعنی ڈاکٹر صاحب وزارت) اور خان عبدالغفار خاں نے اس نظریے کا پرچار شروع کر دیا ہے جس کو اختیار کرنے کے لئے چند ماہ پیشتر میں نے ہی انہیں مشورہ دیا تھا۔ یہ نظریہ تھا کہ ایک پٹھان قومی صوبہ تشکیل دیا جائے جس میں ممکن ہو تو مخلوط حکومت قائم کی جائے پھر جس طرح اس صوبے کو اپنا فائدہ محسوس ہو اس کے مطابق یہ خود دوسروں کے ساتھ معاہدے کر سکتا ہے۔ جب میں نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا تو تب وہ یہ سن کر ہی سیخ پا ہو گئے تھے۔ اس نظریے میں بڑا وزن ہے۔ یہ نعرہ زیادہ تعمیری ہے بہ نسبت اس نعرے کے کہ ''اسلام خطرے میں ہے۔'' خان برادران کے رویے میں تبدیلی غالباً کافی دیر بعد آئی ہے۔ میری رائے میں یہ بات طاقت کی علامت ہے نہ کہ کمزوری کی کہ پٹھانستان مالی طور پر یا دوسرے معاملوں میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اصل کمزوری یہ ہے کہ پٹھان اب تک آپس میں اس قدر منقسم رہے ہیں کہ وہ اپنی کوئی مستحکم ریاست قائم نہیں کر سکے۔ جہاں کہیں بھی انہوں نے حکومت کی ہے وہاں انہوں نے ایک اجنبی آبادی پر فاتح کی حیثیت سے حکومت کی ہے۔ وہ خود اپنی پوری تاریخ کے دوران باہمی جھگڑوں اور انتشار کا شکار رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم یہاں آئے اور ہم نے انہیں متحد کیا۔ (افغانستان ہرگز ایک حقیقی پٹھان ریاست نہیں ہے)۔''[14] گویا اولف کیرو ڈیورنڈ لائن کے دونوں پار آباد پٹھان قومیت کی ایک علیحدہ ریاست بنانے کا خواہاں تھا اور پٹھانستان کے قومی نعرے کو ''اسلام خطرے میں'' کے نعرے کی نسبت زیادہ تعمیری قرار دیتا تھا۔

ایلن کیمبل جانسن (Alan Campbell Johnson) لکھتا ہے کہ ''جب ماؤنٹ بیٹن نے پشاور پہنچ کر وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب اور اس کے وزراء سے ملاقات کے دوران مسلم لیگ ہائی کمان کے ''جنرل کنٹرول'' کے بارے میں استفسار کیا تھا تو جواب ملا تھا کہ مقامی مسلم لیگ نے بہت فساد برپا کر رکھا ہے اور اس نے چارج سنبھال لیا ہے۔ گزشتہ انتخابات میں پاکستان کے مسئلہ پر مسلم لیگ کو قطعی طور پر شکست ہوئی تھی اور یہاں تک کہ مسلم لیگ کا صف اول کا لیڈر عبدالرب نشتر بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس وقت کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی پالیسی کی فتح ہوئی تھی لیکن اب اس نعرے کے لئے کوئی دلکشی نہیں رہی تھی۔ اب بہت سے لوگ جنہوں نے ابتداً کانگرس کی حمایت کی تھی، مستقبل پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ

وہ ہندو کے کنٹرول میں چلے جائیں گے ۔ جب ڈاکٹر خان صاحب نے پٹھانستان کا ذکر کیا تو بحث قدرے بے ربط اور دھماکہ خیز ہوگئی۔ کچھ عرصہ سے گاندھی اس تصور میں سرگرمی سے دلچسپی لے رہا تھا اور اب وہ اس کے فوائد پر پہلے سے زیادہ پرجوش طریقے سے زور دے رہا تھا۔ اگر یہ تصور قبول کرلیا جائے تو اس سے ایک نئی فرنٹیئر نیشنلزم پیدا ہوجائے گی جو صوبہ کی پاکستان کے ساتھ فرقہ وارانہ اور سیاسی یکجہتی کے منافی ہوگی۔ ڈاکٹر خان صاحب کی دھمکی یہ تھی کہ اگر آپ نے پٹھان قوم کو تباہ کردیا تو اس کے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔"[15] کیمبل جانسن کی اس ڈائری سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پٹھانستان کے تصور میں اولف کیرو کے علاوہ گاندھی بھی دلچسپی لے رہا تھا اور اس نے 2 اپریل کو پٹیل کے اصرار پر تقسیم ہند کی تجویز پر رضامند ہونے کے بعد اس کا زبردست طریقے سے پرچار شروع کردیا تھا اور وہ اس مقصد کے لئے ماؤنٹ بیٹن سے کئی بار بات چیت کرچکا تھا لہٰذا چودھری محمد علی کا یہ الزام بے بنیاد نہیں کہ آزاد سرحدی مملکت کا نعرہ خان برادران کو گاندھی نے دیا تھا۔[16]

چودھری محمد علی لکھتا ہے کہ "اس مرحلے پر گاندھی نے جس شخص کو بالخصوص نمایاں کرنے کی کوشش کی وہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کا سرجوش لیڈر عبدالغفار خان تھا۔ گاندھی اسے پیار سے بادشاہ خان کہتا تھا۔ ابوالکلام آزاد، جو ایک سال پہلے تک بطور صدر کانگرس بہت مشتہر کیا جاتا تھا، اب گوشہ گمنامی میں تھا اور شہرت کی سٹیج پر عبدالغفار خان کو سب سے اہم "قوم پرست" مسلمان کے طور پر فائز کردیا گیا تھا۔ گاندھی کا مقصد شمال مغربی سرحدی صوبہ کو پاکستان سے علیحدہ رکھنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس صوبے میں کانگرس وزارت کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں اور مسلم لیگ روز افزوں تقویت حاصل کررہی ہے۔ اگرچہ سرحدی عوام کی اکثریت پاکستان کی حمایت کررہی تھی لیکن وہاں کی صوبائی وزارت ہندوستان کے حق میں تھی چنانچہ لارڈ راسے کے بقول وہاں ایسی "دوغلی" صورت حال تھی جو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ اگرچہ کانگرس کے لیڈر شمال مغربی سرحدی صوبہ پر انڈین یونین کا حق جتاتے تھے اور اگرچہ اس کے صوبائی نمائندے آئین ساز اسمبلی میں شرکت کرتے تھے لیکن یہ بات ناگزیر معلوم ہونے لگی تھی کہ اس صوبے کے لوگوں سے استصواب کیا جائے گا۔ اس صوبے کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب 92 فیصد تھا اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سیدھے مقابلے میں عوام نے پاکستان کی ہی حمایت کرنی تھی۔ اس لئے

گاندھی نے پختونستان یا آزاد شمال مغربی سرحدی صوبے کا شوشہ چھوڑ دیا   بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ ہندوستان کی وحدت کا دیوتا جو یہ کہا کرتا تھا کہ مطالبہ پاکستان بھارت ماتا کو زندہ پھاڑنے کے مترادف ہے اب مزید ایک اور آزاد مملکت کے قیام کی وکالت کرنے لگا تھا لیکن یہ ایک بہت بڑی جنگی حکمت عملی کی چال تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے علاقوں کو کم کیا جائے اور اس کے گرد گھیرا ڈالا جائے۔ بعد میں جب جموں وکشمیر کے بارے میں کانگرس کے عزائم بروئے کار آجائیں گے تو پھر شمال مغربی سرحدی صوبہ کو بھی، جو کشمیر سے متصل ہے انڈین یونین میں دوبارہ شامل کرلیا جائے گا۔ وقتی طور پر گاندھی کی ساری توجہ پختونستان کی سکیم اور بادشاہ خان پر مرکوز تھی جس کے بارے میں وہ اپنی روزانہ پرارتھنا کے اجتماعات میں بڑے سوز و گداز سے ذکر کیا کرتا تھا۔ گاندھی کے سوانح نگار پیارے لال نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ گاندھی کس قسم کے جذبات کی آبیاری کررہا تھا۔ 6رمئی کو عبدالغفار خان نے بڑے حسرت و اندوہ کے ساتھ کہا کہ بہت جلد ہم ہندوستان میں اجنبی بن جائیں گے۔ آزادی کے لئے ہماری طویل جدوجہد کا خاتمہ پاکستان کی محکومی کی صورت میں نکلے گا۔ ہم باپو (گاندھی) سے دور ہو جائیں گے۔ بھارت سے دور ہوں گے اور آپ سب سے دور ہوں گے۔ کون جانتا ہے کہ مستقبل میں ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے؟ جب گاندھی نے یہ باتیں سنیں تو اس نے کہا بادشاہ خان تو سچ مچ فقیر ہے۔ آزادی تو آئے گی لیکن بہادر پٹھان اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے۔ وہ بہت ہی سنگین صورت حال سے دوچار ہیں لیکن بادشاہ خان تو مرد خدا ہے۔''[17] گاندھی کے ان الفاظ کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ ''بادشاہ خان'' کو پاکستان کے خلاف بغاوت کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ سرحد کے ''مرد خدا'' کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ بہادر پٹھانوں کو ہندوؤں کے غلبہ کے تحت ہندوستان میں آزادی کی نعمت نصیب ہوگی لیکن وہ مسلم پاکستان میں آزادی سے محروم ہوجائیں گے۔ وہ اس کے ساتھ ہی ساتھ پوری کوشش کررہا تھا کہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں ریفرنڈم نہ ہو۔ اس نے 8رمئی کو ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ ''اس مرحلے پر سرحد (یا کسی اور صوبے میں) ریفرنڈم ایک بہت ہی خطرناک بات ہوگی۔ جو بھی مواد آپ کے پاس ہے آپ کو اسی سے نمٹنا ہوگا۔ بہرصورت ڈاکٹر خان صاحب کو نظر انداز کر کے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے اور نہ کی جاسکتی ہے۔''

2رجون 1947ء کو جب کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے برصغیر کی تقسیم کے منصوبے پر غور

کیا تو گاندھی نے تقسیم کی حمایت کی کیونکہ سردار پٹیل اسے اپریل کے اوائل میں ہی قائل کر چکا تھا کہ وقتی طور پر برصغیر کی تقسیم کی تجویز کو منظور کر لینا چاہیے۔ پاکستان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ جو علاقہ الگ ہوگا وہ بہت جلد واپس بھارت ماتا کی گود میں آ جائے گا۔ ابوالکلام آزاد لکھتا ہے کہ ''چونکہ مجھے گاندھی کے اس نئے انداز فکر کا پہلے سے علم تھا اسے لئے میرے لئے یہ بات کوئی حیرت انگیز نہیں تھی۔ البتہ عبدالغفار خان پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ کئی منٹ تک ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ پھر اس نے ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی اور کمیٹی کو یاد دلایا کہ اس نے ہمیشہ کانگرس کی حمایت کی ہے۔ اگر اب کانگرس نے اس سے بے وفائی کی تو سرحد میں اس کا بہت خوفناک ردعمل ہوگا۔ اس کے دشمن اس پر ہنسیں گے اور اس کے دوست بھی یہ کہیں گے کہ جب تک کانگرس کو سرحد کی ضرورت تھی وہ خدائی خدمت گاروں کی حمایت کرتی تھی لیکن اب جبکہ کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ سودا بازی کر لی ہے تو اس نے سرحد اور اس کے لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر تقسیم کی مخالفت بھی ترک کر دی ہے۔ خان عبدالغفار خان نے بار بار کہا کہ اگر اب کانگرس نے خدائی خدمت گاروں کو بھیڑیوں کے سامنے پھینک دیا تو وہ اس فعل کو غداری تصور کریں گے اس موقع پر عبدالغفار خان کا بھائی ڈاکٹر خان صاحب بھی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں شریک ہو گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قبل ازیں اسے بتایا تھا کہ وہ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے ذریعے یہ معلوم کرے گا کہ وہاں کے عوام کو ہندوستان میں شامل ہونا چاہیے یا پاکستان میں۔ چونکہ ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ تھا اور اس بنا پر اکثریت کی حمایت کا دعویدار تھا اس لئے وہ ماؤنٹ بیٹن کی اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اس نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر استصواب ہونا ہے تو سرحد کے پٹھانوں کو اپنی ریاست پختونستان کے حق میں رائے دینے کا بھی حق ملنا چاہیے۔'' ابوالکلام آزاد مزید لکھتا ہے کہ ''ان دنوں حقیقت یہ تھی کہ خان برادران سرحد میں اتنے طاقتور نہیں تھے جتنا کہ کانگرس کا خیال تھا۔ تقسیم کی ایجی ٹیشن شروع ہونے کے بعد ان کا اثر ورسوخ کم ہو گیا تھا۔ اب جبکہ پاکستان سامنے نظر آ رہا تھا اور مسلم اکثریت کے صوبوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں ایک ریاست کی تشکیل کا موقع دیا جائے گا تو سرحد میں بھی ایک جذباتی لہر دوڑ گئی تھی۔ برطانوی افسروں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی پاکستان کی تحریک کو تقویت پہنچی تھی۔ یہ کھلم کھلا پاکستان کی حمایت کرتے تھے اور انہوں نے سرحد کے قبائلی سرداروں کی اکثریت کو

ترغیب دی تھی کہ وہ مسلم لیگ کا ساتھ دیں۔ ڈاکٹر خان صاحب نے پختونستان کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ صرف اسی صورت میں اس کی لیڈری قائم رہنے کا امکان ہوسکتا تھا۔ ایسی صورت میں بہت سے پٹھان اپنی ایک چھوٹی سی ریاست کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ انہیں پنجاب کے غلبہ کا خدشہ تھا۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن کسی نئے مطالبے پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی سکیم کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا اس لئے پختونستان کے سوال پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ہوئی تھی۔،،[18]

ابوالکلام آزاد کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ اس مسئلہ پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قبل ازیں گاندھی اور نہرو اس سلسلے میں کئی مرتبہ ماؤنٹ بیٹن سے تفصیلی بات چیت کر چکے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن نے 3 رجون کو جاری ہونے والے اعلان کی نقلیں 2 رجون کو کانگرس اور لیگ کے رہنماؤں کو مہیا کر دی تھیں تاکہ وہ اس کے اجراء سے پہلے ہی اس پر اپنے ردعمل سے آگاہ کر دیں۔ چنانچہ اس روز کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں اس پر غور کیا گیا اور رات کو کانگرس کے صدر کی حیثیت سے اچاریہ کرپلانی کی جانب سے ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط بھیجا گیا جس میں مجوزہ منصوبے کی منظوری تو دے دی گئی لیکن ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ ''صوبہ سرحد میں یہ مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے کہ پہلے صوبے کو آزاد کر دیا جائے۔ بعد میں وہ بقیہ ہند کے ساتھ شمولیت کے بارے میں فیصلہ کرے۔ اس لئے ریفرنڈم میں اس کے لئے بھی شق شامل کی جائے'' لیکن ماؤنٹ بیٹن جو برصغیر کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے سخت خلاف تھا اور نہرو دونوں اس بارے میں متفق ہو گئے تھے کہ 30 لاکھ آبادی کا یہ صوبہ علیحدہ ریاست کے طور پر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ اسے لامحالہ ہندوستان یا پاکستان کے شامل ہونا ہوگا۔ چنانچہ اگر بعد میں یہی ہونا ہے تو کیوں نہ اب ہی اس سوال کا فیصلہ ہو جائے کہ اسے کس کے ساتھ شامل ہونا ہے؟ اس بارے میں 5 رجون کو ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ ملاقات کے دوران ماؤنٹ بیٹن نے اسے اپنے اور نہرو کے خیالات سے آگاہ کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اسے یہ بھی بتایا کہ پہلے مجوزہ منصوبے میں صوبوں کو الگ سے آزادی کی راہ اختیار کرنے کا تیسرا چوائس دیا گیا تھا جسے کانگرس کی ہائی کمان کے پرزور اصرار پر ختم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب یہ چوائس فقط سرحد کو نہیں دیا جا سکتا۔ بقول ماؤنٹ بیٹن ''یہ بات کچھ ڈاکٹر خان کی سمجھ میں آئی لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ صوبہ سرحد کبھی بھی پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔'' ماؤنٹ بیٹن نے اسے کہا کہ '' آپ ہندوستان میں شامل ہو سکتے ہیں۔ آپ اس

بات کو خاطر میں نہ لائیں کہ صوبہ سرحد اور ہندوستان کے درمیان پاکستان کا صوبہ مغربی پنجاب حائل ہوگا۔ آخر اسی طرح کی صورت حال مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان بھی تو ہوگی۔"[19]

ماؤنٹ بیٹن اور ڈاکٹر خان صاحب کی متذکرہ گفتگو کا پس منظر یہ تھا کہ جب 3 رجون کو وائسرائے سے سیاسی لیڈروں کی کانفرنس کے موقع پر کانگرس کا تحریری جواب کانفرنس کے ممبروں کو مہیا کیا گیا تو جناح نے صرف ایک سوال پوچھا کہ "کانگرس ہندوستان اور پاکستان سے الگ ہونے کا موقع صرف صوبہ سرحد کو دینا چاہتی ہے یا ہندوستان کے باقی صوبوں کو بھی اس قسم کا موقع دینے پر راضی ہے۔" ماؤنٹ بیٹن نے جلدی سے کہا "میں کانگرسی لیڈروں کی توجہ اس بات کی جانب دلا چکا ہوں۔ انہوں نے یہ تجویز ترک کر دی ہے۔[20] اس پر جناح کا تبصرہ یہ تھا کہ "ہندوؤں کی مشکل یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ایک روپے کے عوض سترہ آنے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" ماؤنٹ بیٹن دراصل اس کانفرنس سے پہلے ہی اس سلسلے میں نہرو سے بات کر چکا تھا۔ اس نے اس کانفرنس کے بارے میں حکومت برطانیہ کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں لکھا تھا کہ "میں نے نہرو کو یاد دلایا کہ میں نے پاکستان، ہندوستان اور آزادی کے حق میں ووٹ دینے کی ابتدائی تجویز اس کے کہنے پر ترک کی تھی۔ اب اس تجویز کو اس مرحلہ پر کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ نہرو نے بڑی صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ صوبہ سرحد خود اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا لیکن یہ بات مجھ پر بالکل واضح ہو گئی کہ یہ تجویز محض ڈاکٹر خان صاحب کی پارٹی پر سے ریفرنڈم کے دوران کانگرس سے وابستگی کا دھبہ دھونے کے لئے پیش کی گئی ہے کیونکہ نہرو نے ذکر کیا تھا کہ "ڈاکٹر خان صاحب بعد میں انڈین یونین میں شامل ہونے کا خواہاں ہے۔" میں نے نہرو کو بتایا کہ "میں اس مسئلہ کو کانفرنس میں اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور اس نے میری یہ رولنگ قبول کر لی۔"[21]

تاہم کانگرسی لیڈروں نے پاکستان کے خلاف یہ شر انگیزی عملی طور پر ترک نہ کی۔ ابوالکلام آزاد کا بیان ہے کہ "خان برادران نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد پشاور واپس جا کر اپنے دوستوں سے مشورہ کیا اور پھر سرحد کی آزادی کا نعرہ لگا دیا۔ قبل ازیں کانگرس ورکنگ کمیٹی نے فرنٹیئر کانگرس کے اس فیصلے کی توثیق کر دی تھی کہ خان عبدالغفار خان صوبہ سرحد کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ہر وہ اقدام کر سکتے ہیں جو وہ اس مقصد کے لئے ضروری سمجھیں۔[22] کانگرسی لیڈروں کی اس تجویز کی بنیاد اس امید پر تھی کہ آزاد پختونستان بالآخر

ہندوستان میں شامل ہو جائے گا۔ جب گاندھی کو برطانیہ سے آزاد پختونستان کی تجویز منظور کرانے میں ناکامی ہوئی تو اس نے تشدد کے خطرے کی بنا پر ریفرنڈم کو وقتی طور پر ٹالنے کی کوشش کی تاکہ پاکستان کے حق میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہونے پائے۔ اس نے 7 رجون کو نہرو کے نام ایک خط میں الزام لگایا کہ ریفرنڈم کے بارے میں موجودہ صورتحال کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ نہرو کی جانب سے اس خط کا جواب یہ تھا کہ حکومت برطانیہ اور وائسرائے قطعی طور پر ریفرنڈم کی ذمہ داری لے چکے ہیں۔ ہم میں سے بھی بعض اس ذمہ داری کو کم وبیش قبول کر چکے ہیں اس لئے ریفرنڈم کا سوال ایک طے شدہ معاملہ معلوم ہوتا ہے اور یہ واضح طور پر نظر نہیں آتا کہ جو ذمہ داری ہم قبول کر چکے ہیں۔ منصوبے میں کوئی تبدیلی بہت بڑے پیمانے پر تصادم کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ نہرو کا مطلب یہ تھا کہ اب ریفرنڈم کے فیصلے سے گلو خلاصی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس نے گاندھی کی تسلی کے لئے اپنے جواب میں یہ وضاحت کر دی کہ ریفرنڈم ایسے برطانوی فوجی افسروں کی زیر نگرانی ہوگا جو باہر سے منگوائے جائیں گے۔ صوبائی حکومت کو ان انتظامات میں پورا عمل دخل ہوگا اور کسی بڑے متشددانہ تصادم کا کوئی خاص امکان نہیں ہے۔[23] جون کو عبدالغفار خان نے گاندھی کے نام ایک خط میں بتایا کہ ''آج شام صوبہ سرحد کی کانگرس کمیٹی، کانگرس پارلیمانی پارٹی اور خدائی خدمت گار کے سالاروں کا مشترکہ اجلاس ہوا جو چار گھنٹے تک جاری رہا۔ صوبہ کے سارے علاقوں کے نمائندوں نے اس اجلاس میں حصہ لیا اور سب کی رائے یہی ہے کہ ہمیں ریفرنڈم میں حصہ لینا نہیں چاہیے۔ ان سب کی خواہش ہے کہ ریفرنڈم محض پاکستان اور آزاد پٹھان ریاست کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ہم اپنے فیصلے پر آپ سے مشورہ کرنے کے بعد عمل کریں گے۔ آپ کو اس نازک موقع پر ہماری رہنمائی کرنا ہی پڑے گی۔''[24]

باب:5

سرحدی گاندھی کا پختونستان اور ریفرنڈم

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی جانب سے برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کی منظوری کے چار دن بعد یعنی 18 رجون کو خان عبدالغفار خان نے گاندھی کی تجویز کے مطابق مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ سرحد کا ''بادشاہ خان'' اور ''مردخدا'' ذہنی طور پر پاکستان کے تصور کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ پیارے لال کے بیان کے مطابق اس نے جناح کے سامنے جو شرائط پیش کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ''اگر پاکستان نے آزادی کے بعد برطانیہ کے غلبہ کے تحت رہنے کا فیصلہ کیا تو پھر صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے پٹھانوں کو اس سے نکل جانے اور اپنے لئے ایک علیحدہ آزاد مملکت قائم کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔''[1] مطلب یہ تھا کہ اگر انڈین یونین برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہو تو ''بادشاہ خان'' کو اس امر پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ صوبہ سرحد اس ڈومینین کا ایک حصہ بن جائے لیکن اگر پاکستان برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہوا تو یہ بات سرحد کے ''مردخدا'' کے لئے ناقابل برداشت ہوگی اور وہ اس بنا پر صوبہ سرحد کو پاکستان کی ڈومینین سے الگ کرلے گا۔ ای۔ڈبلیو۔آر۔لمبی لکھتا ہے کہ ''عبدالغفار خان نے جناح سے ملاقات کے بعد کہا کہ میں نے جناح سے کہا ہے کہ ''صوبہ سرحد کو اس شرط پر آزادی کا اعلان کرنے کی اجازت دی جائے کہ اگر پاکستان کا آئین اس کی مرضی کے مطابق ہوا تو وہ اس میں شامل ہو جائے گا۔ میں اور میرے پیروکار پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھنے پر آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں اس سے نکل جانے کا حق دیا جائے۔'' اس نے کہا ''میں نے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا کہ صوبہ سرحد کے عوام کو ''پختونستان'' کے لئے ووٹ دینے کا حق دیا جائے تو اس کا جواب یہ تھا کہ میں ساری پارٹیوں کی

رضامندی کے بغیر ضوابط کار میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ کانگرس سرحدی عوام کو یہ موقع دینے پر آمادہ ہے لیکن جناح اسکے بالکل خلاف ہے۔" لمبی مزید لکھتا ہے کہ "جناح نے فی الحقیقت پختونستان کی مذمت میں ایک بیان جاری کیا تھا اور اس شوشہ کو شرانگیز اور جعلی قرار دیا تھا۔ تاہم اس نے یقین دلایا تھا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی جو آئین منظور کرے گی اس میں سرحد کو ایک خودمختار اکائی کی حیثیت حاصل ہوگی اور سرحدی عوام کو اپنے داخلی معاملات پر مکمل کنٹرول حاصل ہوگا۔"[2]

عبد الغفار خان قائداعظم محمد علی جناح سے اس ملاقات کے بعد صوبہ سرحد پہنچا تو 20 رجون کو بنوں میں اس کی سرخپوش تنظیم اور صوبائی کانگرس کمیٹی کا ایک جرگہ ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ کیا گیا کہ "سارے پختونوں کی ایک آزاد پٹھان ریاست قائم کی جائے گی۔ جس کے آئین کی بنیاد جمہوریت، مساوات اور معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور پر ہو گی۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ مجوزہ ریفرنڈم میں سرحد کے عوام کو یہ رائے ظاہر کرنے کا بھی حق دیا جائے کہ وہ اپنے لئے آزاد ریاست چاہتے ہیں یا نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کی 2 رجون کی قرارداد کے مطابق ریفرنڈم میں سرحد کے عوام سے دو کی بجائے تین سوال پوچھے جائیں۔ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ وہ ہندوستان کا حصہ بننا چاہتے ہیں؟ یا دونوں سے الگ آزاد مملکت کی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ 22 رجون کو خان عبدالغفار خان نے قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انگریز پٹھانوں کے دشمن ہیں اور وہ صوبہ سرحد میں پٹھانوں کی مرضی کے خلاف پاکستان کو ٹھونسنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں تاکہ وہ یہاں روس کے خلاف اپنے فوجی اڈے قائم کر سکیں۔ "لیکن جب تک صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گار موجود ہیں وہ ان کی سکیموں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"[3] اسی دن جواہر لال نہرو نے ہردوار میں پشتو بولنے والے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے خدائی خدمت گار یا سرخپوش تنظیم کی اس قرارداد کی حمایت کی۔"[4] فیض احمد فیض کی زیرادارت پاکستان ٹائمز کا اس قرارداد پر تبصرہ یہ تھا کہ "اب جبکہ سچ کی تجرباتی لیبارٹری پر سردار پٹیل اور اس کے حواریوں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ سرحدی گاندھی نے اپنے طور پر بھی کچھ تجربات کرنے شروع کر دیئے ہیں ہندو دروں جاذبیت کی اسلامی ریاست موہن داس گاندھی اور عبدالغفار گاندھی کے لئے بھی کچھ زیادہ ہی مکارانہ ہے۔ اگر خان برادران نے اسلامی نظام حکومت کے بارے

میں ابتدائی درسی کتابیں بھی دیکھی ہوتیں تو انہیں پتہ ہوتا کہ کسی ایسی اسلامی ریاست کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو صرف پٹھانوں، راجپوتوں، بنگالیوں یا دوسرے نسلی گروہوں کے لئے مخصوص ہو۔ نسلی بنیادوں پر کسی ریاست کے قیام کا تصور اسلام کے منافی ہے۔"[5]

تاہم 23 رجون کو جب پنجاب اسمبلی نے برصغیر کی تقسیم کے حق میں رائے ظاہر کی تو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے اسی دن اعلان کر دیا کہ صوبہ سرحد کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے ریفرنڈم کرایا جائے گا۔ اس پر خان عبدالغفار خان نے بھی اسی دن دہلی میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو ایک بیان کے ذریعے حکومت برطانیہ کی اس بنا پر مذمت کی کہ اس نے مجوزہ ریفرنڈم میں سرحد کے عوام کو "آزاد پٹھان ریاست" کے سوال پر رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں دیا۔ اس نے 23 رجون کو اعلان کیا کہ خدائی خدمت گار ریفرنڈم کا بائیکاٹ کریں گے۔[6] مسلم لیگ کے صدر جناح نے جواہر لال نہرو کی ہر دوار کی تقریر اور عبدالغفار خان کے اس بیان پر بہت خفگی کا اظہار کیا کہ کانگرس پارٹی اس طرح 3 رجون کے منصوبے کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ جناح کا الزام یہ تھا کہ پٹھانستان کے منصوبے کو گاندھی کی "دیوتائی اشیرباد" حاصل ہے۔[7] 26 رجون کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے ان حالات کی وضاحت کی جن کی وجہ سے سرحد کانگرس نے پٹھانستان کی ایک الگ خود مختار ریاست کا مطالبہ اور مجوزہ ریفرنڈم کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے پشاور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ ہو چکا ہے "اس لئے ہمارے لئے ہندوستان کے ساتھ رہنا ممکن نہیں رہا۔ مزید برآں چونکہ گزشتہ انتخابات میں سرحدی عوام نے پاکستان کے خلاف قطعی فیصلہ کر دیا تھا اس لئے ہمارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ ہم اپنے لئے اپنی ایک الگ خود مختار ریاست قائم کریں۔"[8] 29 رجون کو خان عبدالغفار خان نے چارسدہ کے نزدیک موضع پرونگ میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ "میں نے 18 رجون کو جناح سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ صوبہ سرحد کو آزادی کا اعلان کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اگر پاکستان کا آئین ہماری مرضی کے مطابق ہوا تو ہم اس نوزائیدہ ریاست میں شامل ہو جائیں گے۔" میں نے مزید کہا تھا کہ "اگر ہمیں اس وقت آزادی کا اعلان کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تو ہم اس شرط پر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے

پر آمادہ ہیں کہ اگر اس کا نیا آئین ہمارے موافق نہ ہوا تو ہمیں الگ ہو جانے کا حق حاصل ہوگا۔"[9] 30 رجون کو افغانستان کے نیم سرکاری اخبار "اصلاح" نے خان عبد الغفار خان کے مطالبہ پختونستان کی حمایت کی۔ اخبار کے اداریہ کا خلاصہ یہ تھا کہ "اگر پختونستان کی ریاست قائم ہوگئی تو افغانستان سب سے پہلے اسے تسلیم کرے گا اور پھر پاکستان اور ہندوستان سے بھی یہ توقع کرے گا کہ وہ بھی اسے تسلیم کرلیں۔"[10]

لہٰذا گاندھی نے پاکستان کے خلاف اپنی شرانگیزی جاری رکھی۔ گاندھی کے اسلحہ خانہ میں جتنے ہتھیار تھے وہ سب کے سب اس نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کے لئے استعمال کرڈالے لیکن جغرافیائی حقائق، حالات کے منطقی تقاضوں اور پٹھان عوام کے عزم وارادہ نے اسے بے بس کردیا۔ اس نے 29 رجون کو ماؤنٹ بیٹن کے نام ایک مراسلے میں لکھا کہ "بادشاہ خان (عبدالغفار خان) لکھتا ہے کہ وہ اپنی آزاد پٹھانستان (پختونستان) کی تحریک میں ناکام ہوگیا ہے اس لئے اس کے پیروکاروں کی طرف سے مداخلت کے بغیر ریفرنڈم ہوگا اور وہ ووٹنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ اسے پورا احساس ہے کہ اس صورت میں صوبہ سرحد غالباً پاکستان میں شامل ہو جائے گا۔"[11] تاہم گاندھی کو اب یہ امید تھی کہ کانگرس اور سرخپوشوں کی طرف سے ریفرنڈم کا بائیکاٹ مؤثر ثابت ہوگا۔ چنانچہ اس نے 5 رجولائی کو عبدا غفار خان کو خط لکھا کہ "اگرچہ بائیکاٹ سے پاکستان کو قانونی فتح تو یقیناً حاصل ہو جائے گی لیکن اگر آپ کی طرف سے تشدد کے کسی شائبہ کے بغیر پٹھانوں کی اکثریت نے باوقار طور پر ریفرنڈم میں حصہ لینے سے اعتراض کیا تو یہ بات پاکستان کے لئے ایک اخلاقی شکست ہوگی۔"[12]

دریں اثنا حکومت افغانستان کی طرف سے صوبہ سرحد کے پاکستان سے علیحدگی کے بارے میں پروپیگنڈا مہم بھی بہت تیز ہوگئی حالانکہ قبل ازیں 30 رمئی کو جبکہ ہندوستان کا وائسرائے ماؤنٹ بیٹن برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کی منظوری حاصل کرنے کے لئے لندن گیا ہوا تھا، افغان بادشاہ ظاہر شاہ نے کابل میں اپنی قومی اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے توقع ظاہر کی تھی کہ افغانستان کے برطانیہ اور ہندوستان میں اس کے جانشینوں سے اچھے تعلقات قائم رہیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں کا اس کے افغانستان کے ساتھ تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس نے اپنی تقریر میں سوویت یونین کے ساتھ اپنی سرحد میں حالیہ ردوبدل کا تو ذکر کیا تھا

لیکن ڈیورنڈ لائن کے بارے میں وہ بالکل خاموش رہا تھا۔[13] اس نے یہ تقریر بظاہر اس تاثر کے تحت کی تھی کہ برصغیر تقسیم نہیں ہوگا لیکن جب 3 رجون 1947ء کو تقسیم کے منصوبے کا اعلان کر دیا گیا تو حکومت افغانستان نے یکا یک قلابازی کھائی اور اس نے جون کے دوسرے ہفتے میں حکومت برطانیہ کے محکمہ خارجہ کو ایک مراسلے میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کیا کہ دریائے سندھ تک کا علاقہ اسے ملنا چاہیے۔[14]

3 رجون کے اعلان کے بعد افغانستان کے ذرائع ابلاغ میں آزاد پٹھانستان کے حق میں پروپیگنڈا شروع ہو گیا تھا۔ 9 رجون کو کابل ریڈیو کی نشریات میں کہا گیا تھا کہ ڈیورنڈ لائن اور دریائے سندھ کے درمیان بسنے والوں کو ہندوستان کے دوسرے عناصر کی طرح آزادی کے حصول میں اپنے لئے مخصوص راہ کا انتخاب کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اس روز کے اخبار ''انیس'' میں اس معاملے کو اقوام متحدہ میں لے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ 11 رجون کو افغان وزیر خارجہ علی محمد نے کابل میں متعین برطانوی سفیر کے ساتھ ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد کے عوام کو پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور نہ کیا جائے بلکہ انہیں آزاد پٹھانستان بنانے کا چوائس بھی دیا جائے۔ برطانوی سفیر نے جواب دیا ''صوبہ سرحد دونوں میں سے جس آئین ساز اسمبلی میں بھی شامل ہوگا، وہ اس اسمبلی میں اپنے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کر سکے گا۔'' برطانوی سفیر نے اس ملاقات کی تفصیل کے بارے میں لندن میں وزیر خارجہ کو مطلع کیا اور وہاں سے اس بارے میں ہدایات طلب کیں۔[15] اسی روز لندن میں متعین افغانستان کے سفیر نے براہ راست وزیر خارجہ برطانیہ کے ساتھ ملاقات کر کے انہی خیالات کا اظہار کیا مزید یہ مطالبہ بھی کیا کہ مجوزہ ریفرنڈم میں سرحد کے عوام کو اپنی آزاد ریاست بنانے کے علاوہ افغانستان میں شمولیت اختیار کرنے کا چوائس بھی دیا جائے۔[16] 20 رجون کو افغان حکومت نے برطانوی حکومت کو ایک نوٹ ارسال کیا جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ صوبہ سرحد کے افغان دراصل افغانستان کا حصہ ہیں جنہیں گزشتہ صدی کی اینگلو۔افغان لڑائیوں کے دوران برطانیہ نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ افغانوں اور صوبہ سرحد کا ہندوستان کے عوام کے ساتھ تعلق مصنوعی نوعیت کا ہے۔ چنانچہ صوبہ سرحد کو یا تو آزاد ریاست بننے یا اپنے مادر وطن افغانستان میں شامل ہونے کا اختیار دیا جائے۔[17]

افغان حکومت اور برطانوی حکومت کے مابین ہونے والی تمام خط و کتابت کی نقول حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کو بھی بھیجی گئیں جس کا قلمدان نہرو کے پاس تھا۔ نہرو کو آزاد پختونستان کا نعرہ محض پاکستان سکیم کو سبوتاژ کرنے کی حد تک استعمال کرنے کے ساتھ تو اتفاق تھا لیکن جب افغانستان نے اس نعرے کے سر میں سر ملا دیا اور نسلی، علاقائی، لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر افغان قومیت کے حوالے سے صوبہ سرحد پر افغانستان کا حق جتا دیا اور ''انگریزوں کی کھینچی ہوئی'' اور ''پٹھان قومیت کو مصنوعی طور پر تقسیم کرنے والی'' ڈیورنڈ لائن کو مٹا کر اپنی جغرافیائی سرحد کو دریائے سندھ تک بڑھانے کا دعویٰ کر دیا تو ہندو بورژوا کے نمائندے اور برطانوی ہند کی جانشینی کے علمبردار پنڈت نہرو نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ 29 رجون کو نہرو کے انڈین محکمہ خارجہ کے جانب سے برطانوی وزیر خارجہ کو ایک مراسلہ بھیجا گیا جس میں کہا گیا کہ ''1893ء کے ڈیورنڈ معاہدے کے مطابق ہند اور افغانستان دونوں ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے پابند ہیں اور تب سے اب تک اس پابندی پر عمل ہو رہا ہے لیکن اب افغان حکومت اپنے سفارتی ذرائع سے اور ذرائع ابلاغ سے صوبہ سرحد کے بارے میں جو موقف اختیار کر رہی ہے وہ ہندوستان کے داخلی معاملات میں سراسر دخل اندازی ہے جس کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ آزاد پٹھان ریاست کا سوال اٹھانے کا حق بھی ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے بنتا ہے۔''[18] 30 رجون کو نہرو کے انڈین محکمہ خارجہ کی جانب سے برطانوی وزیر خارجہ کے نام ایک اور مراسلہ بھیجا گیا جس میں متذکرہ موقف کا اعادہ کرتے ہوئے مزید یہ کہا گیا کہ ''اس خطے میں دو نئے ملک قائم ہونے کے باوجود صوبہ سرحد کی سٹریٹیجک اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ انڈیا کی سیاسی حیثیت میں تبدیلی سے ان جغرافیائی عوامل میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوگی جن پر اس کی سلامتی کا دارومدار ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں قائم ہونے والی چھوٹی سی آزاد ریاست خود اپنی سلامتی کا تحفظ نہیں کر سکے گی بلکہ یہ انڈیا کی سلامتی کو بھی خطرے میں ڈال دے گی۔'' مزید یہ کہ ''ہم مستقبل میں افغانستان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنے معاملات میں مداخلت نہیں چاہتے۔ صوبہ سرحد دونوں میں سے کسی ایک ڈومینین کے اندر خودمختار صوبے کی حیثیت سے شامل ہوگا۔ تاہم یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔''[19] یاد رہے کہ ڈیورنڈ لائن کی سٹریٹیجک اہمیت سوویت یونین کے خلاف دفاع سے متعلق تھی جس کے بارے میں نہرو کا کہنا تھا کہ برطانیہ

کے چلے جانے اور یہاں دو نئے ملک وجود میں آنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اس کا خیال تھا کہ آزاد پختونستان اس قدر کمزور ملک ہوگا کہ سوویت یونین کے خلاف مضبوط دفاع کا کام نہیں دے سکے گا اور یوں ہندوستان کی سلامتی کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ''شمال سے خطرے'' کے مقابلے کے لئے نہرو اور برطانیہ یکساں حکمت عملی رکھتے تھے۔

30 رجون کو افغان وزیر اعظم ہاشم خان نے اپنے دورہ بمبئی کے موقع پر اعلان کیا کہ برطانیہ کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ افغانستان سمندر تک راستے کا خواہاں ہے۔ اس نے کہا کہ افغانستان شمال مغربی صوبہ سرحد میں اس قسم کے ریفرنڈم کو منظور نہیں کرتا جس میں لوگوں کو صرف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان انتخاب کا حق دیا گیا ہو۔ کابل کو حق حاصل ہے کہ وہ ریفرنڈم کے دوران اپنے نمائندے کو موقع پر بھیجے۔ اسی دن پونا میں افغان باشندوں کے ایک گروپ نے اعلان کیا کہ وہ آزاد پختونستان کے حق میں ہیں۔ [20] ہاشم خان کی اس تقریر کے ساتھ ساتھ کابل ریڈیو مسلسل یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ دریائے سندھ تک کے عوام کو یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں یا افغانستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

برطانیہ چاہتا تھا کہ افغانستان حکومت کی جانب سے موصول شدہ نوٹ کا جواب برطانوی وزارت خارجہ اور حکومت ہند کے محکمہ خارجہ دونوں کی جانب سے مشترکہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ جواب تیار کیا گیا جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ افغانستان جس علاقے کے بارے میں دعویٰ کر رہا ہے وہ انڈیا کا اٹوٹ انگ ہے اور اس بات کو 1921ء کے اینگلو۔ افغان معاہدے میں افغانستان تسلیم کر چکا ہے۔ اس لئے اب صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کے بارے میں افغانستان جو تجاویز دے رہا ہے وہ انڈیا کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہیں۔ 2 رجولائی کو نہرو کے محکمہ خارجہ کی جانب سے برطانوی کابینہ نے وزیر اعظم ایٹلی کی زیر صدارت اجلاس میں اس جواب کی منظوری دے دی اور 4 رجولائی کو اسے لندن میں افغان سفیر کے حوالے کر دیا گیا۔ [21] وزیر ہند لارڈ لسٹوول نے غیر ملکی، امریکی اور برطانوی ایمپائر کے اخبار نویسوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''افغانستان کو شمال مغربی صوبہ سرحد کے حقوق میں دخل دینے کا جیسا کہ وہ آج کل کر رہا ہے، کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ پٹھان بڑے عرصے سے شمال مغربی صوبہ سرحد میں اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے شمال مغربی صوبہ سرحد کے ٹکڑے کرنے کی تحریک کی

اجازت دی تو اس سے ہر قسم کی مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔''[22] وزیر ہند کا مطلب یہ تھا کہ اگر برصغیر کے شمال مغربی سرحدی علاقے کی موجودہ حیثیت میں کوئی تبدیلی کی گئی تو بدامنی پیدا ہوگی اور سوویت یونین اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ سب کو معلوم تھا کہ صوبہ سرحد کے قبائلی اور غیر قبائلی عوام کی بہت بھاری اکثریت پاکستان کے حق میں ہے۔ اگر ان کے علاقے کے مستقبل کا فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف کرنے کی کوشش کی گئی تو بہت گڑبڑ ہوگی اور جنگی اہمیت کے اس علاقے کے حالات قابو میں نہیں رہیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ لندن کے مشہور سوشلسٹ ہفت روزہ ''نیو سٹیٹس مین اینڈ نیشن''(New Statesman and Nation) نے اسی ہفتے ایک اداریے میں رائے ظاہر کی تھی کہ ''سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے ہندوستان اور پاکستان سے الگ آزاد پٹھانستان کے جس منصوبے کا اعلان کیا تھا وہ ناکام ہوگیا ہے۔ ریفرنڈم کا نتیجہ لازمی طور پر اس کے خلاف برآمد ہوگا۔ اگرچہ کانگرس نے برصغیر کی تقسیم کو غیر مشروط طور پر منظور کر لیا تھا لیکن سرحدی گاندھی اسے مسترد کر کے اور آزاد پٹھانستان کے قیام کی مہم شروع کر کے ایک غلط راستے پر گامزن ہوگیا ہے۔''[23] بظاہر کانگرس پارٹی بھی حکومت برطانیہ کے اس موقف سے اتفاق کرتی تھی۔ وہ یہ تو چاہتی تھی کہ افغانستان آزاد پختونستان کی تحریک کی تائید وحمایت کر کے پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرے لیکن اس کی یہ خواہش نہیں تھی کہ یہ علاقہ پاکستان کے بجائے افغانستان میں مدغم ہوجائے۔ وہ اپنے آپ کو صوبہ سرحد سمیت پورے برصغیر کا جائز وقانونی وارث تصور کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خدائی خدمت گار تنظیم کی 20 رجون کی قرارداد میں بھی افغانستان کا کوئی ذکر موجود نہیں تھا۔

اس دوران مسلم لیگ کی جانب سے یہ واضح کیا جاچکا تھا کہ اگر ڈومینین ہندوستان کو موجودہ انڈیا کا واحد جانشین قرار دیا گیا تو پھر پاکستان، حکومت برطانیہ اور افغانستان کے مابین ہوئے 1921ء کے معاہدے کی بین الاقوامی ذمہ داری پوری کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔ برطانوی کابینہ کے مذکورہ اجلاس میں اس پر برہمی کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ اگر مسلم لیگ کا یہی رویہ جاری رہا تو ہم افغان حکومت کے سامنے جو کیس پیش کر رہے ہیں وہ خراب ہوجائے گا۔ کابینہ نے وائسرائے کو ہدایت جاری کی کہ وہ مسلم لیگی رہنماؤں کو تنبیہ کرے کہ اگر انہوں نے اس رویے کو جاری رکھا تو اس کے نتیجے میں ان کو پشیمانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔[24]

5 رجولائی کولسٹوول نے ماؤنٹ بیٹن کو اس بارے میں آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ مسلم لیگ کو یہ نقطہ نظر اختیار کرنا ہوگا کہ افغانستان ایک ایسے علاقے کے بارے میں دعویٰ کر رہا ہے جس کے بارے میں بین الاقوامی معاہدوں کا وارث اپنے قیام کے بعد پاکستان ہوگا اور اس علاقے کے بارے میں دعویٰ اس کے داخلی معاملات میں مداخلت تصور کیا جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے ساتھ ملاقات کی اور انہیں پہلے تو برطانوی حکومت کی جانب سے افغان حکومت کے ساتھ اختیار کردہ موقف کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر لسٹوول کا پیغام پہنچایا۔ جناح نے مستقبل کی حکومت پاکستان کو افغانستان کے ساتھ کئے گئے بین الاقوامی معاہدوں کا وارث قرار دیئے جانے کی تائید کی اور برطانوی حکومت کے موقف کو منظور کر لیا۔[25]

نہرو نے نہ صرف سرکاری خط و کتابت میں افغان موقف کی بدستور مخالفت جاری رکھی بلکہ اس نے 4 رجولائی کو ماؤنٹ بیٹن کی زیر صدارت عبوری کابینہ کے اجلاس میں بھی اس کے خلاف موقف کا اعادہ کیا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ ایک ماہ سے افغانستان کے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ پٹھان ہندوستانی نہیں ہیں بلکہ افغانی ہیں اور انہیں اپنے مادر وطن افغانستان میں شمولیت کا اختیار دیا جائے یا آزاد ریاست بنانے کا حق دیا جائے۔ اس نے بتایا کہ حکومت ہند نے افغان حکومت کے دعوؤں کو یکسر مسترد کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ آزاد پٹھان ریاست کا معاملہ بھی حکومت ہند کے ساتھ متعلق ہے۔[26] دراصل آزاد پختونستان کا جو شوشہ کانگرسی رہنماؤں نے پاکستان سکیم کو سبوتاژ کرنے کی خاطر چھوڑا تھا، اب وہ خودان کے گلے کا ہار بن گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ خودان کے نزدیک مجوزہ پٹھانستان اتنی چھوٹی اور کمزور ریاست تھی جو اپنا وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔

نہرو نے 4 رجولائی کو لندن میں ہندوستان کے قائم مقام ہائی کمشنر ایم۔ کے۔ ولوڈی کے نام اپنے مراسلے میں اپنے پٹھانستان کے نعرے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ''آزاد پٹھانستان کے نظریے کا مطلب مکمل آزادی یا انڈیا سے علیحدگی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوبے کو مکمل خودمختاری دی جائے اور اسے یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ جس ڈومینین میں چاہے شمولیت اختیار کرے'' اور آگے چل کر لکھا کہ ''یہ بالکل واضح ہے کہ ایک علیحدہ آزاد ریاست کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ صوبہ سرحد اس قدر چھوٹا اور کمزور ہے کہ وہ آزاد

ریاست کے طور پر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔"[27] یہ تھی آزاد پٹھانستان کے نعرے کی اصل حقیقت جس کے لئے کانگرس کی جانب سے ریفرنڈم میں بطور تیسرا چوائس شامل کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا اور یہ مطالبہ منظور نہ ہونے کی صورت میں ریفرنڈم کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جبکہ ریفرنڈم کے ذریعے صوبے کے عوام الناس کو عوامی سطح پر یہ فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی دی گئی تھی کہ "وہ جس ڈومینین میں چاہیں شمولیت اختیار کرلیں۔" صوبہ سرحد کے معاملے میں کانگرسی رہنماؤں نے جس رویے کا مظاہرہ کیا وہ ان کی منافقت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے پبلک کے سامنے کچھ موقف اختیار کیا اور سرکاری سطح پر کچھ اور موقف اختیار کیا۔

23 رجون کے انڈین نیوز کرانیکل میں نہرو کا ایک بیان شائع ہوا جو اس نے ہندوؤں کے متبرک مقام ہردوار میں جاری کیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "صوبہ سرحد کی کانگرس مجوزہ ریفرنڈم کا بائیکاٹ کرے گی۔ تاہم پھر بھی ریفرنڈم ہوا تو صوبے کی کانگرسی حکومت مستعفی ہو جائے گی اور پاکستان یا آزاد پٹھانستان کے سوال پر تازہ انتخابات لڑے گی۔ صوبے کا فوری مستقبل خواہ کچھ بھی ہو، حریت پسند پٹھان ایک آزاد پٹھان ریاست کے قیام تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔" جناح نے اس بیان پر سخت احتجاج کیا چنانچہ اگلے روز ماؤنٹ بیٹن نے یہ بیان نہرو کو دکھایا اور اسے غیر مناسب قرار دیا لیکن نہرو اپنے اس بیان سے صاف منکر ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے کوئی انٹرویو یا بیان جاری نہیں کیا البتہ وہاں موجود ایک رپورٹر سے بات چیت کی تھی جس سے اس نے خود ہی یہ بیان اخذ کرلیا ہے۔[28] تاہم اسی روز یعنی 24 رجون کو سرحدی گاندھی عبدالغفار خان نے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا اور کہا کہ "ریفرنڈم میں فقط دو متبادل دیئے گئے ہیں جبکہ ہم ان دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ ہم رائے شماری میں حصہ نہیں لے سکتے کیونکہ ہم آزاد پٹھان ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔"[29] خود کانگرس ہائی کمان کا ابتدائی موقف بھی یہی تھا جو کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کی جانب سے کانگرس کے صدر کرپلانی نے 2 رجون کو ماؤنٹ بیٹن کے نام خط میں بیان کیا تھا جبکہ نہرو سرکاری سطح پر پٹھانستان کی واضح مخالفت کر رہا تھا۔ خود کانگرسی وزیر اعلیٰ سرحد ڈاکٹر خان صاحب کا رویہ بھی اس معاملے میں کانگرسی ہائی کمان کے سامنے معذرت خواہانہ تھا وہ سرکاری خطوط میں اپنے افغانستان کے ساتھ تعلق کی نفی کرتا تھا۔ اس نے 2 رجولائی 1947ء کو پنڈت نہرو کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہم آپ کو

یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے افغانستان میں شامل ہونے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہے کہ افغان حکومت نے اس سلسلے میں سرکاری طور پر حکومت ہندوستان سے رابطہ قائم کیا ہے۔ ہمیں بڑی ناقابل رشک پوزیشن میں ڈال دیا گیا ہے۔ افغان حکومت موجودہ صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔"[30]

خان برادران جنہوں نے تمام عمر کانگرس کے ساتھ وفاداری کا دم بھرا تھا، اب کانگرس کی منافقانہ سیاست کے ہاتھوں ذلیل ہو رہے تھے۔ ان پر یہ الزامات لگائے جا رہے تھے کہ عبدالغفار خان افغانستان کی حکومت سے ملا ہوا ہے اور اس کے ایما پر وہ آزاد پٹھانستان کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ 30 رجون کو مہاتما گاندھی نے دہلی میں اپنی پرارتھنا سبھا میں بھاشن دیتے ہوئے آزاد پٹھانستان کی توجیہہ پیش کر دی جو نہرو نے حکومت ہند کی جانب سے حکومت برطانیہ کے سرکاری موقف کی حمایت میں اختیار کی تھی۔ گاندھی نے کہا کہ "جہاں تک میں جانتا ہوں عبدالغفار خان کے ذہن میں فقط داخلی امور میں پٹھانوں کی آزادی کا تصور ہے۔ وہ ایک علیحدہ ریاست نہیں بنانا چاہتا۔ اگر وہ اپنا ایک مقامی آئین وضع کر لے تو وہ خوشی کے ساتھ دو میں سے کسی ایک ملک میں شمولیت کا فیصلہ کر لے گا۔" گاندھی نے ان الزامات کا بھی ذکر کیا جن میں کہا جا رہا تھا کہ "خان عبدالغفار خان افغانستان کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔" گاندھی نے کہا کہ "میرے خیال میں غفار خان کسی خفیہ سودے بازی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ سرحدی رہنما صوبہ سرحد کو افغانستان کے قبضے میں نہیں جانے دے گا۔"[31] اگر علیحدہ ریاست کے قیام کا کوئی سوال نہیں تھا اور معاملہ فقط "داخلی امور" میں صوبائی خودمختاری تک محدود تھا تو یہ معاملہ آئین ساز اسمبلی میں اٹھایا جانا چاہیے تھا۔ یہ پاکستان یا ہندوستان میں سے کوئی بھی آئین ساز اسمبلی ہو سکتی تھی اور اسی سوال پر ریفرنڈم ہو رہا تھا کہ صوبہ کے عوام ان دونوں میں سے کون سی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونا پسند کرتے ہیں۔ اگر خان برادران یہ سمجھتے تھے کہ داخلی امور کی خودمختاری انہیں ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں مل سکتی تھی جہاں کہ ان کی جماعت کانگرس کو قطعی اکثریت بھی حاصل تھی، تو انہیں ریفرنڈم میں حصہ لے کر رائے عامہ کو ہندوستان آئین ساز اسمبلی کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے ہموار کرنا چاہیے تھا۔ ان کے پاس بائیکاٹ کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن خان برادران نے صوبہ کے مسلم عوام الناس کا پاکستان کے حق میں واضح رجحان دیکھ لیا تھا اور یہ نوشتہ

دیوار پڑھ لیا تھا کہ صوبہ سرحد جہاں بھاری اکثریت میں مسلمان آباد تھے، ہندو غلبے کی کانگرس کے ماتحت ہندوستان میں شامل ہونے پر ہرگز آمادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے آزاد پٹھانستان کا نعرہ بلند کیا مگر جب افغانستان نے اس نعرے کو اختیار کر لیا تو کانگرسی قیادت نے قلابازی کھائی اور آزاد پٹھانستان کے لئے زور دینا بند کر دیا۔ نہ ہی صوبے کی کانگرس وزارت نے نہرو کے دعوے کے مطابق استعفیٰ دیا اور نہ ہی کوئی ایجی ٹیشن شروع کیا کیونکہ اب اس سے افغانستان کے دعوؤں کو تقویت ملتی تھی اور کانگرسی رہنمافی الحال اس تصفیے کو بعد میں پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے لئے اٹھا رکھنا چاہتے تھے۔

جیمز سپین (James Spain) کا کہنا ہے کہ اگرچہ اس امر کی کوئی واضح شہادت موجود نہیں ہے کہ خان عبدالغفار اور حکومت افغانستان کے مطالبات پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق پیش کئے گئے لیکن جوں جوں برصغیر کی تقسیم کا وقت نزدیک آتا گیا ان دونوں میں تعاون بڑھتا چلا گیا اگرچہ ان کے مقاصد میں اختلاف تھا۔ جب کابل پختونستان کی حمایت کرتا تھا تو دراصل وہ صوبہ سرحد پر لسانی بنیاد پر اپنے دعوے کا اظہار کرتا تھا۔[32] لیکن پختونستان تحریک کے ایک سابق سرکردہ کارکن سید جمال شاہ کا بیان ہے کہ خان عبدالغفار خان کا سرخ پوش تنظیم اور حکومت پاکستان کے درمیان پختونستان کے بارے میں اشتراک عمل کا فیصلہ انڈین نیشنل کانگرس کی 14 رجون کی قرارداد کے بعد کابل کے ایک خفیہ جلسے میں کیا گیا تھا۔ جمال شاہ لکھتا ہے کہ ''عبدالغفار خان اس قرارداد سے ''دل شکستہ ہو کر کابل آئے۔ ان کے ہمراہ مہمند قبیلہ کے ایک رہنما میرا جان گوڈاخیل بھی تھے۔ غفار خان کابل پہنچ کر وزیر تجارت عبدالحمید خان کے پاس مقیم ہوئے۔ عبدالحمید خان اس وقت افغانستان میں صف اول کے سرمایہ دار اور پرانے دولت مند سمجھے جاتے تھے۔ ان کی رہائش گاہ پر عبدالغفار خان کے خفیہ جلسے منعقد ہوتے تھے۔ ان میں عبدالرحمان پژواک، آقائے عبدالحئی حبیبی، گل باچا خان الفت، سردار نجیب اللہ، عبدالرؤف بے نوا اور افغانستان کی دوسری علمی اور سیاسی شخصیتیں شریک ہوتی تھیں۔ ان کا تعلق پشتو بولنے والی آبادی سے تھا۔ ان جلسوں کا مقصد یہ تھا کہ صوبہ سرحد پاکستان سے کیسے علیحدہ کیا جائے۔ چونکہ میں مطبوعات کے شعبہ میں تھا اور ان جلسوں میں شریک ہونے والے اکثر میرے ہم شعبہ تھے لہٰذا میں بھی بے نوا کے ساتھ ان جلسوں میں جانے لگا۔ ایک ایسے ہی خفیہ جلسے میں غفار خان نے

تجویز پیش کی کہ پشتو بولنے والے علاقے کا نام پختونخواہ کی بجائے پختونستان رکھا جائے اور اس کی سرحدیں افغانستان سے بڑھا کر صوبہ سرحد تک کر دی جائیں۔ اس کے لئے انہوں نے یہ جواز پیش کیا کہ آپ لوگوں نے جس پختون مملکت کا تصور پیش کیا ہے وہ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور مادری وسائل کے اعتبار سے عملی طور پر ممکن نہیں۔ اسی بنیاد پر پختونخواہ کی بجائے پختونستان کا نام تجویز کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ سردار نجیب اللہ اور عبدالرحمان پژواک نے غفار خان کی تجویز منظور کر لی تو طے پایا کہ صوبہ سرحد میں ایک مسلح والنٹیئر کور بنائی جائے جس کا نام زلمے پختون رکھا جائے۔ زلمے پختون کی اصطلاح بھی بے نوا نے اپنی شاعری میں استعمال کی تھی۔ زلمے قندھاری بولی میں پشتو کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جوان۔ واضح رہے کہ زلمے پختون سے پہلے یہ لفظ صوبہ سرحد میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں زلمے پختون پختونستان فورسز کا دوسرا نام تھا۔

''اس جلسے میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ جب پاکستان کا اعلان ہو جائے تو فوراً صوبہ سرحد میں پختونستان کا اعلان کر دیا جائے۔ اگر اس اعلان کے خلاف کوئی گڑبڑ یا اندرونی مخالفت ہو تو زلمے پختون طاقت استعمال کر کے اسے کچل دے۔ اگر حالات اس کے قابو میں نہ آسکیں تو حکومت افغانستان سے فوجی امداد مانگی جائے۔ اس درخواست پر افغان فوجیں فوراً صوبہ سرحد میں داخل ہو جائیں گی۔ سردار داؤد اس وقت کے چیف آف سٹاف تھے اور ان کے چچا سردار شاہ محمود خان غازی وزیر دفاع تھے۔ ایک علیحدہ خفیہ میٹنگ میں جس میں صرف وزیر دفاع سردار شاہ محمود خان غازی، سردار داؤد اور غفار خان شریک ہوئے افغانستان کی طرف سے بھرپور فوجی امداد کی یقین دہانی کروائی گئی تھی   اب مسئلہ یہ تھا کہ افغانستان اور غفار خان کی خدائی خدمت گار تنظیم یا سرخپوش تنظیم کے درمیان براہ راست رابطہ قائم رکھنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں۔ خاصی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ پشاور میں متعین افغان پاسپورٹ آفیسر سردار عبدالقیوم خان کی وساطت سے زلمے پختون کو مالی امداد فراہم کی جائے گی اور علیحدگی پسند، مہمند ایجنسی کے توسط سے افغانستان سے اسلحہ اور ہدایات حاصل کریں گے۔''[33]

ممکن ہے کہ سید جمال شاہ کی یہ تحریر سو فیصد صحیح نہ ہو اور اس میں مبالغہ یا جھوٹ کی خاصی آمیزش ہو کیونکہ گمان غالب ہے کہ جمال شاہ نے یہ سب کچھ صوبہ سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کی ترغیب پر لکھا ہے اور جھوٹ بولنے کے معاملے میں خان عبدالقیوم خان کو

کوئی شخص مات نہیں دے سکتا ہے۔ جو لوگ خان عبدالقیوم خان کو جانتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنے سیاسی حریف کو زک پہنچانے کے لئے کسی بھی حربے سے گریز نہیں کرتا۔ تاہم عبدالغفار خان اور حکومت افغانستان کی بعد کی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر جمال شاہ کی یہ تحریر سو فیصد صحیح نہیں ہے تو یہ سو فیصد غلط بھی نہیں ہے۔

کانگرس کی جانب سے گورنر سرحد اولف کیرو پر مسلم لیگ نوازی کا الزام لگایا جاتا تھا اور اس کی برطرفی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اعلان 3 رجون میں سرحد ریفرنڈم کے اعلان کے بعد یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا اور 4 رجون کو نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ اولف کیرو کو فوری طور پر ہٹا یا دیا جائے۔ 6 رجون کو ماؤنٹ بیٹن نے اولف کیرو کو ایک خط لکھا جس میں کانگرس کی جانب سے اسے برطرف کرنے کے مطالبے کی شدت سے آگاہ کیا اور کہا کہ مناسب یہی ہے کہ وہ عارضی طور پر اپنے منصب سے علیحدگی اختیار کر لے۔ اس کے لئے اس نے یہ طریقہ تجویز کیا کہ وہ آرام کے لئے طویل رخصت پر چلا جائے اور کم از کم 15 راگست تک رخصت پر رہے۔ اس نے لکھا کہ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ''کانگرس کے ساتھ معاملات میں میرے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے۔ اگر ریفرنڈم کے دوران تم گورنر ہوئے اور کانگرس ہار گئی تو وہ یہ الزام عائد کرنے سے باز نہیں رہے گی کہ تم نے لیگ کے جیتنے میں اس نظریے سے اس کو مدد دی ہے کہ لیگ کے مشورے پر تمہیں بدستور گورنر کے طور پر برقرار رکھا گیا ہے۔''[34]

یاد رہے کہ آزادی کے بعد بعض انگریز گورنروں کی خدمات کانگرس اور لیگ دونوں نے اپنے اپنے ملکوں کے لئے حاصل کرنے کی درخواست کی تھی۔ ان میں لیگ نے کننگھم (Cunningham) اور موڈی (Mudie) کو مانگا تھا، اولف کیرو ان میں شامل نہیں تھا۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے کانگرس کے جس متوقع الزام کا ذکر کیا اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں تھی۔ تاہم جب مسلم لیگ کو معلوم ہوا کہ محض کانگرس کی خوشنودگی حاصل کرنے کے لئے اولف کیرو کو جبری رخصت پر بھیجا جا رہا ہے تو 11 رجون کو لیاقت نے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ ''اگر کانگرس کا یہ مطالبہ مانا جا رہا ہے تو پھر مسلم لیگ کے مطالبے پر صوبہ سرحد کی کانگرس وزارت کو بھی برطرف کیا جائے کیونکہ اس کے وزیر ریفرنڈم پر اثر انداز ہونے کے لئے ہر ہتھکنڈا استعمال کریں گے''۔ لیکن مسلم لیگ کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ 17 رجون کو اولف کیرو کی طویل رخصت کی درخواست منظور کر لی گئی اور اسے

سبکدوش کر دیا گیا۔ 26 رجون کو اس کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل لوک ہارٹ (Lock hart) نے نئے گورنر سرحد کا عہدہ سنبھال لیا۔ یاد رہے بعد ازاں اسی لیفٹیننٹ جنرل لوک ہارٹ کو کانگرس نے آزاد ہندوستان کی مسلح افواج کا پہلا کمانڈر انچیف مقرر کیا تھا۔

جب اولف کیرو کی جگہ نہرو کی تجویز کے مطابق لیفٹیننٹ جنرل سر راب لوک ہارٹ کو گورنر مقرر کیا جا چکا تھا تو پھر ریفرنڈم کمشنر بریگیڈیئر جے۔ بی۔ بوتھ اور چالیس دیگر برطانوی فوجی افسروں کی نگرانی میں رائے شماری ہوئی۔ صوبہ میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے 50000 فوج متعین کی گئی جبکہ ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت صوبہ میں عام نظم ونسق برقرار رکھنے کی ذمہ دار تھی۔ ریفرنڈم 6 رجولائی سے 17 رجولائی تک پرامن طریقے سے ہوا۔ 289244 ووٹ پاکستان کے حق میں ڈالے گئے جبکہ ہندوستان کے حق میں صرف 2874 افراد نے ووٹ ڈالے۔ پاکستان کے حق میں رائے دہندگان کی کل تعداد کے 51 فیصد لوگوں نے ووٹ ڈالے۔ چونکہ کسی بھی انتخاب میں کبھی سو فیصد رائے دہندگان حصہ نہیں لیتے اور 1946ء کے عام انتخابات میں 56 فیصد رائے دہندگان نے رائے شماری میں حصہ لیا تھا اس لئے مسلم لیگ کا یہ دعویٰ صحیح تھا کہ دراصل پاکستان کے حق میں 58 فیصد رائے دہندگان نے ووٹ دیئے ہیں۔ یہ نتیجہ کانگرس پارٹی کی توقعات کے بالکل خلاف تھا۔ خان برادران صوبہ میں اپنے سیاسی اثر ورسوخ کے بارے میں بدستور خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے بائیکاٹ کے باعث بہت کم لوگ ریفرنڈم میں حصہ لیں گے۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے اسی خوش فہمی کے تحت 7 رجولائی کو پشاور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اگر مسلم لیگ نے اس ریفرنڈم میں 30 فیصد یا اس سے زیادہ ووٹ حاصل کر لئے تو میں اخلاقی وجوہ کی بنا پر وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو جاؤں گا[35] اور جواہر لال نہرو نے 9 رجولائی کو برطانیہ کے اخبار ''مانچسٹر گارڈین'' کے نام ایک خط میں لکھا کہ ''خان عبدالغفار خان نے آزاد پختونستان کا جو مطالبہ کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہندوستان سے الگ ایک بالکل آزاد ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ محض اس لئے کیا ہے کہ اس میں لوگوں سے فرقہ وارانہ بنیاد پر استفسار کیا جارہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے صوبے کو مکمل خود مختاری دی جائے اور سرحدی عوام کو آزادی سے یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ دونوں میں سے کس ریاست میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ صوبہ سرحد کی

کانگرس پارٹی ہندوستان کے معاملات میں افغانستان کی مداخلت کے بالکل خلاف ہے۔[36]

جب 17 رجولائی کو سرکاری طور پر ریفرنڈم کے نتیجے کا اعلان کیا گیا تو خان عبدالغفار خان اور اس کے حواریوں نے اس عوامی فیصلہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب اسی دن اپنے 7 رجولائی کے اعلان سے پھر گیا اور اس نے اعلان کیا کہ میں اس وقت تک مستعفی نہیں ہوں گا جب تک صوبائی اسمبلی کے نئے انتخابات کا وعدہ نہیں کیا جائے گا[37] اور خان عبدالغفار خان کے بیٹے خان عبدالولی خان کا موقف یہ تھا اور بعد میں بھی رہا کہ کل 70 لاکھ پٹھانوں میں سے صرف تین لاکھ نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالے۔ گویا ان کا ریفرنڈم کا مقاطع کرنے کا فیصلہ موثر رہا اور پٹھانوں کی بہت بھاری اکثریت نے رائے شماری میں حصہ نہ لے کر پاکستان کے خلاف فیصلہ صادر کیا تھا۔ اس سلسلے میں عبدالولی خان نے ریفرنڈم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ یہ ہے۔

کل ووٹ	=	572799
جتنے ووٹ ڈالے گئے	=	292118
پاکستان کے حق میں ووٹ	=	289244
ہندوستان کے حق میں ووٹ	=	2874

عبدالولی خان لکھتا ہے کہ "یہ بات باعث دلچسپی ہو سکتی ہے کہ ان دنوں محدود طریقہ انتخاب رائج تھا۔ سرحد کے باقاعدہ اضلاع کی 35 لاکھ آبادی میں سے صرف 26 لاکھ افراد ووٹ ڈالنے کے اہل تھے اور اگر اس میں تمام علاقے یعنی چھ ایجنسیوں اور سرحدی ریاستوں (جنہوں نے ریفرنڈم میں ووٹ نہیں ڈالے تھے) کی آبادی جو مزید 35 لاکھ بنتی ہے جمع کی جائے تو ڈیورنڈ لائن کے اوپر بسنے والے پٹھانوں کی کل تعداد 70 لاکھ بنتی تھی جس میں سے صرف 3 لاکھ نے بھی پاکستان کے حق میں ووٹ نہ ڈالے۔ اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو بڑا شور مچا رہے ہیں ان کا کیس کتنا کمزور ہے۔"

عبدالولی خان مزید لکھتا ہے کہ عبدالغفار خان کی خدائی خدمت گار تنظیم نے محض اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور تعین کی خاطر قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن ان لوگوں کا رویہ اتنا بے لچک نہ تھا جو تقسیم کے مخالف تھے۔ ایک موقع ایسا آ گیا جب کانگرس، مسلم

لیگ اورانگریز برصغیر کی تقسیم پر متفق ہو گئے اور اسی بنا پر خدائی خدمت گاروں نے سرحد میں استصواب رائے کی مخالفت کی اگر دونوں جماعتیں تقسیم ملک پر رضامند ہیں اور دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ تقسیم کی صورت میں سرحد پاکستان میں شامل ہوگا تو پھر کسی قسم کے ریفرنڈم کے تکلف میں کیا تک ہے۔ انگریز استصواب رائے کے اس لئے خواہش مند تھے کہ یہ بات ان کے نام نہاد جذبہ انصاف پسندی کے منافی تھی کہ وہ 1946ء کے انتخاب کے نتائج سے صرف نظر کریں جن میں خدائی خدمت گار جماعت کو 95 فیصد مسلم آبادی کے صوبہ میں دوتہائی نشستیں حاصل ہوئی تھیں اور جہاں اس جماعت کی اسمبلی پارٹی نے مسلم نشستوں میں قطعی اکثریت حاصل کی تھی۔ مسلم لیگ ریفرنڈم میں محض اس لئے دلچسپی لے رہی تھی کہ ریفرنڈم کے نتائج کی صورت میں اسے ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برخواست کرنے کا جواز ہاتھ آ جائے کیونکہ یہ استصواب تو یقیناً پاکستان کے لئے تھا اور اس کی مخالفت بعید از قیاس تھی۔ عام حالات میں مسلم لیگ کو خدائی خدمت گاروں کے اس فیصلے کا ممنون ہوتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے تھا اور سرحد کے پاکستان میں شامل ہونے پر رضامند دونوں جماعتوں کے متفقہ مطالبہ کی صورت میں اسے خوش آمدید کہنا چاہیے تھا لیکن خدائی خدمت گاروں کے اعلان کے باوجود جب مسلم لیگ نے استصواب رائے کرانے پر اصرار کیا تو خدائی خدمت گاروں نے مطالبہ کیا کہ اگر مسلم لیگ کو ریفرنڈم کرانے پر اصرار ہی ہے تو پھر ووٹروں کو ایک تیسرا اختیار بھی ملنا چاہیے۔ وہ یہ کہ وہ ایک آزاد پختون ریاست کے قیام کے لئے ووٹ دے سکیں۔ اس طرح اس ریفرنڈم کو حق خود اختیاری کے متعلق مکمل اظہار رائے کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ جب ان کی یہ تجویز پوری نہ کی گئی تو خدائی خدمت گاروں نے پھر اپنا پہلا موقف ہی اختیار کر لیا کہ وہ چونکہ قیام پاکستان اور برعظیم کی تقسیم پر رضامند ہو چکے ہیں لہٰذا وہ محسوس کرتے ہیں کہ استصواب رائے کا انعقاد بلا وجہ اور غیر ضروری ہے اور اگر حکام کشیدگی اور منافرت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش پر ہی مصر ہیں تو خدائی خدمت گار ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیں گے اور پھر حقیقتاً ایسا ہی انہوں نے کیا۔"[38]

عبدالولی خان کا یہ بیان تاریخی لحاظ سے اس قدر بے بنیاد اور گمراہ کن ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی سیاست میں خالص جمہوریت، خلوص نیت اور دیانت داری کے عظیم ترین علمبردار بنتے ہیں وہ پاکستان کے قیام کے جواز کے بارے میں اس قدر بد دیانت

ہو سکتے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ کا کوئی طالب علم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ "آزاد پختونستان" کا شوشہ خدائی خدمت گاروں نے جون 1947ء میں اس وقت نہیں چھوڑا تھا جبکہ ولی خان کے بقول انگریزوں اور مسلم لیگ نے سرحد میں ریفرنڈم نہ کرانے کے بارے میں اس کی تجویز منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ یہ شوشہ گورنر سرحد اولف کیرو کی ترغیب پر مئی سے بھی "چند ماہ پیشتر" ڈاکٹر خان اور غفار خان نے چھوڑا تھا اور پھر گاندھی نے اپریل 1947ء کے اوائل میں اسے اختیار کر لیا تھا اور اس نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقاتوں کے دوران اپنے اس مطالبے پر بہت اصرار کیا تھا۔[39] ابوالکلام آزاد کا بیان یہ ہے کہ "لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہی دنوں ڈاکٹر صاحب کو سرحد میں ریفرنڈم کے منصوبے سے آگاہ کر کے پوچھا تھا کہ اسے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ چونکہ ڈاکٹر خان صاحب صوبہ کا وزیر اعلیٰ تھا اور اس بنا پر وہاں اکثریت کی حمایت کا دعویدار تھا اس لئے وہ استصواب کی تجویز پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اس نے ایک نیا سوال اٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ اگر استصواب ہونا ہے تو سرحد کے پٹھانوں کو اپنی ایک ریاست پختونستان کے بارے میں رائے دینے کا بھی حق ملنا چاہیے ڈاکٹر خان صاحب سرحد میں اپنی لیڈری صرف اسی صورت میں قائم رکھ سکتا تھا کہ وہ پختونستان کا مطالبہ پیش کر دے۔"[40] اس نے پختونستان کا سوال اس وقت اٹھایا تھا جب کہ ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستانی لیڈروں کے درمیان برصغیر کی تقسیم کی تجویز زیر بحث آئی تھی۔ جب تک برصغیر کی تقسیم کا امکان پیدا نہیں ہوا تھا اس وقت تک کسی کو پختونستان کا خیال نہیں آیا تھا۔ اگر ہندوستان متحد رہتا تو خان برادران کو پختونستان کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

انگریز سرحد میں استصواب رائے کے اس لئے خواہش مند نہیں تھے کہ یہ بات ان کے نام نہاد جذبہ انصاف پسندی کے منافی تھی بلکہ ان کے ریفرنڈم کے حق میں ہونے کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اگر ریفرنڈم نہ کرایا جاتا تو اس علاقے میں وسیع پیمانے پر بدامنی کا خطرہ تھا اور یہ بات برطانوی سامراج کے عالمی مفاد کے منافی تھی۔ سامراج حقیقی یا نام نہاد جذبہ انصاف پسندی کے تحت کوئی کاروائی نہیں کرتا بلکہ اس کی ہر کاروائی اس کے عالمی مفاد کے تحت ہوتی ہے۔ اس کا انصاف یا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سرکاری ریکارڈ کے مطابق خود نہرو کسی بھی صوبے کو آزادی کا حق دینے کے خلاف تھا۔[41] اگر کانگرس صوبہ سرحد کو یہ حق دینے پر آمادہ ہو جاتی تو پھر بنگال، سکھوں کے پنجاب، کشمیر، حیدرآباد، ٹراونکور اور

دوسرے کئی علاقوں کو مکمل آزادی حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا اور یہ بات کانگرس کی توسیع پسند قیادت کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ صوبہ سرحد کے بارے میں غیر یقینی سیاسی صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اگر صوبہ سرحد کی اسمبلی کے پنجاب، بنگال اور سندھ کی اسمبلیوں کی طرح پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کا امکان ہوتا تو صورت حال مختلف ہوتی لیکن خان برادران نے آخر وقت تک پاکستان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق جب کانگرس ورکنگ کمیٹی کے 2 رجون کے اجلاس میں گاندھی نے برصغیر کی تقسیم کی حمایت کی تھی تو عبدالغفار خان پر سکتہ طاری ہو گیا تھا اور وہ کئی منٹ تک بول نہیں سکا تھا۔ ابتداً جناح کا مطالبہ تو یہ تھا کہ چونکہ برصغیر کی تقسیم فرقہ وارانہ اصول کی بنا پر ہو رہی ہے اس لئے سرحد میں کانگرسی وزارت قائم رکھنے کا کوئی اخلاقی جواز موجود نہیں۔ لہذا اسے برطرف کر دینا چاہیے لیکن حکومت برطانیہ نے یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا تھا اور اس کے بجائے وہاں ریفرنڈم کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔

عبدالولی خان نے اپنے بیان میں صوبہ سرحد کے باقاعدہ اضلاع، قبائلی علاقوں اور سرحدی ریاستوں کی کل آبادی کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ موقف اختیار کیا کہ ڈیورنڈ لائن سے اوپر بسنے والے پٹھانوں کی ستر لاکھ آبادی میں سے صرف تین لاکھ نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے تھے، اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہوگی۔ اس کے اس موقف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص پاکستان کے بارے میں کس قدر منافقانہ اور معاندانہ رویے کا حامل ہے۔ معلوم نہیں کہ اس قسم کے عناصر محض اپنی سیاسی کج روی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اس قدر گمراہ کن بیان بازی کیوں کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت محدود طریقہ انتخاب صرف صوبہ سرحد میں ہی رائج نہیں تھا بلکہ پورے برصغیر میں یہی طریقہ رائج تھا۔ 46-1945ء کے عام انتخابات بھی، جن میں صوبہ سرحد کی کانگرس پارٹی کو کامیابی ہوئی تھی، اسی طریقہ انتخاب کے تحت ہوئے تھے۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ اسی محدود طریقہ انتخاب کی بنیاد پر قائم شدہ اسمبلیوں نے کیا تھا اور سلہٹ میں ریفرنڈم بھی اسی طریقہ انتخاب کے تحت ہوا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کی بنیاد اسی طریقہ انتخاب پر تھی۔ کانگرس یا خدائی خدمت گار تنظیم نے جب ریفرنڈم پر اعتراض کیا تھا اس کی وجہ یہ نہیں بتائی تھی کہ طریقہ انتخاب محدود ہے بلکہ یہ وجہ بتائی تھی کہ اس میں

"آزاد پختونستان" کے بارے میں تیسرا سوال شامل نہیں ہے۔ سارے برصغیر میں 1947ء کے دوران کبھی کسی نے محدود طریقہ انتخاب کا سوال اٹھایا ہی نہیں تھا کیونکہ طریقہ انتخاب کو وسیع کیا جاتا تو اقتدار کی منتقلی میں تاخیر ہوتی اور یہ بات کانگرس کے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ انگریزوں نے تو اقتدار کی منتقلی کے لئے ابتداً جون 1948ء کی تاریخ مقرر کی تھی مگر پھر وہ کانگرس کے اصرار پر اور اپنی کمزوری کی بنا پر اس مقصد کے لئے 15 راگست 1947ء کی تاریخ مقرر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بقول نہرو کانگرس کو اقتدار حاصل کرنے میں بہت جلدی تھی۔ جہاں تک سرحدی ریاستوں کی آبادی کا تعلق تھا اس کے ریفرنڈم میں حصہ لینے کا اس لئے سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ تقسیم کے منصوبہ کے تحت برصغیر کی کسی بھی ریاست کے عوام کو یہ حق نہیں دیا گیا تھا اور 1947ء میں کسی بھی ہندوستانی ریاست کے عوام نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنا یہ بنیادی حق استعمال نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ یہ اصول غیر جمہوری تھا لیکن انگریز، کانگرس اور مسلم لیگ تینوں ہی اس آئینی اصول پر اتفاق کر چکے تھے اور پھر سرحد کی کانگرس یا خدائی خدمت گار تنظیم نے 1947ء میں سرحدی ریاستوں کے عوام کے لئے اس حق کا کبھی مطالبہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ اس لئے کیا تھا کہ سرحدی ریاستوں کے عوام کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔

قبائلی علاقوں کی آبادی کے بارے میں بھی عبدالولی خان کا بیان غلط اور گمراہ کن ہے۔ اس نے یہ غلط بیانی اس لئے نہیں کی تھی کہ اسے حقائق کا علم نہیں بلکہ اس لئے کی ہے کہ یہ سچ بولنا ہی نہیں چاہتا۔ ولی خان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ برصغیر کے کسی بھی قبائلی علاقے میں محدود یا وسیع طریقہ انتخاب رائج نہیں تھا۔ ان علاقوں میں نہ صرف رائے دہندگان کی فہرست کبھی تیار نہیں ہوئی تھی بلکہ کبھی مردم شماری بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یہاں ریفرنڈم کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قبائلی عوام نے اکتوبر 1946ء میں پاکستان کے حق میں بھرپور مظاہرہ کر دیا تھا جبکہ جواہر لال نہرو نے صوبہ سرحد کے باقاعدہ اضلاع اور قبائلی علاقے کا دورہ کیا تھا۔ جب 14 راگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آیا تو سرحد کے قبائلی علاقے پر برطانیہ کا اقتدار ختم ہو گیا تھا اور آئینی طور پر ہندوستان کے ریاستی حکمرانوں کی طرح قبائلی سرداروں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے روایتی طریقہ سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیں یا پاکستان میں شامل ہو جائیں یا ہندوستان کا حصہ بن جائیں یا افغانستان میں مدغم ہو جائیں۔ پاکستان کے پاس اتنی فوج نہیں تھی کہ وہ انہیں

بزورقوت اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرتا اور قبائلی علاقے کی چوکیوں میں جو تھوڑی بہت فوج تھی وہ بھی گورنر جنرل پاکستان نے اگست میں ہی وہاں سے واپس بلالی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود قبائلی عوام پاکستان کے وفادار رہے۔ صرف فقیر ایپی کے مٹھی بھر پیروکاروں نے حکومت افغانستان کی امداد سے قدرے سرکشی کا مظاہرہ کیا تھا مگر انہیں محض اس لئے کامیابی نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے سارے قبائلی عوام نے پرجوش طریقے سے عملی طور پر پاکستان کے ساتھ یکجہتی ومحبت کا مظاہرہ کیا تھا۔

صوبائی گورنر سر جارج کننگھم نے قبائلیوں کے قوانین، رسومات اور روایات کے مطابق کئی جرگے منعقد کیے تاکہ قبائلی علاقے کے مستقبل کے بارے میں وہاں کے عوام کی مرضی معلوم کی جائے۔ پہلا آفریدی جرگہ یکم نومبر 1947ء کو خیبر ہاؤس پشاور میں ہوا اور پھر شمالی وزیرستان، احمد زئی وزیرستان اور محسود کے جرگے یکم دسمبر کو علی الترتیب میران شاہ، وانا اور پارا چنار میں ہوئے اور قرم قبیلے کا ایک جرگہ 7 دسمبر کو شبقدر میں ہوا۔ مزید برآں اورک زئی اور درہ کے آفریدی جرگے پولیٹکل ایجنٹ نے یکم نومبر 1947ء کو منعقد کئے۔ ان سارے جرگوں میں قبائلی سرداروں نے پاکستان کے ساتھ وفاداری کے حلف اٹھائے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کے پاکستان کے ساتھ ویسے ہی تعلقات ہونے چاہئیں جیسے کہ قبل ازیں ان کے برطانوی حکومت کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ گورنر نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے تو حکومت پاکستان ان سے ویسا ہی سلوک کرے گی جیسا کہ حکومت برطانیہ کیا کرتی تھی۔ ان سب جرگوں میں باقاعدہ معاہدے ہوئے تھے جن پر مہریں ثبت کی گئی تھیں۔[42] دہلی کے روزنامہ سٹیٹس مین (Statesman) کی 23 رمئی 1949ء کی ایک رپورٹ کے مطابق سر جارج نے اس اخبار کو بتایا تھا کہ "میں نے سرحد کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سارے بڑے قبیلوں کے جرگوں سے انٹرویو کیا ہے۔ ان سب نے بلا استثنا پہلے زبانی طور پر کہا ہے اور پھر تحریری بیانات کے ذریعے اس کی تصدیق کی ہے کہ وہ پاکستان کا ایک جزو ہیں اور یہ کہ وہ پاکستان سے ویسے ہی تعلقات رکھنا چاہتے ہیں جیسے کہ ان کے برطانیہ کے ساتھ تھے۔ حکومت پاکستان نے بعد میں اس معاہدے کی توثیق کردی تھی[43] اور پھر جب اپریل 1948ء میں گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا تھا تو ان کا قبائلی علاقوں میں کس قدر پرجوش خیر مقدم کیا گیا تھا، اس کے بارے میں عبدالولی خان جیسے عناصر کے سوا تاریخ کے کسی طالب علم کو کوئی شک وشبہ نہیں۔

عبدالغفار خان، اس کے بیٹے عبدالولی خان اوران کے حواریوں کی طرف سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ 1947ء میں سرحد کے باقاعدہ اضلاع اور قبائلی علاقوں میں مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں جو مظاہرے ہوئے تھے وہ دراصل برطانوی افسروں کی پیداوار تھے اور پاکستان کے حق میں ریفرنڈم کا نتیجہ بھی برطانوی افسروں کی مساعی اور سازشوں کا مرہون منت تھا۔ بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ صوبہ سرحد کے باقاعدہ اضلاع اور قبائلی علاقوں کے عوام دراصل بھیڑ بکریاں ہیں اور 1947ء میں برطانوی افسروں نے انہیں جس طرف اشارہ کیا تھا اسی طرف چلے گئے تھے۔ بلاشبہ ایسی واقعاتی شہادتیں موجود ہیں کہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سراولف کیرو جیسے برطانوی افسروں کا رجحان مسلم لیگ اور پاکستان کی جانب تھا بالکل ایسے ہی جیسے کہ پنجاب کے گورنر سرایوان جینکنز (Jenkins) اور دوسرے برطانوی افسروں کا رجحان سکھوں کی طرف تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سرحد اور پنجاب میں فیصلہ کن کردار برطانوی افسروں نے ادا کیا تھا۔ برصغیر کے مختلف علاقوں میں برطانوی افسروں نے برطانوی سامراج کے عالمی مفادات کے پیش نظر مختلف رویہ اختیار کیا تھا لیکن برصغیر کی تاریخ سازی انہوں نے نہیں کی تھی۔ عبدالولی خان کے سوا سب کو معلوم ہے کہ کسی علاقے کے تاریخ سازی میں فیصلہ کن کردار عوام الناس کا ہوتا ہے اور وہ اپنی اجتماعی ضروریات وتقاضوں کے مطابق رویہ اختیار کرتے ہیں۔ بیرونی عناصر کبھی کبھی ان کے رویے کو تھوڑا سا متاثر کر سکتے ہیں لیکن اسے سراسر تبدیل نہیں کر سکتے۔ تاریخ کا دھارا چند افراد کی جانب سے بند باندھنے سے نہیں رکتا۔ اگر دنیا کی تاریخ سازی کا انحصار صرف چند سامراجیوں یا رجعت پسندوں پر ہی ہوتا تو آج دنیا کا نقشہ ویسے ہی ہوتا جیسا کہ سینکڑوں سال پہلے تھا۔ مزید برآں جب عبدالولی خان وغیرہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو وہ ایک بہت بڑی حقیقت پر دانستہ طور پر پردہ ڈالتے ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم سے تقریباً تین ہفتے پہلے مسلم لیگ نواز گورنر سراولف کیرو کو کانگرس اور خدائی خدمت گار تنظیم کے مطالبے کے مطابق چھٹی دے دی گئی تھی۔ اس کی جگہ ایک ایسے برطانوی فوجی افسر لیفٹیننٹ جنرل لوک ہارٹ کو گورنر کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا جو بعد میں آزاد ہندوستان کا پہلا کمانڈر انچیف مقرر ہوا تھا۔ نہرو کی تجویز کے مطابق ریفرنڈم ایسے برطانوی فوجی افسروں کی نگرانی میں ہوا تھا جن کا صوبہ سرحد سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس دوران میں نظم ونسق قائم رکھنے کی ذمہ داری ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت

کے پاس تھی۔ ریفرنڈم کے دوران کوئی بدامنی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے دھاندلی یا بددیانتی کا کوئی الزام عائد کیا گیا تھا۔ اس نے ریفرنڈم کے نتیجے کو بظاہر بلا چون وچرا تسلیم کر لیا تھا۔

خان عبدالولی خان وغیرہ کی منافقت یا بددیانتی کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جب ریفرنڈم کے اعداد وشمار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ نہیں بتاتے کہ دنیا کے کسی ملک میں سو فیصد رائے دہندگان نے کبھی بھی کسی انتخاب یا استصواب میں حصہ نہیں لیا۔ 46-1945ء کے عام انتخابات میں صوبہ سرحد کے 65 فیصد رائے دہندگان نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا تھا اور ان میں وہ 13 فیصد غیر مسلم بھی شامل تھے جنہوں نے 1947ء کے ریفرنڈم میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کی بہت بھاری اکثریت اس وقت تک ترک وطن کر کے ہندوستان چلی جا چکی تھی اور جو تھوڑے باقی رہ گئے تھے وہ ہندوستان جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اگر ان 13 فیصد غیر مسلم رائے دہندگان کو شمار نہ کیا جائے تو پھر ظاہر ہے کہ سرحد کے مسلم رائے دہندگان کی کل تعداد میں سے تقریباً 90 فیصد نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ 1946ء کے عام انتخابات میں بھی مسلم لیگ کو سرحد کے مسلم رائے دہندگان کی اکثریت نے ووٹ دیئے تھے لیکن مسلم لیگ کو مسلم نشستوں میں سے کانگرس یا خدائی خدمت گار تنظیم سے دو نشستیں کم ملی تھیں۔ مسلم لیگ کو 46.6 فیصد مسلم رائے دہندگان نے ووٹ دیئے تھے جبکہ کانگرس یا خدائی خدمت گار تنظیم کو صرف 38.3 فیصد مسلم رائے دہندگان کے ووٹ ملے تھے۔ ان انتخابات میں کل 355246 مسلم رائے دہندگان نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا تھا جن میں سے کانگرس یا خدائی خدمت گار تنظیم نے کل 136001 مسلم ووٹ حاصل کئے تھے اور مسلم لیگ کو 147940 ووٹ ملے تھے۔ چونکہ 1947ء کا ریفرنڈم رائے دہندگان کی 1946ء کی فہرست کی بنیاد پر ہوا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ ریفرنڈم میں جن مسلم رائے دہندگان نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے تھے ان کی تعداد ان مسلم رائے دہندگان سے دگنی تھی جنہوں نے 1946ء میں مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹوں کی تعداد 279244 تھی یعنی مسلم لیگ نے 1946ء میں جتنے ووٹ حاصل کئے تھے 1947ء میں ان میں 141304 کا اضافہ ہو گیا تھا۔

باب:6

عبدالغفار خان کی کوتاہ اندیشی اور قیوم خان کی موقع پرستی

عبدالغفار خان اور ان کے حواریوں کو دلائل اور اعداد و شمار کے ذریعے اس امر پر قائل نہیں کیا جا سکتا تھا کہ صوبہ سرحد کے عوام نے 1947ء میں آئینی و جمہوری طریقے سے پاکستان میں شامل ہونے کا قطعی فیصلہ کیا تھا اور اب اس فیصلے میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی جانب سے یہ موقف خلوص دل سے تسلیم نہ کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان میں اپنی سیاسی شکست تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ ان کا نظریہ زندگی جاگیردارانہ ہے اور اس بنا پر وہ جاگیردارانہ جذبہ انتقام سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر وہ بورژوا سیاست دان ہوتے تو انہیں ریفرنڈم کے نتائج کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوتا اور وہ اس میں اپنی کوئی ہتک محسوس نہ کرتے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ کسی بھی حلقے کی جانب سے ریفرنڈم میں دھاندلی یا بد دیانتی کا کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان عناصر کو ابتدا ہی سے ایک سے زیادہ بیرونی طاقتوں کی طرف سے ان کی ہر طریقے سے کھلم کھلا حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہے اور تیسری وغالباً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے رجعت پسند اور سامراج نواز حکمرانوں نے اتنی بدعنوانیاں کیں کہ انہیں بار بار یہ کہنے کا موقع ملا کہ دیکھا ہم نے کہا تھا نا کہ ایسا ہی ہوگا۔ گویا یہ پاکستانی حکمرانوں کی بدعنوانیوں کی وجہ سے پاکستان کے وجود کے جواز سے ہی انکار کرتے رہے۔ اگر ان میں جاگیردارانہ تنگ نظری و تعصب کی بجائے بورژوا دوراندیشی اور وسعت قلب ونظر ہوتی تو یہ پاکستانی حکمرانوں کی بدعنوانیوں سے فائدہ اٹھا کر علاقائی عصبیت میں الجھے رہنے کی بجائے پورے پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کر لیتے لیکن اس مقصد کے لئے پہلی شرط کے طور پر انہیں یہ حقیقت خلوص دل سے تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ 47-1946ء میں صوبہ سرحد کے مسلمانوں

میں بھی برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی طرح مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں زبردست رو چل گئی تھی اور اس رو نے کانگرس اور خدائی خدمت گار تنظیم کے سارے سابقہ سیاسی اندازے اور نظریے غلط ثابت کر دیئے تھے۔ سیاست میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ کوئی دانشمند بورژوا سیاست دان اپنی اس قسم کی سیاسی غلطی کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ البتہ جاگیردار، خان، نواب یا وڈیرہ ایسا کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے اور وہ جاگیردارانہ دشمنی وعناد میں اپنا اور دوسروں کا سب کچھ تباہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

آل انڈیا کانگرس میں ابوالکلام آزاد کا رتبہ عبدالغفار خان سے بہت اونچا رہا ہے۔ اس کی ذاتی انا اور خود پسندی کے بارے میں بھی کسی کو شبہ نہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اس نے آخر وقت تک مسلم لیگ اور پاکستان کی شدید مخالفت کی اور جناح نے اس بنا پر اپنے دو ایک بیانات میں اس کے بارے میں توہین آمیز الفاظ بھی استعمال کئے تھے لیکن بایں ہمہ قیام پاکستان کے بعد اس میں مسلم لیگ و پاکستان کے حق میں بہت سی باتیں کہنے کی اخلاقی جرأت تھی اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ جاگیردار نہیں تھا بلکہ اس کا نقطہ نگاہ بورژوا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں صوبہ سرحد کے خان برادران کے بارے میں خاصی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے 1946ء کے بعد صوبہ سرحد میں ان کی نام نہاد مقبولیت کا پردہ چاک کرتے ہوئے غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ ''ایک بہت طاقتور گروپ خان برادران کے خلاف تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے بطور وزیر اعلیٰ اس مخالفت کو تقویت پہنچائی تھی۔ اسے پورے صوبے میں حمایت حاصل کرنے کا موقع ملا تھا مگر اس نے غلطیاں کر کے اپنے مخالفین کی طاقت میں اضافہ کر دیا تھا۔'' اس نے خان برادران کی کنجوسی کو بے نقاب کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''ڈاکٹر خان صاحب کی بعض غلطیاں بالکل نجی اور معاشرتی نوعیت کی تھیں۔ صوبہ سرحد کا پٹھان اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہے وہ اپنے مہمان کو اپنے آخری نوالہ میں بھی حصہ دار بنائے گا اور اس کا دستر خوان سب کے لئے کھلا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے بھی اسی قسم کی مہمان نوازی کی توقع کرتا ہے۔ بالخصوص ایسے لوگوں سے جو معاشرے میں اعلیٰ مقام پر ہوں۔ پٹھان کنجوسی اور عدم فیاضی سے جس قدر بھاگتا ہے اتنا وہ کسی سے نہیں بھاگتا۔ بدقسمتی سے یہ ایسا معاملہ تھا جس میں خان برادران اپنے پیروکاروں کی توقع پر پورے نہیں اترتے تھے۔ خان برادران خوشحال تھے لیکن وہ

طبعاً مہمان نواز نہ تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد بھی انہوں نے کبھی کسی کو اپنے دستر خوان پر دعوت نہیں دی تھی۔ اگر لوگ چائے اور کھانے کے وقت آتے تھے تو انہیں کبھی نہیں کہا جاتا تھا کہ ٹھہرو کچھ کھا پی کر جانا۔ وہ عوامی چندوں کے بارے میں بھی کنجوس تھے۔ عام انتخابات کے دوران کانگرس نے انہیں بھاری رقوم دی تھیں لیکن خان برادران نے ان رقوم میں سے اتنا کم خرچ کیا جتنا کہ ان سے ممکن ہوسکتا تھا۔ ایک موقع پر پشاور کے کچھ لوگ انتخابی رقوم کے بارے میں مجھ سے بات چیت کرنے کے لئے کلکتہ آئے۔ جب وہ میرے پاس پہنچے تو چائے کا وقت تھا۔ میں نے انہیں چائے اور بسکٹ پیش کئے۔ انہوں نے حیرت کے ساتھ بسکٹوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک نے بسکٹ اٹھایا اور مجھ سے اس کا نام پوچھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے بسکٹ بڑے مزے سے کھائے اور پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے یہ بسکٹ ڈاکٹر خان صاحب کے گھر دیکھے تھے لیکن اس نے کبھی ان میں سے کسی کو یہ بسکٹ یا چائے کی پیالی تک پیش نہیں کی تھی 1946ء میں اصل پوزیشن یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں خان برادران کو اتنی حمایت حاصل نہیں تھی جتنی کہ دہلی میں ہمارا خیال تھا کہ انہیں حاصل ہے۔''[1]

ایلن کیمبل جانسن کا بیان ہے کہ ''جب ماؤنٹ بیٹن نے اپریل 1946ء میں پشاور کا دورہ کیا تھا تو سرحد کی رائے عامہ کانگرس سے منحرف ہو چکی تھی۔ سرحد کے عوام نے 1947ء کے اوائل میں کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی پالیسی کی حمایت کی تھی لیکن اب اس نعرے میں کوئی دلکشی نہیں رہی تھی۔ اب انہیں خطرہ تھا کہ وہ ہندو کے زیر تسلط آجائیں گے۔''[2] ابوالکلام آزاد اور کیمبل جانسن کے علاوہ شاید ہی کوئی قابل ذکر مؤرخ ہوگا جس نے اس حقیقت کا ذکر نہ کیا ہو کہ 47-1946ء میں صوبہ سرحد کی مسلم رائے عامہ کانگرس اور خان برادران کے خلاف ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کلکتہ، نواکھلی، بہار، گڑھ مکتیشر، پنجاب، ہزارہ اور کوہاٹ کے فرقہ وارانہ فسادات کے پیش نظر سرحد کے مسلمان فرقہ وارانہ جذبات سے بالاتر نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ برطانوی سامراج کی دست برداری کے بعد ہندو استحصالیوں کا غلبہ قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان دنوں سرحد کے مسلمانوں میں درمیانہ طبقہ بہت ہی مختصر سا تھا تاہم اس چھوٹے سے طبقے کو بھی برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمان درمیانہ طبقہ کی طرح یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کے زیر تسلط اس کا مستقبل بہت تاریک ہوگا اور اس طبقے نے سرحد کی مسلم رائے عامہ کا

رخ بدلنے میں خاصا مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ سردار عبدالرب نشتر اس طبقے کی نمائندگی کرتا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ خان عبدالغفار خان اور اس کے حواری اپنے آپ کو عملی طور پر مقامی سیاسی سطح سے بالاتر نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کل ہند سیاسیات میں بھی کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا تھا۔ ان کے کانگرس کے ساتھ رابطہ کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ انہیں کل ہند سیاسیات میں کوئی دلچسپی تھی بلکہ یہ تھی کہ انہیں بقول ابوالکلام آزاد کانگرس سے سیاسی مقاصد کے لئے بھاری رقوم ملتی تھیں اور سرحد کے 13 فیصد ہندو پوری یکجہتی کے ساتھ ان کی تائید وحمایت کرتے تھے۔ کانگری لیڈروں کی طرف سے عبدالغفار خان کو ''بادشاہ خان''، ''سرحدی گاندھی''، ''مرد خدا'' اور ''سرحدی فقیر'' کے خطابات اس لئے نہیں دیئے گئے تھے کہ وہ اسے واقعی ایسا سمجھتے تھے بلکہ اس لئے دیئے گئے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ عبدالغفار خان کی خوشامد کرنے سے صوبہ سرحد کانگرس کے زیر اثر رہے تو پاکستان کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ جیسا کہ چودھری محمد علی نے بیان کیا تھا، ''1947 میں گاندھی نے جس شخص کو بالخصوص نمایاں کرنے کی کوشش کی وہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کا سرجوش لیڈر عبدالغفار خان تھا۔ گاندھی اسے پیار سے بادشاہ خان کہتا تھا۔ ابوالکلام آزاد جو ایک سال پہلے تک بطور صدر کانگرس بہت مشتہر کیا جاتا تھا اب گوشہ گمنامی میں تھا اور شہرت کی نہج پر عبدالغفار خان کو سب سے اہم ''قوم پرست'' مسلمان کے طور پر فائز کر دیا گیا تھا۔ گاندھی کا مقصد شمال مغربی سرحدی صوبے کو پاکستان سے الگ رکھنا تھا۔''[3]

خان عبدالغفار خان اور اس کے حواریوں کے قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد مقامی سیاسیات سے بالاتر نہ ہو سکنے کا تاریخی پس منظر یہ تھا کہ ہر چند برطانوی سامراج نے روسی سامراج کے خلاف اپنی فاورڈ پالیسی یا گرینڈ سٹریٹجی کے تحت 1901ء میں ہی برصغیر کے اس شمال مغربی سرحدی علاقے کو صوبہ کا درجہ تو دیدیا تھا لیکن دوسرے صوبوں کی طرح یہاں کوئی صوبائی انتظامیہ قائم نہیں کی گئی تھی بلکہ ایڈمنسٹریشن ایک چیف کمشنر کے تحت ڈپٹی کمشنروں اور پولیٹیکل افسروں کے سپرد کی گئی تھی اور یہ چیف کمشنر براہ راست مرکزی حکومت کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا۔ 1919ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ (Montego-Chelmsford) اصلاحات نافذ کی گئیں تو ان کا اطلاق صوبہ سرحد اور بلوچستان پر نہ کیا گیا۔ برطانوی فوجی ماہرین کی رائے میں یہ دونوں علاقے ایک ''بارود خانہ'' کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کا نظم ونسق ایسی صوبائی انتظامیہ کے سپرد

نہیں کیا جا سکتا تھا جس میں کہ بعض مقامی لوگوں کو بھی نمائندگی حاصل ہو۔ قدرتی طور پر صوبہ سرحد میں اس فیصلہ کا بہت غیر موافق ردعمل ہوا۔ خان عبدالغفار خان جو ضلع پشاور کے ایک امیر کبیر زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دنوں نوجوان تھا۔ اگرچہ اس کی تعلیم واجبی تھی تاہم اسے صوبہ کے سیاسی وسماجی امور میں خاصی دلچسپی تھی۔ اس کی پہلی خواہش تو یہ تھی کہ برطانیہ کی ہندوستانی فوج میں بھرتی ہو جائے مگر جب اس نے ایک دن ایک برطانوی فوجی افسر کو ایک جونیئر ہندوستانی فوجی افسر سے بدسلوکی کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے اس خودوارانہ رویے کی غالباً بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ان دنوں امان اللہ خان کی سامراج دشمن سرگرمیوں، 1919ء میں افغانستان میں انگریزوں کی ہزیمت، پنجاب میں مارشل لاء، گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک اور علی برادران کی تحریک خلافت سے متاثر تھا۔ وہ اس تحریک سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ ہجرت کر کے افغانستان چلا گیا تھا وہاں اس کی ملاقات امان اللہ خان سے ہوئی تو اس نے اسے صوبہ سرحد میں واپس جا کر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ واپس آ گیا اور اس نے 1920ء میں ایک شخص عبدالوحید تورنگ زئی کے ساتھ مل کر ایک سماجی تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام خدائی خدمت گار تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ایک ذیلی رضا کار تنظیم بھی تھی جسے سرخپوش تنظیم کہتے تھے کیونکہ اس کے ارکان سرخ کپڑے پہنتے تھے۔ جب اس تنظیم کی سرگرمیاں بڑھیں تو عبدالغفار خان کو 1921ء میں گرفتار کر کے تین سال کے لئے جیل میں ڈال دیا گیا۔ انگریزوں کے ذہن میں اس اقدام کی اصلی وجہ ان کے اس شبہ میں پنہاں تھی کہ سرخپوش تحریک کا لینن کی سرخ حکومت سے کوئی تعلق ہے اور سامراج دشمن امان اللہ خان کو بھی اس میں کوئی دخل حاصل ہے۔

ان دنوں برطانوی سامراج کو شمال مغربی سرحدی علاقے کی ہر تحریک یا گڑبڑ میں سوویت یونین کا خفیہ ہاتھ نظر آتا تھا یوں تو اسے انیسویں صدی کے اواخر میں ہی روسی سامراج سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا لیکن لینن کے 1917ء کے انقلاب کے بعد اس کے اس خطرے میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سرخ انقلاب سے اس قدر خائف تھا کہ اسے ہر اس چیز سے خطرہ محسوس ہوتا تھا جس کا رنگ سرخ ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک خان عبدالغفار خان کی سرخپوش تنظیم بھی اس لئے خطرناک تھی۔ عبدالغفار خان کی گرفتاری کے بعد حاجی تورنگزئی نے مہمند قبیلہ کے علاقے میں جا کر علم بغاوت بلند کر دیا اور وہ کئی سال تک وہاں انگریزوں کی فوجی مہمات کا کامیابی سے

مقابلہ کرتا رہا۔ خان عبدالغفار خان کا اپنا بیان یہ ہے کہ اس کی رہائی کے پانچ چھ سال بعد "جب 1929ء میں نادر شاہ نے کابل فتح کیا تو صوبہ سرحد میں جشن منایا گیا تھا اور میں نے فتح کے جلوسوں سے خطاب کیا تھا۔ اس دوران ایک موقع پر ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ میں ایک سیاسی جماعت قائم کرنا چاہتا ہوں جو پختون عوام کی خدمت کے لئے وقف ہوگی اور پھر اس کی تجویز کے مطابق خدائی خدمت گار تحریک وجود میں آئی۔ ابتدائی طور پر اس تحریک کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بعد میں انگریزوں کے ظلم وستم کی وجہ سے اس کا سیاسات سے الگ رہنا ممکن نہ رہا۔" اس کے سیاسات میں ملوث ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 29-1928ء میں جبکہ سائمن کمیشن نے مزید آئینی وسیاسی اصلاحات کے بارے میں برصغیر کی رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے ہندوستان کا دورہ کیا تھا تو عبدالغفار خان کی یہ سماجی تنظیم ترقی کر کے ایک زبردست سیاسی جماعت بن چکی تھی۔ اس کے منتخب جرگے پہلے ہی گاؤں، ٹپہ، تحصیل، ضلع اور صوبہ کی سطح پر قائم ہو چکے تھے۔ جنوری 1929ء میں جب دہلی میں مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کی ساری جماعتوں کی ایک مشترکہ کانفرنس ہوئی تو اس میں خان عبدالغفار خان کی جماعت کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہوا تھا لیکن اس کے چند دن بعد جب لاہور میں انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا تھا تو اس نے خود اس میں رسمی طور پر شرکت کر کے اپنی اور اپنی جماعت کے کانگرس کے ساتھ وابستہ ہونے کا پہلی مرتبہ مظاہرہ کیا تھا۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے چودہ نکات پر مشتمل مطالبات کی جو فہرست مرتب کی تھی اس میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ صوبہ سرحد کو برصغیر کے دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دیا جائے لیکن کانگرس کے سالانہ اجلاس کی قرارداد یہ تھی کہ سب سے پہلے مکمل آزادی کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ آزادی کے بعد حل کیا جائے گا۔

مئی 1930ء میں جب سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ برطانوی سامراج شمال مغربی سرحد کو بدستور "بارود خانہ" تصور کر کے اسے مرکزی حکومت کے ماتحت ہی رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر سرحدی عوام میں اس رپورٹ کا شدید ردعمل ہوا۔ ان دنوں برصغیر میں گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک چل رہی تھی جس میں مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی حصہ نہیں لیا تھا۔ یہاں تک کہ علی برادران بھی اس سے الگ رہے تھے کیونکہ ان کی رائے میں اس

تحریک کا مقصد مکمل آزادی کا حصول نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو مہا سبھائیوں کا دست نگر بنایا جائے لیکن خان عبدالغفار خان اور اس کی خدائی خدمت گار تنظیم بوجوہ اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے صوبے کو دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دلانے کے لئے اور برصغیر کی مکمل آزادی کے حصول کے لئے ایک تحریک شروع کی جس کے دوران پشاور، مردان، کوہاٹ، بنوں اور دوسرے علاقوں میں بہت سے لوگ جاں بحق ہوئے اور ہزاروں نظر بند ہوئے لیکن جب دسمبر 1930ء میں گاندھی یکا یک اپنی سول نافرمانی کی تحریک سے دستبردار ہو گیا تو صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گاروں کی تحریک بھی ختم ہو گئی۔ اس تحریک کی معاشی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں بے مثال عالمی معاشی بحران کے باعث ساری دنیا میں بے روزگاری و بدحالی کا دور دورہ تھا۔ برصغیر کے صوبہ سرحد، جہاں کوئی صنعت کاری نہیں ہوئی تھی، کے نوجوان اس عالمگیر معاشی زبوں حالی سے بہت ہی زیادہ متاثر ہوئے تھے اور اس حقیقت نے تحریک کے لئے خاصی بنیاد مہیا کی تھی۔

اولف کیرو لکھتا ہے کہ چونکہ صوبہ سرحد میں عوام الناس کو بیلٹ بکس یا پارلیمانی ذرائع سے اپنی رائے کے اظہار کی سہولت مہیا نہیں تھی اس لئے خدائی خدمت گار تنظیم پہلے تو ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے وجود میں آئی لیکن اس نے جلدی ہی ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ 1930ء میں حکومت ہند نے اس تنظیم کے خلاف سخت کاروائی اس لئے کی تھی کہ اس نے گاؤں، تحصیل اور ضلع کی سطح پر متوازی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ اولف کیرو مزید لکھتا ہے کہ "عوام میں اس تنظیم کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی قیادت چھوٹے خوانین کے ہاتھ میں تھی اور انہوں نے بے زمین مزارعوں اور دیہی کاریگروں کو بڑے خوانین اور صوبائی انتظامیہ کے خلاف منظم کیا تھا۔"[4] گویا طبقاتی لحاظ سے ان دنوں یہ ایک ترقی پسندانہ تنظیم تھی۔ اگرچہ یہ تنظیم بظاہر سرحد کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی علمبردار تھی اور خان عبدالغفار خان نے 1929ء میں اس کی انڈین نیشنل کانگرس سے وابستگی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن برصغیر کی سطح پر اس کا کانگرس کے ساتھ باقاعدہ الحاق اگست 1931ء میں ہوا تھا جبکہ آل انڈیا مسلم لیگ رجعت پسند جاگیرداروں کے چنگل سے باہر نہیں نکلی تھی اور کانگرس پر گاندھی کا مکمل غلبہ قائم ہو چکا تھا جو اپنی جماعت کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے وقتی طور پر مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کرنے پر

آمادہ ہوجاتا تھا۔ اس نے مسلمانوں کی تحریک خلافت کی حمایت اسی پالیسی کے تحت کی تھی اور اس کے خدائی خدمت گار تنظیم سے اتحاد کے پس پردہ بھی یہی پالیسی کارفرما تھی۔ خان عبدالغفار خان ایک طاقتور کل ہند تنظیم سے اپنا رابطہ قائم ہونے پر خوش تھا اس طرح نہ صرف اسے اپنی تحریک کے لئے بیرونی سرحد سے سیاسی تائید وحمایت حاصل ہوگئی تھی بلکہ اسے سیاسی مقاصد کے لئے ''نقد نارائن'' بھی ملنے لگا تھا۔

خان عبدالولی خان کا مؤقف، جو بظاہر بے بنیاد نہیں ہے، یہ ہے کہ چونکہ خان عبدالغفار خان کی تنظیم نے 1920ء کے بعد صوبہ میں بہت معاشرتی کام کیا تھا اور چونکہ انگریز سرحد جیسے جنگی اہمیت کے حساس علاقے میں کسی قسم کی سیاسی یا معاشرتی سرگرمی کے متعلق ضرورت سے زیادہ محتاط اور ذکی الحس واقع ہوئے تھے لہٰذا وہ 1930ء میں ظالمانہ تشدد پر اتر آئے۔ ''سارے صوبہ کی ناکہ بندی کردی گئی اور کسی کو باہر جاکر ان مظالم کی داستان بیان کرنے کی اجازت نہ تھی۔ جب فوج نے دیہات کا محاصرہ کیا، گھروں کو لوٹا، لوگوں کو سرعام کوڑے بلکہ گولیاں ماریں تو کسی کو اس صوبہ میں داخلہ کی اجازت نہ دی گئی۔ عبدالغفار خان اور ان کے سرکردہ ساتھیوں کو گجرات (پنجاب) جیل میں بند کردیا گیا۔ چونکہ ان لوگوں کے ہندوستان میں کسی پارٹی کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات نہ تھے لہٰذا وہ بالکل تنہا اور الگ تھے اور اسی بنا پر ان کے ساتھ اس قسم کا ظالمانہ اور غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ صرف اپنی حفاظت کے تحت ان کے کارکن تحفظ اور حمایت کی تلاش میں ہندوستان کی طرف دوڑے۔ انہوں نے پہلے مسلم لیگ کے دروازے پر دستک دی لیکن وہاں سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے کانگرس سے رابطہ قائم کیا اور انہوں نے گجرات واپس آکر اپنے لیڈروں کو مطلع کیا کہ مسلم لیگ ان کی مدد کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ جھگڑا ہندوؤں کے ساتھ ہو۔ وہ انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ نہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ صرف ایک تنظیم انڈین نیشنل کانگرس ان کا تحفظ وحمایت کرے گی بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو اس کا شریک کار بنا لیں۔ یہ تھے وہ حالات جن کی بنا پر یہ سماجی کارکن برطانیہ کے خلاف سیاسی احتجاج کرنے والے بن گئے۔ سرحد اپنی مادر وطن کو استعماری تسلط سے نجات دلانے کی جدوجہد آزادی میں شریک ہو گیا اور انہوں نے اپنے لئے کانگرس سے امداد واعانت حاصل کی جو اس وقت انگریزی سامراج کا مقابلہ کرنے والی واحد تنظیم تھی۔''[5]

عبدالولی خان نے اپنے اس بیان میں یہ ذکر نہیں کیا کہ خان عبدالغفار خان نے 1929ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کو قابل توجہ نہیں سمجھا تھا بلکہ سرحدی گاندھی نے اسی سال انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس میں رسمی طور پر شرکت کی تھی۔ اس کا یہ بیان اس لحاظ سے مبہم ہے کہ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مسلم لیگی لیڈر کون تھے جنہوں نے عبدالغفار خان کے ایلچیوں کو یہ جواب دیا تھا۔ جناح تو اس زمانے میں نہرو رپورٹ سے برگشتہ خاطر ہو کر لندن چلے گئے تھے اور علامہ اقبال ان دنوں افغانوں اور پٹھانوں کی شجاعت اور اسلام پسندی کے گیت گاتے تھے۔ عبدالغفار خان نے 1939ء میں ایک طویل انٹرویو کے دوران اپنی جماعت کے کانگرس کے ساتھ الحاق کا ذکر کرتے ہوئے مسلم لیگی لیڈروں پر اس قسم کا کوئی الزام عائد نہیں کیا تھا۔ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ "میں نے اپنی جماعت کا کانگرس کے ساتھ محض اس لئے الحاق کیا تھا کہ یہ زندہ ہے چونکہ یہ خالصتاً ایک مقامی تنظیم تھی اس لئے برطانوی حکومت بیرونی دنیا کو بے خبری میں رکھ کر اسے آسانی سے کچل سکتی تھی۔"[6] انگریزوں کا غلط یا صحیح الزام یہ تھا کہ اس نے 1930ء کے لگ بھگ سوویت یونین سے بھی "خفیہ" رابطہ قائم کر کے "مالی امداد" حاصل کی تھی۔ غالباً انگریزوں کے اس الزام کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ جب 1928ء میں امان اللہ خان ماسکو گیا تھا تو وہاں کے اخبارات اور ارباب اختیار نے برصغیر کی شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقے میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ تاہم سوویت یونین سے خان عبدالغفار خان کے اس مبینہ رابطہ کی بنیاد نظریاتی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ "بادشاہ خان" اور اس کے حواریوں کو سوشلزم سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ زمیندارانہ نظام کی پیداوار تھے اور ان کی ساری سیاست کا مقصد اس نظام کا تحفظ کرنا تھا۔ خان عبدالغفار خان کے 1945ء کے بیان کے مطابق خان عبدالغفار خان اور اس کی جماعت کے خلاف برطانوی سامراج کا یہ الزام سراسر بے بنیاد تھا۔ یہ الزام بھی غلط تھا کہ 1930ء کی تحریک کے دوران آفریدی قبائل نے پشاور پر جو حملہ کیا تھا اس میں خان عبدالغفار خان کا ہاتھ تھا۔ یہ حملہ دراصل آفریدی قبائل نے از خود کیا تھا کیونکہ وہ باقاعدہ اضلاع میں اپنے بھائیوں پر حکومت کے ظلم و ستم کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔[7]

اس تحریک کے تقریباً دو سال بعد یعنی 1932ء میں بالآخر حکومت برطانیہ نے صوبہ سرحد میں 1919ء کی مانٹ گو چیمسفورڈ اصلاحات کا اطلاق کر دیا مگر صوبائی حکومت میں عوامی

نمائندگی کے لئے جو دو وزرا شامل کئے گئے ان کا خدائی خدمت گار تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی سامراجی پٹھو تھے۔ ایک کا نام صاحبزادہ عبدالقیوم خان تھا اور دوسرے کو نواب اکبر خان ہوتی کہتے تھے۔ تاہم جب 1935ء کی اصلاحات کے تحت صوبہ سرحد کو برصغیر کے دوسرے صوبوں کے برابر آئینی و سیاسی حقوق ملے تو 1937ء کے عام انتخابات میں کانگرس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ بنا اور اس کا چھوٹا بھائی عبدالغفار خان گاندھی کی طرح پس پردہ بادشاہ گر بن گیا بلکہ خود ''بادشاہ خان'' بن گیا لیکن وہ سیاسی لحاظ سے اس قدر کوتاہ نظر تھا کہ اسے دریائے سندھ سے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ وہ محض ''سرحدی گاندھی'' کے خطاب سے ہی مطمئن تھا جب کانگرس کے اخبارات اسے سرحدی گاندھی لکھتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کی کل ہند سطح پر کوئی حیثیت نہیں بلکہ یہ محض صوبہ سرحد کا لیڈر ہے جو کل ہند مہاتما گاندھی کے طریقہ سیاست کی پیروی کرتا ہے۔ سرحدی گاندھی کو برصغیر کی سیاست سے عملی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم دوسری عالمی جنگ کے دوران جب 1942ء میں کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کی بنا پر خان عبدالغفار خان کے ساتھ صوبائی اسمبلی کے دس کانگرسی ارکان کو گرفتار کر لیا گیا تو مئی 1943ء میں صوبہ میں سردار اورنگزیب خان کی زیر قیادت مسلم لیگ کو وزارت تشکیل کرنے کی اجازت دے دی گئی حالانکہ 50 ارکان پر مشتمل اسمبلی میں مسلم لیگ کو اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے اس عہد اقتدار میں چار مسلم حلقوں میں ضمنی انتخابات ہوئے اور چاروں میں ہی مسلم لیگ کی فتح ہوئی۔ اس بنا پر مسلم لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ صوبہ کی مسلم رائے عامہ اس کی طرف مائل ہو رہی ہے اور کانگرس کا الزام یہ تھا کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے۔ کانگرس پارلیمانی پارٹی نے اسمبلی کے پہلے دو اجلاس کا بائیکاٹ کیا کیونکہ اس کے دس ارکان جیل میں تھے لیکن 1944ء کے بجٹ سیشن کے بعد چھ کانگرسی ارکان اسمبلی کو رہا کر دیا گیا تو صوبہ میں مسلم لیگ کے اقتدار کی کشتی ڈانواں ڈول ہو گئی۔ 1944ء کے اواخر میں لیگی وزارت کو عدم اعتماد کی تحریک کا نوٹس دیا گیا لیکن اس نے اسمبلی کا صوبائی اجلاس منعقد کرانے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اسمبلی کے لئے قانون سازی کا کوئی کام نہیں ہے۔ جب 2 مارچ 1945ء کو اسے بجٹ سیشن منعقد کرنا ہی پڑا تو 12 مارچ کو اسمبلی میں اس کی شکست ہو گئی۔ کانگرس کو 24 ووٹ ملے اور مسلم لیگ کی حکومت کی صرف 18 ارکان نے حمایت کی۔

مسلم لیگ کی اس شکست کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک صوبہ سرحد کے مسلم عوام کو مسلم لیگ کی ''فرقہ وارانہ سیاست'' میں اس لئے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا کہ صوبہ میں ان کی آبادی 92 فیصد تھی اور اگرچہ صوبہ کی معیشت پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی تاہم انہیں یہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان پر کبھی ہندوؤں کا سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی غلبہ قائم ہوجائے گا لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد جب یہ ظاہر ہونے لگا کہ برطانیہ میں اب برصغیر کو مزید زیر تسلط رکھنے کی سکت نہیں رہی اور اسے جلد ہی یہاں سے دستبردار ہونا پڑے گا تو انہیں بھی رفتہ رفتہ برصغیر کی سیاست میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ 1946ء کے اوائل کے صوبائی انتخابات میں اگرچہ مسلم لیگ کو کانگرس کے مقابلے میں دو مسلم نشستیں کم ملی تھیں لیکن جن مسلم رائے دہندگان نے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے ان کی تعداد ان مسلم رائے دہندگان سے زیادہ تھی جنہوں نے کانگرس کو ووٹ دیئے تھے۔ پھر اگست 1946ء کے بعد پورے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات کی جو خونی لہر چلی اس نے صوبہ سرحد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اکتوبر میں نہرو کے دورہ سرحد کے موقع پر یہ ثابت ہوگیا کہ سرحد کی مسلم رائے عامہ کانگرس سے بالکل منحرف ہو چکی ہے اور پھر اس کا عملی طور پر اظہار جولائی 1947ء میں ریفرنڈم کے نتیجہ کی صورت میں برآمد ہوا جسے خان عبدالغفار خان اور افغان حکمرانوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔

14 راگست 1947ء میں کراچی میں نوزائیدہ مملکت پاکستان کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے جو کام سب سے پہلے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ سرحد کے قبائلی علاقوں کی چوکیوں سے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور دوسرا یہ تھا کہ افغانستان میں اپنا نمائندہ بھیج کر اس ہمسایہ اسلامی مملکت کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات قائم کئے۔ یہ دونوں کام اچھے تھے لیکن اس نے جو تیسرا کام کیا وہ بظاہر غیر آئینی اور غیر جمہوری تھا۔ اس نے 22 راگست کو ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کردیا حالانکہ صوبائی اسمبلی میں اسے بدستور اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ اس برطرفی کی وجوہ کے بارے میں کوئی سرکاری اعلان جاری نہیں کیا گیا تھا۔ صرف یہ غیر سرکاری رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ ''صوبائی استصواب سے پہلے ڈاکٹر خان صاحب نے اعلان کیا تھا کہ اگر مسلم لیگ نے کل ووٹوں میں سے 20 فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل کرلئے تو اس کی وزارت مستعفی ہوجائے گی لیکن استصواب کے نتیجہ کے اعلان کے بعد وہ اپنے عہد سے منحرف ہوگیا۔ وہ کمال ڈھٹائی سے

اپنے عہدہ پر چمٹا رہا گورنر سرحد نے صوبائی عوام کی اکثریت کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے وزارت کو برطرف کر دیا۔''[8]

پنجاب کے بیشتر اخبارات ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو ''خان کھنہ'' وزارت کہتے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب اپنی وزارت کے ہندو وزیر خزانہ مہر چند کھنہ کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی صوبہ سرحد پر بدستور ہندوؤں کی حکومت تھی۔ 27/اگست کو کسی قبائلی لیڈر مصطفیٰ اعظم پاشا جدار العظام غازیان اسلام سرحدات آزاد سے منسوب کر کے یہ بیان ہی چھپوایا گیا کہ ''چند ہفتے گزرے عنایت اللہ مشرقی اور حسین احمد مدنی، عبدالغفار خان کی معیت میں وزیرستان گئے تھے اور انہوں نے کوشش کی کہ کسی طرح فقیر ایپی کو اپنے ساتھ ملایا جائے تاکہ پہاڑوں پر مضبوط محاذ قائم کر کے پاکستان کو پامال کیا جائے اور جس مقصد کے لئے صوبہ سرحد میں پٹھانستان کا نعرہ بلند کیا گیا تھا اس کی تکمیل ہو۔''[9] بظاہر یہ بیان حکومت سرحد کے محکمہ اطلاعات کی پیداوار تھا۔ اس الزام کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان اپنے بااثر سیاسی حریف عبدالغفار خان کی گرفتاری کے لئے سیاسی فضا ہموار کرنا چاہتا تھا۔

چودھری محمد علی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ ''یہ برطرفی اس لئے عمل میں آئی تھی کہ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے وزرا نے پرچم پاکستان کو سلامی دینے سے انکار کر دیا تھا اور انہوں نے پاکستان کے خلاف اپنی پہلی روش ترک نہیں کی تھی۔''[10] سر جارج کننگھم کا سوانح نگار نورول مچل (Norval Mitchell) لکھتا ہے کہ ''ڈاکٹر خان صاحب اور اس کے وزرا پرچم کشائی کی تقریب میں محض اس لئے شریک نہیں ہوئے تھے کہ گورنر نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ گورنر کو خدشہ تھا کہ اس تقریب میں ان کے خلاف ''معاندانہ مظاہرے'' ہوں گے[11] اور اس کے تقریباً دو ہفتے بعد انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس سے اپنا تعلق منقطع کر کے پاکستان سے اپنی وفاداری کا اعلانیہ عہد کیا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کی غیر جمہوری برطرفی کے خلاف احتجاج کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا تھا کہ وہ اس بنا پر کوئی ایسی کاروائی نہیں کریں گے جس سے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے لئے مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہو۔

خالد بن سعید کی اطلاع کے مطابق یہ حقیقت ہے کہ ''پاکستان کے عبوری حکومت کے

سربراہ قائداعظم محمد علی جناح نے جولائی میں ہی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے مطالبہ کیا تھا کہ ریفرنڈم کے نتیجے کے پیش نظر یا تو ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کر کے اس کی جگہ مسلم لیگ کی وزارت کی تشکیل کی جائے یا صوبہ میں آئین کی دفعہ 93 کے تحت گورنر راج قائم کر دیا جائے اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو صوبائی گورنر کے مشیروں کے عہدوں پر فائز کیا جائے اور پھر 14 راگست کو وہاں مسلم لیگ کی وزارت قائم کر دی جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے 8 راگست کو انڈیا آفس کے نام ایک خط میں تجویز پیش کی تھی کہ اسے موخرالذکر طریقہ اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ لیاقت علی خان کی اطلاع کے مطابق ڈاکٹر خان صاحب 15 راگست کو صوبہ سرحد میں ''آزاد پختونستان'' کا اعلان کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن انڈیا آفس نے وائسرائے کی اس تجویز سے اتفاق نہ کیا اور اس امر کی نشاندہی کی کہ چونکہ صوبہ میں کانگرس کی وزارت کو ایوان کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے اس لئے اسے برطرف نہیں کیا جاسکتا۔ اگر صوبائی گورنر کو اطمینان ہو جائے کہ ڈاکٹر خان صاحب اور اس کی وزارت کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے تو اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرانے چاہئیں۔ انڈیا آفس کی رائے یہ تھی کہ آئین کی دفعہ 93 کے تحت گورنری راج بھی قائم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس امر کی کوئی واضح علامت موجود نہیں کہ کانگرس کی وزارت کے تحت آئینی مشینری ناکارہ اور غیر موثر ہو گئی ہے اور لیاقت علی خان کی اس اطلاع کی صحت کے بارے میں بھی شبہ ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب ''آزاد پٹھانستان'' کے قیام کا اعلان کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لہٰذا انڈیا آفس کا موقف یہ تھا کہ 15 راگست سے پہلے کانگرس کی وزارت کو برطرف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح ہز میجسٹی کی حکومت کو ایک ایسے الزام کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا جس کا کہ وہ کوئی جواز پیش نہیں کر سکے گی۔ خالد بن سعید مزید لکھتا ہے کہ ''غالباً قائداعظم خود ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کرنا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اس طرح آمریت کا تاثر پیدا ہو سکتا تھا۔ انہیں اس لئے بھی یہ اقدام کرنے میں تامل تھا کہ اس طرح پاکستان میں صوبائی وزارتوں کو برطرف کرنے کی ایک روایت قائم ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ بعدازاں پاکستان کی مرکزی حکومت نے 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت اپنے اختیارات کا استعمال کر کے کئی صوبائی وزارتوں کو برطرف کیا۔ سرحدی گورنر ڈاکٹر خان صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے بھائی عبدالغفار خان کے زیر اثر تھا لیکن وہ غیر ذمہ دار نہیں تھا۔

اس نے گورنر کو واضح طور پر یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ بطور وزیر اعلیٰ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے پاکستان کے آئین کو نقصان پہنچے اور یہ کہ اس کا ''آزاد پختونستان'' کا اعلان کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر مسلم لیگی حلقوں کو ڈاکٹر خان صاحب کی وفاداری کے اعلانات پر شبہ بھی تھا تو بھی وہ قیوم خان سے کہہ سکتے تھے کہ وہ ایوان میں اکثریت پیدا کرے اور پھر ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے مرکزی حکومت کو 1935ء کے ایکٹ کے تحت اپنے اختیارات استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اس طرح پاکستان میں ایک غلط مثال قائم نہ ہوتی اور اگر ان دنوں قیوم خان کے لئے ایوان کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنا ممکن نہیں تھا تو مرکزی حکومت گورنر کو ہدایت کر سکتی تھی کہ وہ صوبائی اسمبلی کو توڑ کر نئے انتخابات کرائے۔ مرکزی حکومت نے صوبائی وزارت کو جسے ایوان کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی، برطرف کر کے اور پھر ایک دوسرے آدمی کو وزارت سازی کی اس امید میں دعوت دے کر کہ وہ اکثریت کی حمایت حاصل کر لے گا ایک ایسی مثال قائم کر دی تھی جس کی بنا پر صوبوں میں عدم استحکام پیدا ہونا ناگزیر تھا۔[12] خالد بن سعید کے اس بیان کے ابتدائی حصے کی تصدیق پاکستان ٹائمز کی 24/جولائی 1947ء کی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے جس میں بتایا گیا کہ ''پاکستان کی عبوری حکومت وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کے بارے میں بہت جلد ایک نوٹ بھیجے گی۔ حکومت پاکستان کا اس سلسلے میں موقف یہ ہے کہ ریفرنڈم میں سرحدی عوام کے فیصلے کے بعد وائسرائے کا فرض ہے کہ وہ صوبہ سرحد کو پاکستان کے ساتھ پوری طرح منسلک کرے۔ اب آئینی لحاظ سے خان صاحب وزارت اعلیٰ کے عہدہ پر فائز نہیں رہ سکتا۔ اسے لازمی طور پر مستعفی ہو جانا چاہیے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہاں گورنری راج قائم کر دینا چاہیے۔''[13]

مرکزی حکومت کے اس غیر جمہوری اقدام کی وجہ سے صوبہ سرحد میں ایک ایسے شخص کی آمریت نافذ ہو گئی جس کے نزدیک جمہوریت، آزادی، انصاف اور اخلاق جیسے الفاظ کے کوئی معنی ہی نہیں تھے۔ وہ اقتدار حاصل کرنے اور پھر اسے برقرار رکھنے کے لئے ہر حربہ جائز تصور کرتا تھا۔ اس نے ہی قائداعظم اور لیاقت علی خان کو ڈاکٹر خان صاحب کی جانب سے 15/اگست کو ''آزاد پختونستان'' کے اعلان کئے جانے کے بارے میں گمراہ کن اطلاعیں پہنچائی تھیں۔ اس کی

اس مجرمانہ دروغ گوئی کا مقصد یہ تھا کہ صوبہ سرحد کا اقتدار فوراً ہی میرے حوالے کر دیا جائے اور جب 22/اگست 1947ء کو اسے اقتدار مل گیا تو پھر اس نے یکے بعد دیگرے ایسے آمرانہ بلکہ ظالمانہ اقدامات کئے کہ پاکستان کے سارے جمہوریت پسند عناصر ششدر رہ گئے اور انہیں یوں محسوس ہوا کہ صوبہ سرحد کے عوام کو فی الواقع ایک ''خونخوار بھیڑیئے'' کے سپرد کر دیا گیا ہے لیکن یہ بھیڑیا پنجابی نہیں تھا بلکہ یہ کشمیری نژاد ڈبل بیرل خان تھا۔ اس کا نام خان عبدالقیوم خان تھا۔ اس کے خوشامدی اور ممدوحین اسے ''خان اعظم'' اور ''شیر سرحد'' بھی کہتے تھے لیکن دراصل یہ نہ تو حقیقی خان تھا اور نہ ہی شیر تھا۔ یہ ایک نہایت بزدل، موقع پرست اور منافق شخص تھا۔ یہ 1937ء میں کانگرس کے ٹکٹ پر مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ جنگ کے دوران جب سرکردہ کانگرسی لیڈر جیلوں میں چلے گئے تو یہ کانگرس پارلیمانی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر بن گیا اور اس حیثیت سے اس نے قائداعظم محمد علی جناح، مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ یہ اپنے ہندو آقاؤں کی خوشنودی کے لئے قائداعظم، مسلم لیگ اور پاکستان کے لئے بہت توہین آمیز اور مضحکہ خیز الفاظ و اصطلاحات استعمال کیا کرتا تھا۔ اس نے اسی حیثیت سے 1945ء میں ''گولڈ اینڈ گنز آن دی پٹھان فرنٹیئر (Gold and Guns on the Pathan Frontier) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو بمبئی کے ایک ہندو اشاعتی ادارے نے شائع کی تھی اور جسے ڈاکٹر خان صاحب کے نام منسوب کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں اس نے خان برادران اور بالخصوص عبدالغفار خان کی بے پناہ تعریف و توصیف کی تھی اور اس کے بارے میں لکھا تھا کہ ''جس نے خدائی خدمت گار تحریک شروع کر کے صوبہ سرحد کے عوام کی بے مثال سیاسی اور معاشرتی خدمات سرانجام دی تھیں۔''

عبدالقیوم خان کے بیان کے مطابق عبدالغفار خان نے اس مقصد کے لئے کئی مرتبہ سارے صوبہ کا پیدل سفر کیا۔ وہ ہر گاؤں میں گیا اور وہاں اس نے عام فہم زبان میں باتیں کر کے لوگوں کو منظم کیا۔ اس کی باتوں میں جادو ہوتا تھا اس لئے بہت سے نوجوان سرخ وردیاں پہن کر اس کی زیر قیادت جمع ہو گئے اور انہوں نے عدم تشدد کے اصول کا پابند رہنے اور اپنے لیڈر کا ہر حالت میں وفادار رہنے کا حلف اٹھایا۔ اس طرح عبدالغفار خان نے پہلے تو ہر گاؤں، ٹپہ، تحصیل اور ضلع میں منتخب جرگے منظم کئے اور پھر پورے صوبے میں ایک منتخب جرگہ کی تشکیل کی۔ البتہ اس

کی رضا کار تنظیم کا انتخاب نہیں ہوتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''خدائی خدمت گار تنظیم کا کمانڈر انچیف یا سالار اعظم خان عبدالغفار خان خود نامزد کرتا تھا اور پھر یہ سالار اعظم اس تنظیم کے نچلے درجے کے عہدے داروں کی نامزدگی کرتا تھا برطانوی پروپیگنڈا بازوں کا کہنا تھا کہ یہ سرخپوش تنظیم دراصل بالشویک تنظیم کا ایک حصہ ہے اور جب کبھی کسی قبائلی علاقے میں کوئی گڑ بڑ ہوتی تھی تو برطانوی ڈھنڈورچیوں کے علاوہ برطانوی افسروں کی طرف سے بھی بار بار الزامات عائد کئے جاتے تھے کہ ان میں عبدالغفار خان کا ہاتھ ہے لیکن ان الزامات کی تائید میں کبھی کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا جاتا تھا۔ جو لوگ صوبہ سرحد کے حالات سے واقف تھے انہیں معلوم تھا کہ یہ الزامات سراسر مصنوعی اور بے بنیاد ہوتے تھے۔ عبدالغفار خان کو جلدی یہ احساس ہو گیا کہ پٹھانوں کی آزادی کا مسئلہ دراصل ہندوستان کی آزادی کے بڑے مسئلے کا ایک حصہ ہے۔ اس نے پہلے تو ہندوستان کے مسلمان سیاسی لیڈروں کو صوبہ سرحد کے حالات میں دلچسپی لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر جب اسے اس میں ناکامی ہوئی تو اس نے اگست 1931ء میں اپنی تنظیم کا انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ الحاق کرنے کا بہت ہی دانشمندانہ فیصلہ کر لیا اور پھر اس نے اپنے اس فیصلے پر کبھی افسوس کا اظہار نہیں کیا۔''[14]

خان عبدالقیوم خان کو مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان پر بہت اعتراض تھا کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ اس مطالبے کی بنا پر برصغیر کی سیاست میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور حکومت برطانیہ اس سے فائدہ اٹھاتی ہے اس کتاب میں اس نے لکھا تھا کہ ''مسلم لیگ قائداعظم جناح کے ذریعے چھ صوبوں پر اپنا حق جتاتی ہے۔ اس کی سکیم کے مطابق شمال مغربی پاکستان کی آزاد ریاست شمال مغربی صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے چار صوبوں پر مشتمل ہوگی اور شمال مشرقی پاکستان کی آزاد و خود مختار ریاست کی تشکیل بنگال اور آسام کے دو صوبوں کو ملا کر ہوگی۔ جناح مسلمانوں کے لئے حق خود ارادیت چاہتا ہے۔ مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ صرف اسی کی ذات کرے گی۔ کوئی استصواب نہیں ہوگا۔ اگر پنجاب، بنگال اور آسام کے غیر مسلم اکثریت والے علاقے ان پاکستانوں میں شامل ہوں گے تو اسے ذرا سی بھی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ اس کا اصرار ہے کہ برطانیہ کے اقتدار کے دوران ہی کانگرس کو اس کے مطالبے غیر مشروط طور پر تسلیم کر لینے چاہئیں۔ ابھی تک کسی نے اس امکان کی پیش بینی نہیں کی کانگرس وقتی طور پر ان مطالبات کو تسلیم کر

لے گی اور پھر جب اسے اقتدار مل جائے گا تو وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو جائے گی۔ اگر کانگرس ہوسِ اقتدار میں اندھی ہو کر بالآخر اس وعدے سے منحرف ہو گئی تو پھر اس معاہدے کو کون نافذ کرے گا؟ کیا ایسی ڈگری کی تعمیل کے لئے تیسرے فریق کا یہاں رہنا ضروری ہے؟ مشرقی صوبوں کی مسلم ریاست کس قسم کی ہو گی جہاں کی تقریباً آدھی آبادی غیر مسلموں کی ہے؟ کیا یہ صحت مند ریاست ہو گی، کیا یہ طاقتور ہو گی اور کیا اس میں امن قائم رہے گا؟ اگر ہندوستان کی آبادی کے ایک چوتھائی مسلمانوں کے لئے الگ ریاست یا ریاستوں کا قیام ضروری ہے تو مشرقی پاکستان کے غیر مسلموں کو، جن کی آبادی مسلمانوں کے تقریباً برابر ہے، اس حق سے کیسے محروم کیا جا سکتا ہے؟ شمال مغربی پاکستان کے بارے میں بھی اسی قسم کے سوالات اٹھتے ہیں۔ کیا پنجاب، جو اس ریاست کا سب سے بڑا ستون ہوگا ایک صحت مند مسلم ریاست کی صورت اختیار کر سکے گا جبکہ ہندوستان کے متصل علاقے میں رہائش پذیر 43 فیصد غیر مسلم آبادی اس ریاست کے خلاف ہو گی۔'' خان عبدالقیوم خان کو قومیتوں کے مسئلہ پر بھی مسلم لیگ کے رویے پر اعتراض تھا۔ اس نے لکھا کہ ''پاکستان کے اندر کی قومیتوں یا اکائیوں یعنی پٹھانوں، پنجابیوں، سندھیوں، بلوچیوں کا کیا بنے گا؟ کیا پٹھانوں کے آبائی وطن صوبہ سرحد اور قبائلی پٹی میں آباد لوگوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہوگا؟ کیا انہیں ہندوستان، پاکستان یا افغانستان میں شامل ہونے یا اگر وہ چاہیں تو خود اپنی مملکت قائم کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا؟ کیا اس صوبے کو باقی پاکستان کے ساتھ ووٹ ڈالنے اور ایک بہت بڑے غیر پٹھان علاقے کا چھوٹا سا حصہ بن جانے اور اس طرح غیر پٹھان رائے دہندگان کے سمندر میں اپنے آپ کو غرق کر دینے کو کہا جائے گا؟ بعض لوگ یہ بات سمجھتے نہیں یا اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں کہ صوبہ سرحد قبائلی پٹی، بلوچستان اور افغانستان کے علاقوں میں آباد پٹھان ایک قوم ہیں۔ ان سب کی زبان پشتو ہے۔ یہ ایک ہی مذہب اسلام کے سرگرم پیروکار ہیں اور ان کی ثقافت بھی ایک ہی ہے۔''[15]

خان عبدالقیوم خان نے اپنی اس کتاب کا جو پیش لفظ لکھا تھا اس پر 31 مارچ 1945ء کی تاریخ درج ہے لیکن اس نے اسی سال جب یہ محسوس کیا کہ صوبہ سرحد سمیت برصغیر کی مسلم رائے عامہ روز بروز مسلم لیگ کے حق میں ہو رہی ہے اور برطانیہ کو زود یا بدیر پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا تو اس نے یکا یک قلابازی کھائی اور مسلم لیگ اور پاکستان کا حامی بن گیا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 1945ء میں کانگرسی لیڈروں کی رہائی کے بعد اس تنظیم میں صوبائی یا کل ہند سطح پر اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ صوبائی سطح پر خان برادران کا ڈنکا بجتا تھا اور کل ہند سطح پر ابوالکلام آزاد جیسے عناصر پیش پیش تھے۔ اس وقت مسلم لیگ کو صوبہ سرحد میں ایسے حامیوں کی سخت ضرورت تھی جنہیں سیاست کا کوئی تجربہ ہو۔ چنانچہ لیگی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا اور یہ راتوں رات سرحد مسلم لیگ کا ایک سرکردہ لیڈر بن گیا۔ غالباً اس کا اندازہ یہ تھا کہ 1945-46ء کے عام انتخابات میں صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی کامیابی ہوگی اور یہ صوبائی وزیراعلیٰ بن جائے گا۔ اگرچہ اس کی یہ امید فوری طور پر تو بر نہ آئی لیکن 1946ء میں صوبہ سرحد کی مسلم رائے عامہ میں یکا یک جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کے پیش نظر اسے یقین ہو گیا کہ اقتدار کی نیلم پری بہت جلدی اس کے سامنے کورنش بجالائے گی۔ چنانچہ اس نے 1946-47ء میں صوبہ میں مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک کی قیادت کی اور پھر قیام پاکستان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد یعنی 22 اگست کو وزارت اعلیٰ کی گدی پر براجمان ہو گیا حالانکہ اسے ولی خان کے بیان کے مطابق صوبائی اسمبلی کے 50 ارکان میں سے صرف 17 کی حمایت حاصل تھی اور خالد بن سعید کی اطلاع کے مطابق مسلم لیگ پارٹی 15 ارکان پر مشتمل تھی اور کانگرس پارٹی کے ارکان کی تعداد 21 تھی۔ اس وقت تک بیشتر ہندو ارکان اسمبلی ترک وطن کر کے ہندوستان چلے گئے تھے۔ عبدالقیوم خان نے ایوان میں اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کانگرسی ارکان کے خلاف دھمکی، غنڈہ گردی، رشوت اور دوسرے وہ سارے حربے استعمال کئے جو ایک بد دیانت سیاسی لیڈر کر سکتا ہے مگر اسے خاصی دیر تک کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر اس نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی کہ اسمبلی کا ادارہ بالکل ختم کر کے ہر تین سال کے بعد ریفرنڈم کرایا جائے اور اس طرح جو لیڈر منتخب ہو اسے ساری انتظامیہ چلانے کے لئے تین یا چار رفقا منتخب کرنے کی اجازت دی جائے۔ بالفاظ دیگر وہ ابتدا سے ہی صوبہ سرحد کا آمر مطلق بننا چاہتا تھا۔ صوبائی گورنر سر جارج کننگھم کا بھی خیال تھا کہ شاید برصغیر کے مخصوص حالات میں قیوم خان کا مجوزہ نظام حکومت پارلیمانی نظام حکومت سے بہتر ہوگا مگر گورنر جنرل پاکستان قائد اعظم جناح نے قیوم خان کی اس تجویز اور گورنر کے اس خیال سے اتفاق نہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ صوبائی اسمبلی کو غیر معین عرصہ کے لئے توڑ دیا جائے۔ [16]

عبدالقیوم خان کو ابتدا میں کانگرسی ارکان اسمبلی کو توڑنے میں جو دقت پیش آئی غالباً اس

کی وجہ یہ بھی تھی کہ خان برادران نے تقسیم کے بعد پختونستان کے بارے میں اپنے رویے میں ترمیم کرلی تھی اور اس بنا پر یہ امکان نظر آنے لگا تھا کہ شاید خان عبدالغفار خان اور حکومت پاکستان میں کوئی سمجھوتہ ہوجائے گا۔ اب خان برادران کا اعلانیہ موقف یہ تھا کہ جب وہ آزاد پختونستان کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی الگ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرحد کو پاکستان کی ایک اکائی کی حیثیت سے مکمل خودمختاری دی جائے۔ پاکستان کے لئے صحیح معنوں میں وفاقی آئین مرتب کیا جائے جس کے تحت اس کی اکائیوں کو مکمل صوبائی خودمختاری کی ضمانت دی جائے اور اس طرح پٹھانوں کی معاشرتی وثقافتی زندگی کا تحفظ کیا جائے۔ اس قسم کے آئینی تحفظات کے بغیر پورے پاکستان پر پنجابیوں کا غلبہ قائم ہوجائے گا اور پٹھانوں اور دوسری اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق نہیں ملیں گے۔[17] پیارے لال اپنی کتاب (Thrown to the Wolves) میں لکھتا ہے کہ خان برادران کی پختونستان کے بارے میں اس نئی ترمیم شدہ پالیسی کا اعلان 3 اور 4 ستمبر 1947ء کو سردریاب میں ہوا جبکہ وہاں برصغیر کی تقسیم کے بعد صورتحال پر غور کرنے کے لئے صوبائی جرگوں، کانگرس پارلیمانی پارٹی، زلمے پختون، خدائی خدمت گاروں اور قبائلی علاقوں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا۔ بادشاہ خاں نے اس موقع پر اپنے مطالبہ پختونستان کی توضیح کرتے ہوئے کہا کہ اس مطالبہ سے مطلب یہ ہے کہ پٹھانوں کو پاکستان کے اندر ایک اکائی کی حیثیت سے اپنے داخلی معاملات کا انتظام کرنے کی پوری آزادی دی جائے۔ اس اجتماع میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں سے ایک قرارداد یہ تھی کہ یہ نئی ریاست شمال مغربی صوبہ سرحد کے موجودہ چھ باقاعدہ اضلاع اور ان دوسرے متصلہ علاقوں، جہاں پٹھان رہائش پذیر ہیں اور جو اپنی مرضی سے نئی ریاست میں شامل ہونا چاہیں گے، پر مشتمل ہوگی۔ یہ ریاست دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں پاکستان کی ڈومینین سے معاہدہ کرے گی۔ بادشاہ خان نے اس قرارداد کے حق میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں پختونستان کے قیام کے لئے ساری زندگی کام کرتا رہا ہوں۔ جب 1930ء میں خدائی خدمت گار تنظیم شروع کی گئی تھی تو اس کا مقصد پٹھانوں میں اتحاد قائم کرنا تھا۔ میں آج بھی انہی اصولوں کا پابند ہوں جن کی علمبرداری میں نے 1930ء میں کی تھی۔ لہٰذا میرا راستہ بالکل صاف ہے۔ میں اس راستے سے کبھی انحراف نہیں کروں گا خواہ میں اس دنیا میں تنہا رہ جاؤں۔[18]

گویا 2 رجون سے لے کر 4 رستمبر تک خان عبدالغفار خان پختونستان کے بارے میں تین مختلف موقف پیش کر چکا تھا۔ اس کا کانگرس ورکنگ کمیٹی کی وساطت سے پیش کردہ پہلا موقف یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں عوام کو آزاد پختونستان کے لئے ووٹ دینے کا حق بھی دیا جائے۔ یہ موقف درحقیقت منافقانہ تھا کیونکہ ماؤنٹ بیٹن کے بیان کے مطابق ڈاکٹر خان صاحب نے نہرو کو یقین دلا رکھا تھا کہ وہ بعد میں انڈین یونین میں شامل ہو جائے گا۔ اس کا 18 رجون کو جناح سے ملاقات کے دوران دوسرا موقف یہ تھا کہ ہمیں پختونستان کی آزادی کا اس شرط پر اعلان کرنے کی اجازت دی جائے اگر پاکستان کا آئین ہماری مرضی کے مطابق ہوا تو ہم اس میں شامل ہو جائیں گے اور پھر 4 رستمبر کو اس کا تیسرا موقف یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے موجودہ اضلاع اور پٹھانوں کے دوسرے متصلہ علاقوں پر مشتمل ایک نئی پٹھان ریاست کی تشکیل ہونی چاہیے جو پاکستان کی ڈومینین سے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں معاہدہ کرے گی۔ بالفاظ دیگر اس مجوزہ پٹھان ریاست اور پاکستان کے درمیان محض کنفیڈرل تعلقات قائم ہوں گے۔ چونکہ حکومت پاکستان کے لئے یہ تیسرا موقف بھی ہرگز قابل قبول نہیں تھا اس لئے صوبہ سرحد میں پختونستان کے شوشہ کی بنا پر پیدا شدہ سیاسی کشیدگی بدستور جاری رہی۔

باب:7

قیوم خان کی فسطائیت، غفار خان کی گرفتاری اور بھابڑا فائرنگ

صوبہ سرحد کی اس کشیدہ صورت حال کے دوران 30 ستمبر 1947ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستان کی رکنیت کی درخواست زیر بحث آئی تو افغانستان واحد ملک تھا جس نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔ اس کے نمائندے حسین عزیز نے پاکستان کے مخالفت کی وجہ یہ بتائی کہ ''ہم شمال مغربی سرحدی صوبہ کو اس وقت تک پاکستان کا ایک جزو تسلیم نہیں کر سکتے جب تک وہاں کے عوام کو یہ موقع نہیں دیا جاتا کہ ہر قسم کے اثر ورسوخ سے آزاد ہو کر یہ فیصلہ کریں کہ وہ آزاد ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ حکومت افغانستان کا یہ موقف اس کے 1944ء، 1946ء اور 1947ء کے اس موقف سے مختلف تھا کہ دریائے سندھ تک کے علاقے کو افغان مادر وطن کی گود میں واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ افغان حکمرانوں کے موقف میں تبدیلی کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ انہیں جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ صوبہ سرحد اور اس سے متصل قبائلی علاقوں کے عوام افغانستان میں مدغم ہونے کے خواہاں نہیں ہیں۔ بلاشبہ 1919ء میں صوبہ سرحد اور وزیرستان کے عوام نے امان اللہ خان کی سامراج دشمن حکومت کی امداد کی تھی لیکن اس امداد کی بنیاد ''پٹھانیت'' پر نہیں تھی بلکہ سامراج دشمنی پر تھی۔ برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی اسی جوش جذبہ کے تحت مخالف امان اللہ خان کی حمایت کی لیکن 1929ء میں جب نادر شاہ برطانوی سامراج کی کھلم کھلا امداد سے برسر اقتدار آیا تو سرحد میں اس کی حمایت میں اس غلط تاثر کے تحت عارضی طور پر جوش وجذبہ پیدا ہوا تھا کہ وہ تخت شاہی امان اللہ خان کے سپرد

کردے گا لیکن جب وہ اقتدار سے خود ہی چمٹا رہا تو صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں اس کی حمایت بہت حد تک کم ہوگئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ برطانوی سامراج کا پٹھو تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے پڑدادا سردار سلطان محمد خان نے معمولی عہدے اور مالی منفعت کے عوض پشاور کی وادی کو سکھا شاہی کے حوالے کر دیا تھا۔ 1947ء میں ظاہر شاہ، داؤد خان، ہاشم خان اور شاہ ولی خان کے علاوہ دوسرے جو لوگ کابل میں برسر اقتدار تھے وہ اسی غدار خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور سرحد کے عوام نے اپنی تاریخ کا یہ تلخ ترین تجربہ فراموش نہیں کیا ہوا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ خود خان عبدالغفار خان بھی صوبہ سرحد کے افغانستان کے ساتھ مدغم ہونے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے گاندھی کی شہ پر 2ر جون 1947ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کی وساطت سے مجوزہ ریفرنڈم میں جو تیسرا سوال اٹھانے کا مطالبہ کیا تھا وہ ''آزاد پختونستان'' کے بارے میں تھا۔ کانگرس کی اس قرارداد میں اس علاقے کے افغانستان کے ساتھ ملنے کا کوئی ذکر نہیں تھا کیونکہ جواہر لال نہرو صوبہ سرحد میں افغانستان کی بے جا مداخلت اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم کے سخت خلاف تھا اور ڈاکٹر خان صاحب نے اسے بتایا ہوا تھا کہ آزاد پختونستان کے قیام کے بعد ہم انڈین یونین میں شامل ہو جائیں گے۔ 21ر جون کی بنوں کی قرارداد میں بھی صرف ''آزاد پختونستان'' کا مطالبہ تھا۔ اس میں اس علاقے کی افغانستان میں شمولیت کے امکان کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ پھر 2ر جولائی کو ڈاکٹر خان صاحب نے نہرو کے نام ایک خط میں یقین دلایا تھا کہ ''ہم نے کبھی افغانستان کے ساتھ شامل ہونے کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہے کہ حکومت افغانستان نے اس سلسلے میں سرکاری طور پر حکومت ہندوستان سے رابطہ پیدا کیا ہے۔ قدرتی طور پر اس بات نے ہمیں ناقابل رشک پوزیشن میں ڈال دیا ہے۔ حکومت افغانستان موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

اولف کیرو، ڈاکٹر خان صاحب سے ایک بات چیت کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''ڈاکٹر خان صاحب کا تاریخی ہیرو کابل کا کوئی حکمران نہیں تھا۔ اس کا ہیرو شیر شاہ سوری تھا جس نے دہلی سے کابل پر حکومت کی تھی اور جو عوامی مسائل کے بارے میں موقع پر پہنچ کر فیصلے کیا کرتا تھا۔'' خان برادران کابل کے بادشاہ ظاہر شاہ سے متاثر نہیں تھے بلکہ وہ احمد آباد کے مہاتما گاندھی کے عقیدت مند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 30ر جولائی کو گاندھی نے اس الزام کی تردید کی تھی کہ بادشاہ

خان افغانستان کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ گاندھی نے کہا تھا کہ "میرے خیال میں بادشاہ خان پس پردہ سودا بازی کرنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ کبھی صوبہ سرحد کو افغانستان میں مدغم ہونے کی اجازت نہیں دے گا" اور پھر 4 رستمبر کو خدائی خدمت گار تنظیم نے سرد ریاب میں جو قرارداد منظور کی تھی اس میں پختونستان کی نئی ریاست کے پاکستان کے ساتھ کنفیڈرل تعلقات قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اس ریاست کا افغان مادر وطن کے ساتھ الحاق ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ صوبہ سرحد کے عوام اور کانگرس کی قیادت دونوں ہی اس علاقے کے افغانستان کے ساتھ ادغام کے خلاف تھے۔ عوام اس لئے خلاف تھے کہ وہ تاریخی وجوہ کی بنا پر اپنے آپ کو پاکستان کا ایک جزو تصور کرتے تھے۔ انہیں افغانستان کی قرون وسطی کی قبائلی مملکت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کانگرسی قیادت اس لئے خلاف تھی کہ وہ اپنے آپ کو برصغیر کے ایک ایک انچ کا قانونی وارث تصور کرتی تھی۔ گاندھی نے "آزاد پختونستان" کا شوشہ تو محض اس لئے چھوڑا تھا کہ یہ علاقہ ڈاکٹر خان صاحب کے بیان کے مطابق بعد میں انڈین یونین میں شامل ہو جائے گا۔

جب اکتوبر 1947ء کے اوائل میں حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا کہ وزیرستان کے قبائلی لشکر کو کشمیر کے حریت پسندوں کی امداد کے لئے یلغار کرنے کی اجازت دی جائے گی تو صوبہ سرحد اور اس سے متصلہ سارے قبائلی علاقوں کی صورت حال افغانستان کے لئے اور بھی زیادہ غیر موافق ہو گئی۔ ان دنوں سرحد کے باقاعدہ اضلاع اور قبائلی علاقوں میں پاکستان اور کشمیر کے لئے اس قدر جوش وجذبہ پایا جاتا تھا کہ اس کے سامنے افغان یا پٹھان شاونزم کی ذرا سی بھی اہمیت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ 20 راکتوبر کو افغانستان کے نمائندے حسین عزیز نے پاکستان کے خلاف اپنا منفی ووٹ واپس لے لیا اور امید ظاہر کی کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان سفارتی ذرائع سے جو گفت وشنید ہو رہی ہے اس کے نتیجے میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ پھر نومبر میں افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ کا ایک ایلچی سردار نجیب اللہ کراچی آیا جہاں اس نے پاکستانی حکام سے بات چیت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وزیرستان کے قبائلی لشکر کی کشمیر میں یلغار ہو چکی تھی، قبائلیوں اور ہندوستان کی سکھ افواج کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی اور اس وقت تک سینکڑوں قبائلی کشمیر کے اس جہاد میں جاں بحق ہو چکے تھے۔ سردار نجیب اللہ خان کراچی میں چھ دن بات چیت کرنے کے بعد واپس کابل پہنچا تو اس نے ریڈیو سے جو تقریر نشر کی اس میں بتایا کہ افغانستان

نے پاکستان سے تین مطالبات کئے ہیں۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ جن قبائلی علاقوں میں پٹھان اور افغان آباد ہیں انہیں ایک آزاد وخودمختار صوبہ بنا دیا جائے۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ افغانستان کو سمندر تک رسائی کے لئے یا تو مغربی بلوچستان میں مستقل راستہ دیا جائے یا کراچی میں ایک آزاد افغان زون الاٹ کیا جائے اور تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان اور افغانستان کو ایک معاہدہ کرنا چاہیے جس میں یہ قرار دیا جائے کہ اگر دونوں فریقوں میں سے کسی فریق پر حملہ ہوا تو دوسرے فریق کو غیر جانبدار رہنے کی اجازت ہوگی۔ چونکہ ان مطالبات میں دریائے سندھ تک کے علاقے پر مملکت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا تھا اور قبائلی علاقے کے بھی افغانستان میں مدغم کرنے کا کوئی مطالبہ شامل نہیں تھا بلکہ اس کے بارے میں تجویز صرف یہ تھی کہ اسے آزاد وخودمختار صوبہ بنایا جائے۔ لہٰذا افغان ایلچی کے بظاہر سخت رویے کے باوجود کراچی میں یہ امید قائم رہی کہ افغانستان کی ہمسایہ اسلامی مملکت کے ساتھ تعلقات بہتر ہو جائیں گے۔

لیکن بعد میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان دنوں ممالک کے درمیان تعلقات بہتر ہونے کی بجائے خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ بظاہر اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ عبدالقیوم خان نے جنوری 1948ء میں سات کانگرسی ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل کر کے صوبہ میں ایسا آمرانہ نظام حکومت نافذ کر دیا تھا کہ خان عبدالقیوم خان اور حکومت پاکستان کے درمیان مفاہمت کی ساری امیدیں خاک میں مل گئی تھیں اور اس کے پختونستان سٹنٹ کو تقویت ملی تھی۔ عبدالقیوم خان نے اس قسم کے آمرانہ نظام کی تیاری دراصل 22 راگست کو اقتدار سنبھالنے کے فوراً ہی بعد شروع کر دی تھی۔ اس کے سرکاری ذرائع ابلاغ کا پہلا الزام یہ تھا کہ ''ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کی برطرفی کے بعد سرخپوشوں نے وسیع پیمانے پر انتقامی کاروائی شروع کر دی ہے۔ انہوں نے نوشہرہ کے علاقے میں پختونستان کا پرچم لہرایا ہے اور وہ چارسدہ اور شب قدر میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔'' ایک اور رپورٹ یہ تھی کہ ''خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب، افغانستان کے بادشاہ، اس کے وزیر معاشیات اور ڈائریکٹر براڈ کاسٹنگ سے مسلسل رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں اور افغان حکمرانوں کو صوبہ سرحد کی سیاسی صورت حال سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔'' اس رپورٹ کی تائید میں ایک سرخپوش لیڈر عاشق شاہ کو گرفتار کر کے اس پر الزام عائد کیا گیا کہ ''اسے ایسے موقع پر پکڑا گیا جبکہ وہ پختونستان کا لٹریچر

خفیہ طور پر افغانستان لے جا رہا تھا۔" 13 ستمبر کو تیسری رپورٹ یہ تھی کہ 2466 سرخپوشوں کا چارسدہ میں اجتماع ہوا ہے جس میں پختونستان کا پرچم لہرانے کی رسم ادا کی گئی ہے۔ 19 ستمبر کو ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ضلع پشاور کے موضع کوچیاں میں بھی پختونستان کا پرچم لہرانے کی رسم ادا کی گئی ہے اور اس موقع پر خان عبدالغفار خان نے پختونستان کے حق میں تقریر کی ہے اور پھر مزید کئی دن تک سرکاری ذرائع کے حوالے سے اس مضمون کی خبریں چھپتی رہیں کہ چارسدہ میں پھر پختونستان کا پرچم لہرایا گیا ہے اور خان عبدالغفار خان کے بھتیجے جہانزیب نے پختونستان کے حق میں تقریر کی ہے۔ کسی نامعلوم مقام پر سرخ پوشوں کا ایک اجتماع ہوا ہے جس میں پاکستان مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف ایک تنقیدی نظم پڑھی گئی ہے۔ ایک اور نامعلوم مقام پر ڈاکٹر خان صاحب کے بیٹے عبداللہ نے اعلان کیا ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس پٹھانوں کی غلامی کو برداشت نہیں کرے گی۔ بعض دوسرے سرخپوش لیڈروں نے پختونستان کے پرچم کا تحفظ کرنے کا حلف اٹھایا ہے اور اعلان کیا ہے کہ اگر جناح نے خان عبدالغفار خان کے مطالبہ پختونستان کو تسلیم نہ کیا تو "خوفناک انقلاب" برپا کیا جائے گا۔ شہروں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ زمینداروں کو قتل کر دیا جائے گا اور ان کی زمینیں زلمے پختون کے ارکان میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ سرخپوش لیڈروں نے صوبے کے طول و عرض کا دورہ کر کے لوگوں کو تلقین کی ہے کہ وہ مہاجر فنڈ میں چندہ نہ دیں کیونکہ مہاجرین صوبہ سرحد میں فتنہ پیدا کر دیں گے۔ انہوں نے یہ پروپیگنڈا بھی کیا ہے کہ پاکستان برطانیہ کی پیداوار ہے اور اسے اب بھی برطانوی حکام چلا رہے ہیں۔ خان عبدالغفار خان نے اپنے ایک دورے میں پٹھانوں کو تلقین کی ہے کہ پختونستان کے حصول کی جدوجہد کے لئے تیار رہیں۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ قبائلی علاقہ اور افغانستان ان کے مطالبہ کی حمایت پر آمادہ ہیں۔ اس نے اس دورے پر سول نافرمانی کی تحریک کی تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں اور اس سلسلے میں اپنی تنظیم کے کارکنوں سے رپورٹیں طلب کی ہیں۔ اس کی مجوزہ تحریک میں دہشت گردی، سنگین جرائم کا ارتکاب اور مواصلات کا انقطاع شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے سردریاب میں سرخپوش رضاکاروں کی تربیت شروع ہو گئی ہے اور پشاور میں حکومت ہندوستان کے نمائندہ کے۔ ایل۔ پنجابی کو اعتماد میں لے لیا گیا ہے اور یہ سارا کام اس کے مشورے سے ہو رہا ہے۔ ضلع پشاور کے موضع چکانی میں امیر محمد خان آف ہوتی، عبدالغفار خان اور قاضی عطاءاللہ نے تقریریں کی ہیں جن

میں انڈین نیشنل کانگرس کی تعریف کی گئی ہے۔ مسلم لیگ کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے اور آزاد پختونستان کی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ پشاور اور مردان کے اضلاع میں سرخپوشوں کے کئی اجتماعات ہوئے ہیں جن میں پختونستان کا پرچم لہرانے کے بعد یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ انگریزوں کو پاکستان سے نکال دیا جائے۔ شریعت کا قانون نافذ کیا جائے اور پٹھانوں کو ایک آزاد ریاست دی جائے۔ سرخپوش کارکنوں نے دیہات کا دورہ کر کے عوام الناس کو کشمیر کے جہاد میں شرکت نہ کرنے کی بھی تلقین کی ہے۔

ان رپورٹوں میں صداقت کتنی تھی اور جھوٹ یا مبالغہ کا عنصر کتنا تھا اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ پورے پاکستان میں خان عبدالغفار خان اور اس کی خدائی خدمت گار تنظیم کے خلاف اس یکطرفہ پروپیگنڈا کے دوران خان عبدالقیوم خان نے جن سرخپوش لیڈروں اور کارکنوں کو پکڑا تھا انہیں یا تو مقدمہ چلائے بغیر ہی نظر بند کر دیا گیا تھا یا ان کے خلاف الزامات کی فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت جرگہ میں سرسری سماعت کر کے انہیں سزائیں دے دی تھیں۔ چونکہ خان برادران نے 14 راگست 1947ء کے بعد بھی اپنی غیر حقیقت پسندانہ سیاست کے باعث پاکستان کے عوام میں اپنے بارے میں شدید شکوک وشبہات پیدا کر رکھے تھے اس لئے عام طور پر ان چیزوں کو مبنی بر صداقت سمجھا گیا اور سرخپوشوں کے خلاف ہر کاروائی کو صحیح اور جائز قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس بنا پر عبدالقیوم خان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے اپنی ان آمرانہ کاروائیوں کے دوران مسلم لیگی لیڈروں اور کارکنوں کو بھی معاف نہیں کیا جنھوں نے تحریک پاکستان کے دوران گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے جو کوئی بھی اس کے اقتدار کے لئے خطرے کا باعث ہو یا کبھی خطرے کا باعث بن سکتا ہو، اسے پکڑ لو اور مقدمہ چلائے بغیر غیر معین عرصے کے لئے جیل میں نظر بند کر دو۔ جب یہ اس قسم کی جابرانہ کاروائیاں کرتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ یہ ایک باؤلا کتا ہے جو بلا امتیاز ہر ایک کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس کے پاس صوبہ سرحد کے غریب عوام کی معاشی ومعاشرتی ترقی کے لئے پروگرام نہیں تھا۔ اس کا صرف ایک ہی پروگرام تھا اور وہ یہ کہ ''ڈنڈا چلاؤ اور حکومت کرو۔'' خان عبدالغفار خان اور اس کے حواریوں کی سرگرمیاں غالباً قابل اعتراض تھیں کیونکہ وہ نہ تو افغانستان کے پاکستان دشمن پروپیگنڈے کی مذمت کرتے تھے اور نہ ہی پختونستان کا سٹنٹ ترک کرتے تھے۔

اگر وہ پختونستان کی اصطلاح کو چھوڑ کر وفاقی پاکستان کے سارے صوبوں کے لئے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کا مطالبہ کرتے تو کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر انہوں نے یہ حقیقت پسندانہ طریقہ سیاست اختیار نہ کیا بلکہ وہ اپنی پرانی علاقائی اور پاکستان دشمن سیاست پر مصر رہے۔ انہوں نے کبھی پاکستان کے قیام کے تاریخی پس منظر کا سائنسی و معروضی تجزیہ نہیں کیا تھا اور غالباً یہ اس کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ مسلم لیگ برطانیہ کے پٹھوؤں کی جماعت ہے اور پاکستان برطانیہ کی حرامی اولاد ہے۔ اگر خان عبدالقیوم خان ان کی اس غلط سیاست کا صحیح سیاسی تدابیر سے مقابلہ کرتا تو پاکستان اس مشکل دور میں کئی ایک داخلی و خارجی مسائل سے دو چار نہ ہوتا لیکن اس نے ان سے سیاسی و جمہوری طور پر نمٹنے کی بجائے انہیں جبر و تشدد سے کچلنے کی جو پالیسی اختیار کی اس کی بنا پر نہ صرف وہ سیاسی طور پر زندہ رہے بلکہ ان کا پختونستان سٹنٹ بھی موت سے ہمکنار نہ ہوا اور اس طرح خان عبدالقیوم خان عملی طور پر ان کا سیاسی محسن اعظم ثابت ہوا۔

خان عبدالولی خان لکھتا ہے کہ ''صوبائی حکومت کی ان تمام شدید قسم کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود خدائی خدمت گاروں نے مصالحانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک موقع ایسا بھی آیا جبکہ افہام و تفہیم کی منزل صاف دکھائی دے رہی تھی لیکن قیوم خان کی سربراہی میں مقامی لیڈر شپ نے، جو وزارتوں اور ان کے دیگر لوازمات پر قابض ہو چکی تھی اور متروکہ جائیدادوں پر قبضہ و لوٹ مار میں مصروف تھی، محسوس کیا کہ خدائی خدمت گار اور مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کے درمیان کسی قسم کا سمجھوتہ ان کے ناجائز اقتدار کے خاتمہ کا باعث ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے اس گفت و شنید کو سبوتاژ کرتے ہوئے کشیدگی اور مناقشت کی فضا پیدا کر دی۔ کہا یہ گیا کہ اگر حکومت خدائی خدمت گاروں کے پاس رہنے دی گئی تو اس سے کشمیر کی تحریک پر برا اثر پڑے گا کیونکہ کشمیر جانے کے لئے قبائلیوں کو سرحد سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ لہٰذا انہوں نے تمام غیر مسلم لیگیوں کو ہندوستان کے ایجنٹ قرار دیا اور ہر چیز اسلام اور پاکستان کے نام پر روا رکھی گئی حالانکہ اقتدار کی شدید خواہش ان کے ذہن پر سب سے زیادہ سوار تھی۔ قومی مفاد یا عام آدمی کی بہبود کبھی بھی ان کے غور و فکر کے موضوع نہ تھے۔ انگریزوں کی پیروی میں روپے اور بندوق (گن اینڈ گولڈ) کی پالیسی اختیار کی گئی اور خدائی خدمت گاروں کی طرف

سے خالص جذبہ حب الوطنی اور نیک نیتی کے تحت تعاون کی پیش کش کو ٹھکرا کے باہمی کشیدگی کا ایک ماحول پیدا کر دیا گیا۔''[1]

خالد بن سعید کے بیان سے عبدالولی خان کے اس بیان کی بہت حد تک تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ خان عبدالقیوم خان بھی عبدالغفار خان اور صوبائی کانگرس کے بارے میں وہی غلط کر رہا تھا جو برطانوی ہوم سیکرٹریز کیا کرتے تھے یعنی یہ کہ سرحد میں کانگرس سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے کچل دیا جائے۔ قیوم خان کی کانگرس کے بارے میں اس پالیسی کی وجہ اس کے اس خدشہ میں مضمر تھی کہ اگر حکومت پاکستان اور خان برادران کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو گیا تو اسے سرحد میں انتہائی اہم مقام سے محروم ہونا پڑے گا۔ اس امر کی واضح شہادت موجود ہے کہ خان عبدالغفار خان، جو کراچی میں جناح سے ملاقات کر چکا تھا، مسلم لیگی لیڈروں کی طرف دست تعاون بڑھا رہا تھا اور انہیں یقین دلا رہا تھا کہ وہ پاکستان کا وفادار رہے گا۔ صوبائی گورنر نے بھی جناح کے نام اپنے ایک نوٹ میں لکھا تھا کہ ''ان دنوں سرحد میں کسی کی جانب سے بھی پٹھانستان کو ایک سنجیدہ مطالبہ کے طور پر پیش نہیں کیا جا رہا ہے اور کانگرسی لیڈروں میں سے کوئی بھی پاکستان کے بارے میں غدارانہ جذبات کا حامل نہیں ہے۔ اگر خان عبدالغفار خان سے ہنر مندی کے ساتھ سلوک نہ کیا گیا یا اسے غیر ضروری طور پر ناراض کیا گیا تو اس امر کا امکان ہے کہ وہ مستقبل میں سنگین مشکل پیدا کرے گا۔ پٹھانستان کی تحریک میں صرف اس حد تک حقیقت ہے کہ یہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری عوام اپنے آپ کو پنجاب سے منسلک کرنا نہیں چاہتے۔ انہیں خدشہ ہے کہ پنجاب ان پر پوری طرح غالب آ جائے گا۔'' خالد بن سعید مزید لکھتا ہے کہ ''گورنر کی بڑی دیر سے کوشش یہ تھی کہ کانگرس کی پارٹی کے دائیں بازو کے ارکان اور مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع شدہ خوانین، پیشہ ور افراد اور دیہاتیوں کا ملاپ ہو جائے۔ لیکن کسی نے اس کے اس دانشمندانہ مشورے اور انتباہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور اس طرح جناح کے عہد میں ہی سرحد میں مستقبل کے تصادم کے بیشتر بیج بو دیئے گئے تھے۔''[2]

خان عبدالغفار خان فروری 1948ء میں کراچی میں گیا تھا اور غالباً اسی زمانے میں اس نے جناح سے ملاقات کی تھی۔ 5 مارچ 1948ء کو اس نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں حلف وفاداری اٹھانے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں کہا کہ ''میں نے انہیں صاف طور پر بتایا کہ بے شک

میری رائے اور میرا سیاسی عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم نہ ہو کیونکہ آج تک ہم نے ہندوستان میں یہ کھیل دیکھا ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں نوجوان، بوڑھے، بچے اور مرد اور عورتیں قتل کئے جا چکے ہیں اور تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ میری دیانت دارانہ اور مخلصانہ رائے تھی کہ ہندوستان کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے۔ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرنے چاہئیں لیکن اب تو یہ ہو چکا، اب تو جھگڑا ختم ہے۔"[3] تاہم اس نے اپنی اس تقریر میں سردریاب کی 4 ستمبر کی قرارداد کا بھی اعادہ کیا اور مطالبہ کیا کہ پاکستان کے اندر ایک خود مختار پختونستان قائم ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ "ہمارے پٹھانستان کا کیا مطلب ہے؟ میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔ اس صوبہ کے لوگ سندھی کہلاتے ہیں اور ان کے ملک کا نام سندھ ہے۔ اسی طرح بنگالی ہیں اسی طرح شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے۔ ہم سب ایک ہیں اور ہماری زمین پاکستان کے اندر ہے۔ ہم بھی یہ چاہتے ہیں کہ محض ملک کا نام لینے سے ہی پتہ چل جائے کہ یہ پختونستان کی سرزمین ہے۔ کیا یہ شریعت اسلام کے تحت گناہ ہے۔ پٹھان ایک فرقے کا نام ہے اور ہم اپنے ملک کا نام پختونستان رکھیں گے۔ ہندوستان کے لوگ ہمیں پٹھان کہا کرتے تھے اور ایرانی ہمیں افغان کہتے ہیں۔ ہمارا اصلی نام پختون ہے۔ ہم پختونستان چاہتے ہیں اور ہم ڈیورنڈ لائن کے اس جانب رہنے والے سارے پٹھانوں کو پختونستان میں متحد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں ہماری امداد کریں۔ اگر آپ دلیل دیں گے کہ اس طرح پاکستان کمزور ہو جائے گا تو میں کہوں گا کہ پاکستان "ایک علیحدہ اکائی" کے وجود میں آنے سے کمزور نہیں ہوگا۔ یہ مضبوط ہوگا۔"[4]

اگلے دن یعنی 6 مارچ کو صوبہ سرحد کے کسان جرگہ نے، جس کا خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمت گار تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس مقصد کے لئے عوامی مہم شروع کی کہ فصل کی بٹائی چھڑائی کے موقع پر ہی کی جائے، بے گار بند کی جائے اور زمینداروں کے مسلح جتھوں کو توڑا جائے مگر اسلام اور پاکستان کے اجارہ دار خان عبدالقیوم خان کو غریب کسانوں کے ان مطالبات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اسی دن کسان جرگہ کو غیر قانونی قرار دے کر اس کے ہزاروں ارکان کو گرفتار کر لیا۔ عبدالغفار خان نے اپنی اس تقریر کے تین دن بعد 8 مارچ کو اپنی مجوزہ پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا اعلان کیا جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ پاکستان کا وفاقی ڈھانچہ آزاد سوشلسٹ ری پبلکوں (Republics) کی یونین کی صورت میں تعمیر ہونا چاہیے۔

جب اس کے چند دن بعد وہ واپس پشاور پہنچا تو عبدالقیوم خان نے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف پروپیگنڈا مہم کو پہلے سے زیادہ تند و تیز کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ عبدالغفار خان دستور ساز اسمبلی میں حلف وفاداری اٹھانے کے بعد بظاہر پاکستان کے حق میں اور پاکستانی لیڈروں سے مفاہمت کی باتیں کرتا ہے لیکن پس پردہ اس نے پختونستانی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ تیز کر دی ہیں۔ اس نے صوبہ کا طوفانی دورہ کیا ہے جس میں اس نے پاکستان کی بقا کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے اسے ریت کا ایک ایسا پل قرار دیا ہے کہ جو ایک ہی ٹھوکر سے منہدم ہو سکتا ہے۔ اس کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کا رویہ بھی اسی قسم کا ہے۔ وہ پاکستان کے مقابلے میں پختونستان اور فقیر ایپی کی تعریف کرتا ہے۔ دو ماہ قبل یعنی جنوری 1948ء میں افغانستان کے وزیر اعظم نے عبدالغفار خان کو خطوط اور پیسے بھیجے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی رپورٹوں کے پیش نظر قائداعظم جناح نے اپریل میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا جس کے دوران انہوں نے 20/اپریل کو پشاور کے جلسہ عام میں جو تقریر کی اس میں سرحدی عوام کو مشورہ دیا کہ وہ موجودہ سنگین ہنگامی حالات میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی رکھیں اور نزاعات و صوبہ پرستی سے احتراز کریں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اشارۃً یہ بھی بتایا کہ وہ عبدالقیوم کی وزارت سے بھی خوش نہیں اور اس کے خلاف کوئی تعزیری اقدام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ ''مجھے معلوم ہے کہ ہم میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو بدعنوانی، رشوت ستانی اور اقربا نوازی کے مجرم ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت عیب و خطا سے پاک ہے۔ یقین مانیے ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔ آپ کی حکومت، آپ کا صوبہ، آپ کی وزارت اور آپ کے سرکاری ملازمین ہماری نظر میں ہیں۔ سب کچھ ہم پر پوری طرح سے روشن ہے اور اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم بہت جلد اس کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اپنے جسد سیاست سے زہر کو باہر نکال پھینکیں گے لیکن آپ کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے اور ہمیں موقع اور معقول وقت دینا چاہیے۔''[5] سرحد کے عوام نے تو اپنے قائداعظم کی اس ہدایت پر خان عبدالقیوم خان کے بارے میں تحمل کا مظاہرہ کیا لیکن خان عبدالقیوم خان مرکزی حکومت کے بعض سینئر ارکان کی شہ پر پہلے سے بھی زیادہ شیر ہو گیا جبکہ پنجاب کے بعض مفاد پرست حلقے بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

مئی 1948ء کے اوائل میں خان عبدالغفار خان کراچی گیا تو اس نے 7/مئی کو سندھ

کے جی۔ ایم۔ سید، بلوچستان کے عبدالصمد اچکزئی اور مشرقی بنگال کے بعض ہندو کانگرسی لیڈروں کے ساتھ مل کر ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کا باقاعدہ اعلان کیا جس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی رکھا گیا۔ اس پارٹی کا پروگرام خان عبدالغفار خان کے متذکرہ منشور کے مطابق یہ تھا کہ سارے لسانی گروپوں کو مکمل خودمختاری دی جائے اور ہمسایہ ممالک سے ثقافتی تعلقات قائم کئے جائیں۔ پنجاب میں اس پارٹی کی تشکیل کا بہت غیر موافق ردعمل ہوا کیونکہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کا بظاہر تاثر یہ تھا کہ یہ تنظیم پاکستان کے دشمن عناصر نے وطن عزیز کی تباہی کے لئے بنائی ہے لیکن ان کی مخالفت کی اصل وجہ یہ تھی کہ سابق کانگرسی عناصر کی یہ جماعت پنجابیوں کے غلبہ کے سدباب کے لئے وجود میں آئی تھی۔ پاکستان کے غیر پنجابی صوبوں کے ہر مکتب فکر کے لیڈروں اور عوام کو ابتدا ہی میں پنجاب کے غلبہ کا زبردست خدشہ لاحق ہو گیا تھا۔ خان عبدالغفار خان نے اپنی اس نئی پارٹی کا اعلان کرنے کے چند دن بعد کراچی سے واپس آ کر صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو خان عبدالقیوم خان کے ذرائع اطلاعات نے اس کی تقریروں کی جو سرکاری رپورٹیں مرتب کیں ان میں سرحدی گاندھی سے یہ باتیں منسوب کی تھیں۔

1۔ پاکستان ایک ریت کا پل ہے جو ایک ٹھوکر کی ضرب برداشت کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔

2۔ جناح انگریزی حکومت کا مقرر کیا ہوا گورنر جنرل ہے۔ اس کا عہدہ عوامی نمائندگی کا نہیں ہے بلکہ وہ انگریزی حکومت کا ملازم ہے۔ اس کے ذریعے آج بھی ہم پر انگریز حکومت کر رہا ہے۔

3۔ جناح بھارت کے وزیروں کی نسبت دگنی تنخواہ لیتا ہے حالانکہ پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ ایک جگہ خان عبدالغفار خان نے یہ بھی کہا کہ جناح کی تنخواہ بھارت کے انگریز گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔

4۔ بھارتی حکومت نے جن انگریز افسروں کو ملازمت سے فارغ کر دیا تھا انہیں پاکستان میں بھرتی کر لیا گیا ہے۔

5۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اس ملک کے غریبوں پر خرچ کا بوجھ بنی ہوئی ہے۔ وہ فضول باتوں میں وقت ضائع کرتی رہتی ہے اور کوئی مفید کام نہیں کرتی۔ اس لئے میں اس کے تضیع اوقات سے تنگ آ کر واپس چلا آیا ہوں تا کہ اپنے بھائیوں کی کچھ

خدمت کرسکوں۔

6۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں مملکتیں ایک ہی دن قائم ہوئی تھیں لیکن ہندوستان نے اپنا آئین بنالیا ہے اور پاکستان نے اپنا آئین بنانا ابھی شروع ہی نہیں کیا۔

7۔ پاکستان کی حکومت اصل پاکستان کی نمائندہ نہیں ہے۔ اس پر باہر سے آئے ہوئے مہاجروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ پاکستانی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ وہ آئندہ انتخابات مہاجروں کی مدد سے جیت لے گی۔ لہٰذا وہ مقامی لوگوں کے مقابلے میں مہاجروں کو ہر قسم کی بے جا مراعات دے کر مقامی لوگوں کو ان کے اپنے وطن میں مہاجر بنا رہی ہے۔

8۔ میں مسلم لیگ سے کہتا رہا کہ ملک کو تقسیم مت کرو۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ عوام کے لئے روٹی کپڑا مہیا کرنے کا بندوبست کرو لیکن انہوں نے میری بات نہ سنی۔ [6]

خان عبدالقیوم خان کی ان سرکاری رپورٹوں میں کتنی صداقت تھی؟ اس سوال کا صحیح جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ ان رپورٹوں میں خان عبدالغفار خان سے جو باتیں منسوب کی گئی تھیں ان میں جھوٹ یا مبالغہ کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا تو بھی جمہوری نقطہ نگاہ سے دو ایک باتوں کے سوا ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی، حکومت کے خلاف اس قسم کا غلط یا صحیح پروپیگنڈا بورژوا سیاسی نظام کا ایک لازمی جزو ہوتا ہے لیکن خان عبدالقیوم خان نے اس قسم کی غلط یا صحیح رپورٹوں کا طومار لگانے کے بعد پبلک سیفٹی آرڈیننس کا ایک مسودہ تیار کر کے مرکزی حکومت کی منظوری کے لئے کراچی بھیج دیا۔ چونکہ اس مسودہ کو گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کی منظوری کے لئے کوئٹہ بھیجا گیا تھا اس لئے اس کی منظوری کی اطلاع کے پشاور پہنچنے میں دیر لگ گئی۔ خان عبدالقیوم خان اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے منظوری کا انتظار کئے بغیر 15 رجون 1948ء کو فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاری کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر میجر الہ داد خان کے حکم کے تحت اس الزام کے تحت عمل میں آئی کہ خان عبدالغفار خان نے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کی دفعہ 40 کے تحت ضمانت مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں سرکاری ذرائع کے حوالے سے 16 رجون کو اخبارات میں جو خبریں شائع کی گئیں ان میں کہا گیا تھا کہ "خان عبدالغفار خان کانگرسی لیڈر کی حرکات پر پورے نو ماہ کی نگرانی

کے بعد صوبائی حکومت نے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کئے اور ان کو ضلع کوہاٹ میں گرفتار کر لیا گیا جہاں سے وہ بنوں جا رہے تھے۔ مصدقہ اطلاعات سے پتہ چلا ہے کہ ان کے بنوں جانے کا مقصد یہ تھا کہ فقیر صاحب ایپی کے ایجنٹوں کے ساتھ مل کر وہ سرحد میں گڑبڑ پیدا کریں۔ گو ہندوستان کی تقسیم کانگرس اور مسلم لیگ کی باہمی مفاہمت سے عمل میں آئی تھی تاہم خان عبدالغفار خان نے پاکستان کی شدید مخالفت جاری رکھی۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو 15 راگست کو یوم آزادی منانے سے منع کیا اور تلقین کی کہ وہ حلف وفاداری اٹھانے پر آمادہ نہ ہوں۔ چنانچہ ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو پاکستان سے غیر وفاداری کی بنیاد پر گورنر جنرل کے حکم سے برطرف کر دیا گیا۔ ان کی پارٹی کے بعض ارکان موصوف کی اس پالیسی سے متفق نہ تھے اور انہوں نے پارٹی کے اس جلسہ میں جو سردریاب کے مقام پر پچھلے ستمبر میں ہوا تھا خان عبدالغفار خان کو پاکستان سے تعاون کرنے کو کہا تھا جو اب ایک حقیقت بن چکا تھا مگر خان عبدالغفار خان نے اظہار وفاداری نہ کیا۔ اس وقت کا بڑے صبر سے انتظار کیا جبکہ انہیں ہندوستان سے معتدبہ مالی امداد مل گئی اور پاکستان کا تختہ الٹنے کی تحریک چلانے کے لئے تائید حاصل ہو گئی۔ اس امداد کے حاصل ہوتے ہی انہوں نے اپنے سیاسی طریق کار میں تبدیلی کر دی۔ پچھلے موسم بہار میں انہوں نے پاکستانی دستور ساز اسمبلی میں جو حلف وفاداری اٹھایا وہ مخصوص سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر تھا اور اب وہ مصلحتیں پوری ہو چکی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کراچی کے دوسرے سفر سے واپسی پر پاکستان میں کانگرسی خیال کے لوگوں کو پیپلز پارٹی کے نام پر جمع کرنا شروع کر دیا اور معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے کوئی طے شدہ پروگرام لے کر لوٹے ہیں تاکہ وہ صوبہ سرحد میں ایسے وقت پر گڑبڑ پیدا کر سکیں جبکہ ہندوستانی فوجیں کشمیر پر یلغار کر رہی ہوں۔ گڑھی حبیب اللہ پر بمباری پر خان عبدالغفار خان نے قریہ قریہ دوروں کی رفتار تیز کر دی اور عوام نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان کی بنیادیں ریت پر ہیں اور یہ کوئی دم کا مہمان ہے۔ ان کی تقریروں کے اقتباسات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کے مطالعہ سے کسی فرد کے ذہن میں یہ شبہ نہ ہوگا کہ خان عبدالغفار کی سرگرمیاں ملک کی آئینی اور جائز حکومت کے سراسر خلاف اور مفاد کے منافی ہیں۔ صوبہ سرحد کے عوام نے حکومت کے اس معاملہ پر اغماض پر بارہا حکومت کو سخت سست کہا اور خان عبدالغفار اور ان کے گڑبڑ پھیلانے والے حواریوں کی گرفتاری پر زور دیا۔"[7]

ظاہر ہے کہ اس سرکاری بیان میں خان عبدالغفار خان کے خلاف عائد کردہ الزامات کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا گیا تھا اور کوئی عدالت مروجہ قانون کے تحت ملزم کو اس سرکاری بیان کی بنیاد پر سزا نہیں دے سکتی تھی۔ لہٰذا اس کی گرفتاری کے اگلے ہی دن یعنی سولہ جون کو فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت جرگہ کے روبرو اس کے خلاف مقدمہ کی سرسری سماعت کا ڈھونگ رچا کر تین سال کی سزائے قید دے دی گئی۔ یہ واقعہ پاکستان میں قرون وسطیٰ کی استبدادی نظام کی پہلی بدترین مثال تھا۔ ملزم کو صفائی کا کوئی موقع نہ دیا گیا۔ کسی گواہی اور شہادت کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اور اسے کسی اعلیٰ عدالتی یا ایگزیکٹو اتھارٹی کے سامنے اپیل یا فریاد کرنے کی اجازت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سرکاری بیان سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان نے پاکستان، پختونستان اور کشمیر کے بارے میں خان عبدالغفار خان کی غیر حقیقت پسندانہ اور انتقامی سیاست سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے گورنر جنرل قائداعظم جناح کی ہدایت اور سر جارج کننگھم کے مشورے کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس نے کشمیر کی لڑائی سے ناجائز سیاسی فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ وزارت اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً ہی بعد خان عبدالغفار کی گرفتاری کے لئے فضا ہموار کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پاکستان کے عوام اور بالخصوص سرحد اور پنجاب کے عوام کے کشمیر کے بارے میں جذبات اس قدر مشتعل ہیں کہ وہ اس کی آڑ لے کر عبدالغفار خان کے خلاف جو کارروائی بھی کرے گا اس کو عوامی تائید حاصل ہو گی اور اس بنا پر قائداعظم جناح کو بھی بالآخر اس کارروائی سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ عبدالقیوم خان نے 17 رجون کو اپنے ایک بیان میں اعتراف کیا کہ ''حکومت سرحد نے خان عبدالغفار خان کی گرفتاری کے لئے گزشتہ ماہ یعنی مئی 1948ء میں ایک آرڈیننس کی تصدیق کر کے اسے گورنر جنرل کی حتمی منظوری کے لئے کراچی بھیجا تھا۔ اس آرڈیننس کو ابھی تک واپس نہیں کیا گیا ہے لیکن اس دوران عبدالغفار خان اور ان کے ساتھیوں کی پاکستان دشمن سرگرمیاں صبر و برداشت کی تمام ممکنہ حدود سے تجاوز کر گئیں''[8] اصل بات یہ تھی کہ اگرچہ عبدالقیوم خان نے تحریص و تخویف کے ذریعے آٹھ دس کانگریسی ارکان کی حمایت حاصل کر کے صوبائی اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل کر لی تھی لیکن اس کے باوجود اسے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر خان عبدالغفار خان کی قریہ قریہ سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں تو اس کا کسی وقت بھی تختہ الٹ جائے گا۔ 22 راپریل کو قائداعظم جناح پشاور کے پبلک جلسہ میں اس وزارت کی بدعنوانیوں کی

مذمت کر کے عوام الناس کو یقین دلا چکے تھے کہ اس زہر کو جلد ہی جسد سیاست سے نکال دیا جائے گا۔ عبدالقیوم خان کی اس مفاد پرستانہ سیاست کی کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے ان دنوں پنجاب میں بعض ایسے بااثر عناصر کی تائید وحمایت حاصل تھی جو اسلام و پاکستان کے "اجارہ دار" تھے اور سیاسی دور اندیشی سے محروم تھے۔ ان عناصر کے ترجمان اخبار "نوائے وقت" کا خان عبدالغفار خان کی گرفتاری پر اداریتی تبصرہ یہ تھا کہ "خان عبدالغفار خان کی گرفتاری ہمارے لئے باعث حیرت نہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ یہ گرفتاری اتنا عرصہ بعد کیوں عمل میں آئی یہ ناقابل رشک شرف خان عبدالغفار خان اور ان کے بزرگ برادر ڈاکٹر خان صاحب ہی کے حصہ میں آیا کہ انہوں نے پاکستان سے وفاداری کا رسمی حلف بھی اٹھانے سے انکار کر دیا۔ 15 راگست کے بعد بھی خان صاحب کی سرگرمیاں پاکستان کی بیخ کنی کے لئے ہی وقف رہیں۔ اگر حکومت انہیں بہت پہلے گرفتار کر لیتی تو ان کا یہ اقدام حق بجانب ہوتا۔"[9] گویا "نوائے وقت" کے نزدیک خان عبدالغفار خان کی غداری مسلمہ تھی اور اسے کسی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

چند دن بعد پبلک سیفٹی آرڈیننس کی مرکزی حکومت سے منظوری حاصل ہوگئی تھی تو خان عبدالغفار خان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کر دیا گیا۔ ان میں عبدالغفار خان کا بیٹا عبدالولی خان بھی شامل تھا۔ عبدالغفار خان کو قید کی معیاد پوری کرنے کے لئے پنجاب کے ایک جیل خانہ میں بھیج دیا گیا جبکہ اس صوبہ میں اسلام اور پاکستان کے "اجارہ داروں" کی طرف سے سرحد کے "مرد آہن" عبدالقیوم خان پر تعریف وتوصیف کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے اور لاہور کے بعض اخبارات تو اسے اس کارنامے پر "شیر سرحد" کے خطاب سے نواز رہے تھے۔ چند ماہ بعد مرکزی حکومت نے بنگال سٹیٹ پرزنرز ریگولیشن 111 آف 1818 کے تحت خان عبدالغفار خان کی قید کی معیاد غیر معین عرصے تک بڑھا دی۔ بظاہر اس کا پاکستان پیپلز پارٹی بنانے کا جرم ناقابل معافی تھا۔ پنجاب کے جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کو خدشہ تھا کہ اگر اس "فتنہ" کو سر اٹھانے کی اجازت دی گئی تو رفتہ رفتہ سارے غیر پنجابی صوبے پنجاب کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیں گے چونکہ کراچی اور سندھ کے اہل زبان کو بھی یہی خدشہ لاحق تھا اس لئے اسلام اور پاکستان دونوں ہی کو زبردست "خطرہ" لاحق ہو گیا تھا۔

پنجاب کے جمہوریت پسند، محب وطن اور وسیع المشرب عناصر کی جانب سے اس واقعہ کے خلاف کوئی موثر احتجاج نہ کر سکنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں ان دنوں ہندوستان اور افغانستان کی معاندانہ سرگرمیوں کی بنا پر فی الحقیقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان کا وجود خطرے میں ہے اور خان عبدالغفار خان پاکستان دستور ساز اسمبلی میں حلف وفاداری اٹھانے کے باوجود پختونستان کا سٹنٹ ترک کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا حالانکہ پنجاب اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کے باشعور عوام اس انتہائی شرانگیز شوشہ کے تلخ تاریخی پس منظر سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے قیام پاکستان کے بعد 4 ستمبر 1947ء کو سردریاب میں اپنے "آزاد پختونستان" کے موقف میں جو ترمیم کی تھی اس سے کوئی باشعور محب وطن پاکستانی مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ انہیں پاکستان کے اندر صوبہ سرحد اور بلوچستان کے پٹھان علاقوں پر مشتمل خود مختار پختونستان کا مطالبہ اتنا ہی شرانگیز لگتا تھا جتنا کہ 2 جون کو کانگرس ورکنگ کمیٹی کی جانب سے پیش کردہ آزاد پختونستان کا مطالبہ لگا تھا۔ انہیں یوں لگا تھا کہ خان عبدالغفار خان نے "آزاد پختونستان" کو محض "خودمختار پختونستان" کا نیا لباس پہنایا ہے اس کے ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ خان عبدالغفار خان جیسے تجربہ کار اور "اعلیٰ پایہ" کے سیاسی لیڈر سے یہ توقع کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو علاقائی سطح سے بالاتر کر کے قومی سطح کی سیاست میں حصہ لے اور پھر بے شک صوبہ سرحد کے علاوہ پاکستان کے باقی سارے صوبوں کے لئے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کا مطالبہ کرے تاکہ کسی کو پنجاب کے رجعت پسند جاگیرداروں، سامراج نواز افسر شاہی اور درمیانہ طبقہ کے شاؤنسٹوں کے غلبہ کا خطرہ لاحق نہ رہے۔ جب خان عبدالغفار خان یہ کہتا تھا کہ جیسے سندھیوں کے صوبے کا نام سندھ ہے۔ بنگالیوں کے صوبے کا نام بنگال ہے، بلوچیوں کے صوبے کا نام بلوچستان ہے اور پنجابیوں کے صوبے کا نام پنجاب ہے ویسے ہی پختونوں کے صوبے کا نام پختونستان ہونا چاہیے تو وہ نہ صرف پنجاب بلکہ پورے پاکستان کے باشعور محب وطن عوام کے علم ودانش اور فہم وفراست کی توہین کرتا تھا۔ اس طرح وہ ان سب کو یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کرتا تھا کہ دراصل اس کے پختونستان کے مطالبے میں پاکستان کے خلاف کوئی شرارت مضمر نہیں ہے۔ یہ بالکل بے ضرر سا مطالبہ ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ شمال مغربی صوبہ سرحد کا نام بدل کر اسے پختونستان کا نام دے دیا جائے۔

محب وطن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شخص پختونستان کے نام پر اصرار کیوں کرتا

ہے جبکہ اس سٹنٹ کا تاریخی پس منظر انتہائی ناگوار ہے۔ برصغیر کی ہزاروں سال کی تاریخ میں کبھی بھی صوبہ سرحد یا پٹھانوں کے کسی دوسرے علاقے کو پختونستان کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ انگریزوں کے عہد اقتدار سے پہلے محمود غزنوی سے لے کر رنجیت سنگھ تک کے زمانے میں اس علاقے کو صوبہ پشاور کہتے تھے اور پشاور میں ہی اس کا گورنر ہوتا تھا۔ اس صوبہ کی حدود میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے لیکن کبھی کسی نے اس کا نام پختونستان نہیں رکھا تھا۔ اس کی یہ دلیل بڑی بودی اور مضحکہ خیز تھی کہ چونکہ پٹھانوں کے علاقے کو شمال مغربی صوبہ سرحد کا نام انگریزوں نے دیا تھا اس لئے پٹھان عوام اس نام کو پسند نہیں کرتے اور انہیں اس نام میں سامراجیت کی بو آتی ہے۔ یہ دلیل اس لئے قابل اعتنا نہیں سمجھی جاتی تھی کہ اگر کسی ملک میں محض صوبوں، شہروں اور قصبوں کے ناپسندیدہ تاریخی ناموں کو بدلنے کے سطحی مسئلہ کو اتنا بڑا سیاسی مسئلہ بنا لیا جائے تو اس کے کسی دوسرے بنیادی نوعیت کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی مسئلے کو حل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔ چین کے صوبہ ''سنکیانگ'' کا معنی بھی ''صوبہ سرحد'' ہے لیکن چین کی تاریخ میں سنکیانگ کے لوگوں کے کسی بھی حلقے نے کبھی بھی اپنے صوبے کا نام تبدیل کرنے کا مطالبہ نہیں کیا اور اگر برائے بحث اس رائے سے اتفاق کر بھی لیا جائے کہ صوبہ سرحد کا نام بدلنے سے پٹھان عوام کی نفسیاتی تسکین ہوگی تو پھر یہ کیا ضروری ہے کہ اس کا نام ضرور وہی رکھا جائے جس کا مطالبہ 2 رجون کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے کیا تھا اور پھر جس کا مطالبہ صوبہ سرحد کی کانگرس کمیٹی نے 21 رجون کو بنوں میں کیا تھا۔ اس کا نام صوبہ پشاور کیوں نہ رکھ دیا جائے تا کہ خان عبدالغفار خان کا ''عظیم ترین'' سیاسی مسئلہ حل ہو جائے۔

پنجاب میں خان عبدالغفار خان اور اس کے حواریوں کی گرفتاری کے خلاف موثر احتجاج نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں علاقہ پرستی کی وجہ سے یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ پنجاب کے عوام نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے آگ وخون کے کتنے دریاؤں کو عبور کیا ہے اور اس بنا پر وہ اپنے وطن عزیز کے خلاف چھوٹی سے چھوٹی شرارت کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے جبکہ کشمیر میں جنگ جاری تھی اور ہندوستان کے ارباب اقتدار پاکستان کا ابتدا ہی میں گلا گھونٹنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ خان برادران ان حقائق کو بڑی سنگدلی سے نظر انداز کر کے بدستور کانگرس اور ''گاندھی جی'' کے بارے میں تعریفی گیت گائے جا رہے تھے۔ انہیں ہندوستان کی ہر چیز اچھی لگتی تھی اور پاکستان کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ انہوں نے کبھی

افغانستان کے توسیع پسندانہ عزائم کی مذمت نہیں کی تھی۔ وہ پختونوں کے لئے تو حق خودارادیت کا مطالبہ کرتے تھے لیکن انہوں نے کشمیری عوام کے مطالبۂ حق خودارادیت کی تائید وحمایت نہیں کی تھی جبکہ وزیرستان کے ہزاروں قبائلی عوام اس مقصد کے لئے اپنی جانیں قربان کررہے تھے۔ ان کی اس غلط اور تنگ نظر سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کے رجعت پسند جاگیرداروں، سامراج نواز افسروں اور خان عبدالقیوم خان جیسے موقع پرستوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اس طرح انہوں نے اسلام اور پاکستان کے نام پر نہ صرف اپنے سیاسی حریفوں کے خلاف ہر جابرانہ اقدام کو روا رکھا بلکہ پاکستان کے غریب عوام کا بے محابا سیاسی و معاشی استحصال کیا۔ اگر خان عبدالغفار خان اور اس کے حواریوں کا نظریہ زندگی جاگیردارانہ نہ ہوتا اور ان کی سیاست کی بنیاد سائنسی نظریے اور ٹھوس حقائق پر ہوتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ پنجاب کے غریب عوام ان کی قیادت قبول نہ کرتے۔

قدرتی طور پر خان عبدالغفار خان اور اس کے ساتھیوں کی نظر بندی کا اس کی 30 سالہ خدائی خدمت گار تنظیم کے ارکان میں بہت غیر موافق ردعمل ہوا۔ جولائی کے اواخر میں اس کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے ان نظر بندیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے چارسدہ کے نزدیک بھابڑا کے مقام پر ایک جلسہ کرنے کا اعلان کیا تو اسے گرفتار کرلیا گیا۔ تاہم اس کے اعلان کے مطابق 12 راگست کو پورے صوبے سے خدائی خدمت گار اور اس کی ذیلی سرخپوش تنظیم کے ارکان بھابڑا میں جمع ہوئے۔ ان کی تعداد بیس پچیس ہزار تھی۔ پولیس نے انہیں منتشر کرنے کے لئے گولی چلائی جس میں سرکاری اعلان کے مطابق 25 افراد ہلاک اور 35 زخمی ہوئے مگر غیر سرکاری اندازے کے مطابق اس قتل عام میں مرنے والوں کی تعداد 600 سے لے کر 800 تک تھی۔ اس المناک واقعہ کے بارے میں خان عبدالقیوم خان اور اس کے ذرائع ابلاغ کا موقف یہ تھا کہ ''سرخپوشوں کا یہ اجتماع پورے صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔ چونکہ چارسدہ کے ڈویژنل مجسٹریٹ نے 5 راگست کو اس علاقے میں دفعہ 144 نافذ کردی تھی اس لئے یہ اجتماع غیر قانونی تھا بالخصوص اس لئے بھی کہ اس میں بہت سے سرخپوش مسلح تھے اور وہ پرتشدد تحریک شروع کرنے کے لئے پورے صوبے میں مارچ کرکے وہاں پہنچے تھے۔ عبدالقیوم خان کا مزید بیان یہ تھا کہ سرخپوشوں نے اپنے لیڈر خان عبدالغفار خان کی گرفتاری کے بعد سول نافرمانی کی تحریک شروع کرکے پورے صوبہ میں بدامنی پھیلانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان

کے پاس بہت سے بلا لائسنس ہتھیار تھے اور پولیس کو انہیں کنٹرول میں رکھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ ان کے اس پروگرام کی بنیاد اس امید پر تھی کہ چونکہ کشمیر میں مجاہدین کو ہزیمت اٹھانا پڑ رہی ہے اور ہندوستانی فوجیں پیش قدمی کر رہی ہیں اس لئے ان کی تھوڑی سی گڑ بڑ سے پورے صوبے کی صورتحال کنٹرول سے باہر ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت نے بھابڑا کے واقعہ سے چھ دن قبل مردان اور پشاور کے اضلاع کے ان علاقوں میں فوج کی پریڈ کا انتظام کر کے سرکاری قوت کا مظاہرہ کیا تھا جہاں سرخپوشوں کی خاصی طاقت تھی۔ حکومت کو خدشہ تھا کہ اگر سرخپوش، جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی، بدامنی پھیلانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کے خطرناک نتائج برآمد ہونگے۔"[10] وزیراعلیٰ عبدالقیوم خان نے اس واقعہ کے بعد خدائی خدمت گاروں اور سرخپوشوں کے خلاف بڑی سخت تعزیری کاروائی کی۔ اس نے چارسدہ میں ایک تعزیری پولیس چوکی قائم کی جس کے اخراجات کے طور پر مقامی لوگوں سے پچاس ہزار روپے بطور جرمانہ وصول کئے گئے۔ ضلع پشاور کے چھ اور ضلع مردان کے دس سرکردہ سرخپوش لیڈروں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں جن میں عبدالغفار خان کی دو بہنوں کی جائیدادیں بھی شامل تھیں مگر کچھ عرصے بعد وہ ساری جائیدادیں آمدنی سمیت انہیں واپس کر دی گئیں۔

پنجاب میں خان عبدالقیوم خان کی عبدالغفار خان کے حامیوں کے خلاف اس جابرانہ کاروائی کی مذمت کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ البتہ ایسے عناصر کی تعداد خاصی زیادہ تھی جو سرحد کے اس "مردآہن" کی حب الوطنی کے اس مظاہرے کی تعریف کرتے تھے۔ انہیں خوش فہمی تھی کہ اب پختونستان کا فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض عناصر ایسے بھی تھے جو عبدالقیوم خان کو ایک مثالی حکمران قرار دیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ پاکستان کے دوسرے علاقوں میں بھی عنان اقتدار ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے تاکہ جو عناصر اسلام اور پاکستان کے "مخالف" ہیں انہیں مکمل طور پر کچل دیا جائے۔ وہ دراصل اسلام اور پاکستان کو پنجاب کے حکمران طبقوں کے مفادات سے وابستہ کرتے تھے۔ چنانچہ پنجابی شاونسٹوں کے ترجمان روزنامہ نوائے وقت کا بھابڑا کے واقعہ پر ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ "صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے صوبہ میں غداروں پر کڑی نگرانی رکھی۔ جو لوگ خان عبدالقیوم خان پر دہشت پسندی اور ڈکٹیٹرشپ کا الزام عائد کر رہے ہیں وہ صوبہ سرحد

کے صحیح حالات سے واقف نہیں اور اگر حالات سے واقفیت کے باوجود وہ وزیر اعلیٰ سرحد کو کوس رہے ہیں تو ان کی عقل یا نیت میں سے ایک کا ماتم کرنا پڑے گا۔ خان عبدالقیوم پر ہزار اعتراض کئے جا سکتے ہوں گے مگر جہاں تک غداروں کے خلاف کاروائی اور ان کی بیخ کنی کا تعلق ہے ہم انہیں خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہیں اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ قائداعظم اور حکومت پاکستان کی بھی اس معاملہ میں یہی رائے ہے اور خان عبدالقیوم خان کو ان کی پوری حمایت حاصل ہے۔ اپنے سیاسی حریفوں کو ختم کرنے کے لئے خان عبدالقیوم اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھائیں تو ہم اس کی شدید مذمت کریں گے لیکن وہ قومی غداروں کو کچلنے کے لئے سختی برتتے ہیں تو مبارک باد کے مستحق ہیں۔''[11] گویا کون غدار تھا اور کون محب الوطن اس کا فیصلہ کرنے کا حق صرف عبدالقیوم خان اور اس کے پنجابی حامیوں کو ہی حاصل تھا۔ ہندوستان میں بعض با اثر ہندو عناصر اسی منطق کی بنیاد پر وہاں کے سارے مسلمانوں کو غدار قرار دیتے تھے۔ پنجاب میں اسلام اور پاکستان کے ان ٹھیکیداروں کی طرح پاکستان کے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کو بھی عبدالقیوم خان کی فسطائیت پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ قائداعظم محمد علی جناح کی طرح یہ نہیں سمجھتا تھا کہ عبدالقیوم خان پاکستان کے جسد سیاست میں ایک ایسا زہر ہے جسے جلد از جلد نکال دینا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ''شیر سرحد'' کو پنجاب کے ان عناصر کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا جو نواب ممدوٹ کی زیر قیادت اس کے خلاف سیاسی بغاوت کر رہے تھے۔ مزید براں اسے اپنے سیاسی حریف حسین شہید سہروردی کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی سرحد میں ایک طاقتور حلیف کی ضرورت تھی۔

باب:8

پختون شاونزم کا تاریخی پس منظر اور ڈیورنڈ لائن کی بین الاقوامی حیثیت

صوبہ سرحد میں خان عبدالقیوم خان کی اس ''سکھا شاہی'' کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت افغانستان نے پاکستان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا کی مہم اور بھی تیز کر دی تھی۔ اب ان کا پروپیگنڈا یہ نہیں تھا کہ دریائے سندھ تک کے علاقے کو افغان مادر وطن کی گود میں واپس آ جانا چاہیے۔ اب وہ کہتے تھے کہ پاکستان کے پختون عوام بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ انہیں حق خود ارادیت ملنا چاہیے۔ حکومت افغانستان نے اس مقصد کے لئے بہت سے پمفلٹ لکھے۔ کتابیں چھاپیں اور اس کے سفیروں کے لئے خصوصی پروگرام شروع کر دیئے جن میں صوبہ سرحد کے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا اور قبائلی عوام کو پاکستان کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی جاتی تھی۔ بظاہر اس اشتعال انگیزی کا کچھ اثر ہوتا بھی تھا کیونکہ فقیر اپی کے بعض جتھے کبھی کبھی پاکستانی علاقے پر حملے کرتے تھے۔ غالباً اسی قسم کے ایک حملے کے بعد 12 رجون 1949ء کو پاکستانی ہوائی فوج نے فقیر اپی کے علاقے پر بمباری کی تو غلطی سے افغانستان کا ایک قریبی گاؤں اس کا نشانہ بن گیا۔ حکومت پاکستان نے اس واقعہ پر معذرت کی اور پھر ایک مشترکہ کمیشن نے تحقیقات کر کے یہ فیصلہ دیا کہ یہ بمباری واقعی اتفاقی حادثہ کے طور پر ہوئی تھی۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے افغانستان کے گاؤں والوں کو ان کے نقصانات کا معاوضہ دے دیا اور اس طرح یہ معاملہ بظاہر پرامن طریقے سے رفع دفع ہو گیا مگر دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کم نہ ہوئی بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا حالانکہ ان دنوں حکومت

پاکستان اپنے قبائلی علاقے کے ''سرداروں'' کو سالانہ تقریباً پانچ کروڑ روپے بطور واجبات یا رشوت دیتی تھی اور یہ رقم افغانستان کے سالانہ بجٹ کی کل رقم سے زیادہ تھی۔ مزید برآں حکومت پاکستان نے اس علاقے میں ہائیڈرو الیکٹرک پاور ہاؤس اور نہریں تعمیر کرنے کے منصوبے بھی شروع کرر کھے تھے جن کے باعث ہزاروں قبائلیوں کو روزگار کے مواقع مہیا ہوئے تھے۔

30رجون 1949ء کو یہ بین المملکتی کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی جبکہ بادشاہ ظاہر شاہ نے افغان نیشنل اسمبلی (لوئی جرگہ) کو خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف بڑی سخت تقریر کی جس کے بعد اس اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ان تمام معاہدوں، مفاہمتوں اور سمجھوتوں کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا گیا جو قیام پاکستان سے قبل افغانستان اور حکومت برطانیہ کے درمیان ہوئے تھے اور یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ہم افغانستان اور پاکستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم نہیں کرتے۔ قرارداد میں چترال سے لے کر بلوچستان تک افغان صوبوں اور ریاستوں میں پاکستانی ارباب اقتدار کے ظلم وستم کی مذمت کی گئی اور یہ وعدہ کیا گیا کہ حکومت افغانستان ان علاقوں کے عوام کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرے گی۔[1] چونکہ یہ قرارداد پاکستان کی علاقائی سالمیت اور خودمختاری پر کھلے حملے کی حیثیت رکھتی تھی اس لئے اس سے اگلے دن حکومت برطانیہ نے غالباً حکومت پاکستان کی تحریک پر، یہ اعلان کیا کہ ''پاکستان بین الاقوامی قانون کے تحت اپنے علاقے میں پرانی حکومت ہندوستان کے حقوق وفرائض کا جائز وارث ہے اور حکومت برطانیہ ڈیورنڈ لائن کو ایک بین الاقوامی سرحد تسلیم کرتی ہے۔''[2] لیکن افغان حکمرانوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ 4راگست کو دہلی کے روزنامہ سٹیٹس مین (Statesman) نے یہ خبر شائع کی کہ حکومت افغانستان نے اپنی فوج کے دو ڈویژن اور پوری ہوائی فوج پاک افغان سرحد کے نزدیک منتقل کر دی ہے۔ مقصد غالباً یہ ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے اس پار پاکستانی علاقے میں باغی قبائلیوں کو امداد دی جائے اور یہ بات کابل میں سب کو معلوم ہے کہ حکومت افغانستان نے ایک خاص عمر تک کے سارے لوگوں کو فوجی خدمات کے لئے طلب کر لیا ہے۔ پاکستان حکومت افغانستان کے ان اقدامات کو لازمی طور پر شک وشبہ کی نظر سے دیکھے گا۔'' 12راگست کو کابل ریڈیو سے اعلان کیا گیا کہ ''تیرہ باغ میں آفریدی قبائل کا ایک جرگہ ہوا جس میں پختونستان کی نیشنل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس اسمبلی میں پختونستان کے پرچم کی منظوری دی گئی جس

میں چڑھتے ہوئے سورج کے سامنے ایک سرخ پہاڑی کا منظر دکھایا گیا تھا۔"[3] کچھ عرصہ بعد کابل ریڈیو سے اسی طرح کی ایک رپورٹ نشر کی گئی جس میں بتایا گیا کہ آفریدی قبائل کا ایک اور جرگہ رزمک میں ہوا جس میں فقیرا یپی کو جنوبی پختونستان کا صدر منتخب کیا گیا۔[4] پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے 9رجنوری 1950ء کو اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے ہماری ہمسایہ مسلم مملکت افغانستان نا قابل فہم وجوہ کی بنا پر ہمارے خلاف کھلم کھلا معاندانہ پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ہمارے قبائلی علاقے میں کوئی قومی اسمبلیوں کی تشکیل نہیں ہوئی۔ یہ صرف کابل میں کاغذ پر بنائی گئی ہیں۔ پاکستان سے توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ہر حالت میں دوستی کی اپیلیں کرتا رہے گا۔ ہم کسی قیمت پر اپنی سرزمین کا ایک انچ علاقہ بھی کسی کے حوالے نہیں کریں گے۔"[5]

وزیراعظم لیاقت علی خان کو اس قسم کی انتباہی تقریر کرنے کی ضرورت محض اس لئے محسوس نہیں ہوئی تھی کہ افغانستان میں پختونستان کا پروپیگنڈا زور شور سے جاری تھا بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان میں جگہ جگہ یوم پختونستان کی تقریبات منائی جارہی تھیں جن میں خان عبدالغفار خان کی حمایت میں اور حکومت پاکستان کے خلاف تقریریں کی جاتی تھیں اور اخبارات میں اس مضمون کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں کہ حکومت ہندوستان اب حکومت افغانستان کی وساطت کی بجائے براہ راست فقیرا یپی کو مالی امداد دے رہی ہے لیکن لیاقت علی خان کے اس انتباہ کا کوئی اثر نہ ہوا اور 4رمارچ کو ہندوستان میں افغان سفیر سردار نجیب اللہ نے روزنامہ انڈین نیوز کرانیکل کو بتایا کہ "آج کل میں قبائلی عوام پختونستان کی مرکزی حکومت کی تشکیل کے لئے ایک مرکزی اسمبلی کا انتخاب کریں گے۔"[6]

16رجون کو حکومت پاکستان کو پتہ چلا کہ افغان فوج کی ایک چوکی چمن سب ڈویژن کے پاکستانی علاقے کے تقریباً 300 گز اندر قائم کر دی گئی ہے۔ پاکستانی فوجیوں نے افغان فوجیوں کو وہاں سے چلے جانے کو کہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور افغانستانی علاقے میں جمع شدہ قبائلیوں نے فائرنگ شروع کر دی جس سے ایک پاکستانی جونیئر کمیشنڈ آفیسر ہلاک ہوا اور دو سپاہی زخمی ہوگئے۔ اس پر پاکستانی فوج نے جوابی کاروائی کر کے انہیں وہاں سے بزور قوت بیدخل کر دیا۔[7] اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ بعد 15رجولائی کو بعض قبائل نے ایک افغان فوجی سپاہی کی

زیر قیادت کرم ایجنسی کے پاکستانی علاقے پر دو حملے کئے جن میں ایک پاکستانی سپاہی مارا گیا اور ایک زخمی ہوا۔[8]

28 راگست 1950ء کو افغان بادشاہ ظاہر شاہ اور اس کے وزیر اعظم نے سالانہ جشن کی تقریب میں پاکستان کے خلاف تقریریں کیں جن کے بعد سٹیڈیم میں پختونستان کے پرچم لہرائے گئے اور افغان ہوائی فوج نے پاکستان کے خلاف اشتہارات پھینکے۔ پاکستان کے خلاف اس انتہائی غیر متوقع اشتعال انگیزی کا ایک پس منظر یہ تھا کہ افغان حکمران تقریباً ایک ماہ قبل سوویت یونین سے تجارت اور راہداری کا معاہدہ کر چکے تھے۔ اس معاہدے کے تحت سوویت یونین نے افغانستان کی اون اور کپاس کے عوض اسے پٹرول، کپڑا، کھانڈ اور دوسری متعدد اشیائے صرف سپلائی کرنے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ افغانستان کو سوویت یونین کے راستے سے بیرونی تجارت کی بلا معاوضہ سہولت دی جائے گی اور افغانستان میں پٹرول کا ذخیرہ کرنے کے لئے ٹینک تعمیر کئے جائیں گے۔ 16 ستمبر کو تقریباً ڈیڑھ درجن افغان قبائلیوں نے نوشکی کے نزدیک پاکستانی علاقے کے اندر گھس کر سرحدی چوکی پر حملہ کیا۔ تاہم پاکستان کا کوئی جانی نقصان نہ ہوا اور افغان حملہ آوروں کو بھگا دیا گیا۔ پاکستان کے خلاف اس قسم کے حملوں کا سلسلہ مزید ایک ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ افغانستان اور ہندوستان میں خان عبدالغفار خان کے پختونستان کے حق میں اور پاکستان کے خلاف تیز و تند پروپیگنڈا بھی جاری رہا اور بالآخر عبدالولی خان کے بیان کے مطابق کابل میں پشتونستان کی تحریک 1952ء میں شروع کی گئی جبکہ خان عبدالغفار خان اور اس ساتھی جیلوں میں تھے۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے پاکستان کے راستے ہونے والی افغان تجارت پر پابندی لگا دی اور اس طرح سوویت یونین ہندوکش پہاڑ میں سے سلانگ کی سرنگ کھود کر افغانستان کی مدد کو پہنچ گیا تا کہ وہ تجارت پر عائد کردہ پابندی سے افغانوں کو بچا سکے اور محفوظ کر سکے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ افغانوں نے ڈیورنڈ لائن کی چبھن اور اپنی معیشت بلکہ اپنی زندگی پر اس کے عمل دخل کو محسوس کیا۔[9]

ولی خان کا مطلب یہ ہے کہ حکومت افغانستان نے جولائی 1947ء میں ریفرنڈم کی مخالفت کی تھی۔ ان کا پشتونستان کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ 30 رجون 1949ء کو افغان لوئی جرگہ میں سارے سابقہ معاہدات کو منسوخ کرنے، ڈیورنڈ لائن کو مسترد کرنے اور پاکستان کے

افغانوں کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرنے کے بارے میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی وہ کابل میں پشتونوں کی تحریک کا حصہ نہیں تھی اور پھر 28 راگست 1950ء کو کابل سٹیڈیم میں افغان بادشاہ اور وزیر اعظم کی پاکستان کے خلاف تقریروں کے بعد پختونستان کے جو پرچم لہرائے گئے تھے وہ بھی کابل میں پشتونوں کی تحریک کا حصہ نہیں تھے۔ خان عبدالغفار خان، اس کے بیٹے عبدالولی خان اور ان کے ساتھیوں کے اس قسم کے بیانات ہی دراصل خان عبدالقیوم خان جیسے موقع پرستوں کو سیاسی تقویت پہنچانے کا باعث بنتے تھے۔ عبدالولی خان کا یہ بیان بھی یک طرفہ ہے کہ 1952ء میں پہلا موقع تھا کہ افغانوں نے ڈیورنڈ لائن کی چبھن اور اپنی معیشت بلکہ اپنی زندگی پر اس کے عمل دخل کو محسوس کیا تھا۔ اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان کے عوام 1947ء سے مسلسل یہ چبھن محسوس کر رہے تھے کہ افغانستان ان کے وطن عزیز کی بین الاقوامی جغرافیائی حدود کو تسلیم نہیں کرتا اور پاکستان کے داخلی امور میں کھلم کھلا مداخلت کر کے اسے تباہ و برباد کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ حکومت پاکستان نے 1952ء میں پاکستان کے راستے ہونے والی افغان تجارت پر پابندی لگانے کی کاروائی افغانستان کے بارے میں پانچ سال کی طویل صبر و تحمل کی پالیسی کی ناکامی کے بعد کی تھی لیکن ولی خان اینڈ کمپنی پاکستانی عوام کی اس چبھن میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ اگر انہوں نے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد یہ غیر مبہم اعلان کر دیا ہوتا کہ وہ پاکستان کی بین الاقوامی جغرافیائی سرحدوں کو تسلیم کرتے ہیں اور افغانستان کے توسیع پسندانہ عزائم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے تو عبدالقیوم خان جیسے فسطائی عناصر کو سیاسی طور پر پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملتا۔ اگر عبدالقیوم خان اپنی جابرانہ پالیسیوں کے باعث خان برادران کا محسن اعظم بن گیا تھا تو خان برادران بھی اپنی غلط سیاست کی وجہ سے عملاً عبدالقیوم خان کے سب سے بڑے حامی و مددگار تھے۔

جب خان عبدالولی خان یہ کہتا ہے کہ کابل میں پشتونستان کی تحریک 1952ء میں شروع کی گئی تھی تو غالباً وہ دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ حکومت افغانستان نے پختونستان کی عملی طور پر تائید و حمایت کے لئے اعلیٰ ترین سرکاری سطح پر مختلف ادارے قائم کئے تھے جن کا انچارج وزیر اعظم داؤد تھا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ حکومت افغانستان نے 1952ء میں پہلی مرتبہ پختونستان کی تحریک کو نہ صرف پاکستان کے علاقوں میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر چلانے کے لئے ایک نئی وزارت قائم کی تھی جس کا قلمدان وزیر اعظم داؤد خان نے خود سنبھالا تھا۔ ظاہر ہے کہ حکومت

افغانستان کی اس کاروائی کے بعد حکومت پاکستان نے افغان تجارت پر پابندی لگانے کی جو کاروائی کی تھی اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ افغان عوام کو کوئی چبھن محسوس کرائی جائے بلکہ صاف مقصد یہ تھا کابل کے حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر انہیں پاکستان دشمن کاروائیوں سے باز رکھا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مقصد کی تکمیل نہ ہوئی اور افغان حکمران پہلے سے بھی زیادہ پاکستان دشمنی پر اتر آئے۔ انہوں نے پاکستان کے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کے باغی یا غیر مطمئن عناصر سے باقاعدہ روابط قائم کئے اور پمفلٹوں اور ریڈیو کابل کے ذریعے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کی مہم کو مزید تیز کر دیا۔ لیکن انہوں نے اس سلسلے میں جو سب سے زیادہ خطرناک اقدام افغان تجارت پر پابندی عائد ہونے سے پہلے کیا تھا وہ یہ تھا کہ کابل میں ''خوشحال خان سکول'' کھولا تھا جس میں پاکستان کے قبائلی علاقوں کے بچوں کی مفت تعلیم، رہائش اور خوراک کا بندوبست تھا۔ یہاں بچوں کو افغانستان کے نقطۂ نگاہ سے پٹھانوں کی تاریخ، ادب اور روایات کی تعلیم دے کر ان میں پختون عصبیت پیدا کی جاتی تھی تاکہ وہ سکول سے فارغ ہو کر واپس اپنے گھروں کو جائیں تو مطالبہ پختونستان کے علمبردار ہوں۔ افغان حکمرانوں نے یہ طریقہ مغربی سامراجیوں سے سیکھا تھا جو گزشتہ دو تین سو سال سے اپنے تعلیمی اداروں میں، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے نوجوانوں کو تعلیم دے کر اپنے پٹھوؤں کی فوجیں تیار کر رہے ہیں لیکن بورژوا سامراجیت اور جاگیردارانہ سامراجیت میں بڑا فرق ہے۔ جاگیردار سامراجیت سترہویں صدی میں ہی اپنی تاریخی موت سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ اب اس مردے کو کسی صورت زندہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

خوشحال خان خٹک صوبہ سرحد کی سترہویں صدی کی ایک فوجی اور علمی شخصیت ہے اور وہ پختون شاونزم کا سب سے بڑا علمبردار تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا والد شہباز خان مغل شہنشاہ شاہ جہاں کا نہایت وفادار جاگیردار تھا۔ شاہ جہاں نے شہباز خان کو اس کی وفاداری کا اتنا صلہ دیا تھا کہ خوشحال خان نے اپنی ایک نظم میں اسے ''قدردان شاہ جہاں'' لکھا ہے۔ اگرچہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں خوشحال خان بچہ تھا تاہم اس نے اپنے والد سے اس کے بارے میں جو باتیں سنی تھیں ان کی بنا پر اس نے اپنی ایک اور نظم میں لکھا ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں ہندوستان جنت کی طرح تھا۔ جب شہباز خان 1641ء میں مغل شہنشاہ کی طرف سے یوسف زئی قبیلہ کے خلاف لڑائی میں مارا گیا تو شاہ جہاں نے خوشحال خان کو خٹک قبیلہ کا سردار اور پشاور تک شاہراہ کا

محافظ مقرر کر دیا۔ اس تقرر کے بعد خوشحال خان دہلی گیا جہاں وہ شاہ جہاں کے دو جرنیلوں امانت خان اور رسالت خان سے وابستہ ہو گیا اور پھر اس نے کانگڑہ، بلخ اور بدخشاں کی فوجی مہمات میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس وقت تک اس کے ذہن میں پختون قوم کی آزادی کا کوئی خیال نہیں تھا بلکہ یہ اپنے مغل شہنشاہ کا وفادار تھا۔ جب وہ ان فوجی مہمات سے واپس آیا تو اس نے شاہ جہاں کی اجازت سے اپنے حریف قبیلہ یوسف زئی کے بعض دیہات کو اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ اس پر یوسف زئی قبائلیوں نے بہت برا منایا چنانچہ ان کے سردار بہا کو خان نے دارا شکوہ کی امداد سے شاہ جہاں سے حکم حاصل کر لیا کہ یوسف زئی کا جو علاقہ خوشحال خان خٹک کو دیا گیا ہے وہ واپس بہا کو خان کو دے دیا جائے۔ جب شاہ جہاں کی علالت کے دوران اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہوئی تو بہا کو خان نے قدرتی طور پر دارا شکوہ کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں دارا شکوہ کو شکست ہوئی تو اس نے بھاگ کر یوسف زئی علاقے میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر خوشحال خان نے یوسف زئی لشکر کو لنڈائی دریا کے کنارے سے بھگا دیا اور اس طرح اس کی یہ کوشش ناکام کر دی۔ اورنگزیب خوشحال خان کی اس کاروائی سے خوش ہوا اور اس نے اس کی قبیلہ خٹک کی سرداری کی توثیق کر دی اور پھر اورنگزیب نے اس علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد کابل کے گورنر مہابت خان کا، جو خوشحال خان پر اکثر و بیشتر مہربانی کیا کرتا تھ، دکن میں تبادلہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک شخص سید امیر کو کابل کی گورنری کے عہدہ پر فائز کر دیا اور اس کے نائب عبدالرحیم کو پشاور کے علاقے کا انچارج بنا دیا۔ عبدالرحیم، یوسف زئی کے سردار بہا کو خان پر مہربان تھا چنانچہ اس نے اس کے کہنے پر دریائے سندھ کو عبور کرنے پر عائد کردہ ٹیکس منسوخ کر دیا۔ یہ ٹیکس زیادہ تر یوسف زئی کے ارکان ادا کیا کرتے تھے اور خوشحال خان اس کی وصولی کیا کرتا تھا لہٰذا خوشحال نے دو وجوہ کی بنا پر عبدالرحیم کے اس اقدام کو پسند نہ کیا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی اس طرح اس کے مالی مفاد پر زد پڑتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے پشتینی دشمن قبیلہ یوسف زئی کو فائدہ پہنچتا تھا۔ اس کا پڑدادا، دادا اور والد مغلوں کی طرف سے یوسف زئی کے خلاف لڑائیوں میں مارے گئے تھے۔

خوشحال خان نے اپنے نقصان اور دشمن کے فائدے کے اس واقعہ کے بعد نائب گورنر عبدالرحیم کے خلاف فوری طور پر کھلم کھلا بغاوت تو نہ کی لیکن قبائلی عصبیت کی بنا پر پس پردہ

اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ جب اورنگزیب کے گورنر سید امیر کو یہ اطلاع ملی تو اس نے 1646ء میں خوشحال خان کو پشاور طلب کیا اور پھر اسے گرفتار کر کے دہلی پہنچا دیا جہاں وہ دو سال سے زائد عرصے تک مقید رہا۔ جب اس کی رہائی عمل میں آئی تو پھر اسے واپس اپنے وطن جانے کی اجازت نہ دی گئی بلکہ اسے اس کے اپنے گھر میں نظر بند رکھا گیا۔ 1668ء میں سید امیر کو کابل کی گورنری سے اس لئے برطرف کر دیا گیا کہ وہ اپنی سات سالہ ملازمت کے زمانے میں صوبے میں امن وامان قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ اس دوران یوسف زئی اور دوسرے قبائل کی بغاوتیں جاری رہی تھیں۔ سید امیر کی جگہ پھر مہابت خان کا تقرر کیا گیا تو اس کی سفارش پر خوشحال خان کو رہا کر دیا گیا اور وہ دونوں اکٹھے ہی پشاور پہنچے لیکن 1670ء میں اورنگزیب نے بعض وجوہ کی بنا پر مہابت خان کو یکا یک برطرف کر دیا اور اس کی جگہ دکن کے ایک شخص امین خان کو شمال مغربی علاقے کا صوبیدار مقرر کیا جس میں کوئی انتظامی صلاحیت نہیں تھی۔ اس کے عہد میں 1672ء میں آفریدی قبائلیوں نے زبردست بغاوت کی جس کی بنا پر مغل فوجوں کو کابل جاتے ہوئے تنگ دروں کے مقامات پر دو مرتبہ سخت ہزیمت اٹھانا پڑی۔ خوشحال خان نے ان لڑائیوں میں بظاہر کسی فریق کا ساتھ نہ دیا لیکن وہ دل ہی دل میں آفریدیوں کی فتح پر بہت خوش تھا اور اس کے اپنے بیان کے مطابق ان لڑائیوں میں مغلوں کے 40000 فوجی سپاہی مارے گئے تھے۔ اورنگزیب نے 1674ء میں امین خان کو برطرف کر کے اس کی جگہ ایک مرتبہ پھر مہابت خان کو اس علاقے کا انچارج بنا دیا۔ مہابت خان نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد خوشحال خان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا کیونکہ اس وقت وہ آفریدی قبائلیوں کے ساتھ مل کر اورنگزیب کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کی سرداری اپنے بیٹے اشرف خان کے حوالے کر کے یہ عہد کیا تھا کہ اب وہ بقیہ ساری عمر مغلوں کے خلاف برسرپیکار رہے گا۔ اورنگزیب اس بغاوت کو کچلنے کے لئے خود پشاور پہنچا مگر اس کی فوجوں کو نوشہرہ میں آفریدیوں اور خوشحال خان کے ساتھیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اس کے بعد خوشحال خان کی بقیہ زندگی مختلف قبائلی علاقوں میں لوگوں کو مغلوں کے خلاف اکسانے، مغل حکام کے ساتھ مصالحت کی نیم دلانہ کوششوں اور اپنے بیٹوں کے ساتھ جھگڑوں میں گزری۔ عبدالرحمان پژواک بڑی دبی زبان میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس دوران اس کا بیٹا بہرام خان مغلوں کے ساتھ مل گیا تھا اور اس نے ان کی طرف سے بعض

لڑائیوں میں حصہ بھی لیا تھا۔ اورنگزیب نے اس کی ان خدمات کے عوض انعام کے طور پر اسے وہ جاگیرداری عطا کر دی تھی جو پہلے خوشحال خان کے پاس تھی۔ بہرام خان کے بڑے بھائی اشرف خان کو 1683ء میں گرفتار کر کے بیجاپور میں قید کر دیا گیا جہاں وہ تقریباً دس سال کے بعد انتقال کر گیا۔ خوشحال خان کا انتقال 1689ء میں ہوا لیکن اس وقت تک اس کی اپنے بیٹے بہرام خان سے کوئی مفاہمت نہیں ہوئی تھی۔ خوشحال خان آخر دم تک اورنگزیب کا باغی رہا جبکہ اس کا بیٹا بہرام خان اس کے خلاف مغل شہنشاہ کے وفادار جاگیردار کے طور پر فرائض سرانجام دیتا رہا۔ تاہم اورنگزیب کے عہد کے آخری سالوں میں سرحد کے کئی علاقوں پر مغلوں کا پوری طرح کنٹرول نہیں رہا تھا اور 1707ء میں اس کے انتقال کے بعد تو یہ علاقہ مسلسل بدامنی اور افراتفری کا شکار رہا۔ ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے اسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر 1739ء میں حملہ کر کے دہلی میں لرزہ خیز قتل عام کرنے کے علاوہ بے پناہ لوٹ مار کی تھی۔ ان دنوں ہندوستان میں اتنی طوائف الملوکی پھیل چکی تھی کہ نادر شاہ کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

خوشحال خان پشتو کا بہت عمدہ شاعر تھا۔ اس کی نظمیں بڑی زوردار اور اثر انگیز ہوتی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنی نظموں کے ذریعے اورنگزیب کے خلاف مختلف قبائل کو متحد کرنے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی قبائلی عصبیت سے بالاتر نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنی نظموں میں آفریدیوں کی بہت تعریف کی ہے کیونکہ انہوں نے اورنگزیب کے خلاف کامیاب بغاوتیں کی تھیں لیکن اس نے یوسف زئی کی تعریف میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا تھا۔ اس لئے کہ یہ قبیلہ اس کا پشتینی دشمن تھا۔ یوسف زئی نے شہنشاہ بابر اور اکبر سے تعاون کیا تھا جبکہ خوشحال خان کے پڑدادا اور دادا کے خلاف برسرپیکار رہے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں جب یوسف زئی نے کچھ سرکشی کی تھی تو خوشحال خان کا قبیلہ مغلوں کا حلیف بن گیا تھا اور اس کا والد شہباز خان مغلوں کے جاگیردار کی حیثیت سے یوسف زئی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ خوشحال خان کی شہنشاہ اورنگزیب کے خلاف ابتدائی سرکشی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دریائے سندھ کے ٹول ٹیکس کی منسوخی سے اس کے مالی مفاد کو نقصان پہنچا تھا لیکن دوسری اور غالباً بڑی وجہ اس کی خٹک قبیلے کے یوسف زئی قبیلہ کے ساتھ دیرینہ عداوت میں مضمر تھی۔ اس کی اس سرکشی میں پختون قوم کی آزادی کے لئے کسی جذبہ کی کوئی کارفرمائی نہیں تھی۔

تاہم اس نے اورنگ زیب کے خلاف بیس نظمیں لکھیں جن میں اس نے اپنے اس دشمن کو ایک ایسا منافق، دغاباز، بددیانت، بے ایمان، ظالم، جابر اور دروغ گو قرار دیا جس نے محض اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہ صرف اپنے والد کو قید کیا تھا بلکہ اپنے بھائیوں کو بھی قتل کر دیا تھا۔ اس کی ان زہر آلود نظموں میں سے ایک نظم کا بند یہ ہے:

میں اورنگزیب کے عدل وانصاف کو اچھی طرح جانتا ہوں
میں اس کی مذہبی عقیدت، روزہ داری اور عبادت گزاری کی حیثیت سے واقف ہوں
اس نے اپنے بھائیوں کو یکے بعد دیگرے نہایت ظالمانہ طور پر تہ تیغ کیا ہے
اس نے اپنے والد کو میدان جنگ میں شکست دینے کے بعد پابند سلاسل کر دیا ہے
خواہ کوئی آدمی ہزاروں مرتبہ زمین پر اپنی پیشانی رگڑے
یا روزہ داری سے اپنے پیٹ کو ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ملا دے
اگر وہ فی الحقیقت نیک عمل کرنے کی خواہش نہیں رکھتا
تو اس کی ساری حمد وثنا اور خشوع وخضوع سراسر نمائشی اور جھوٹ ہے
جس کی زبان کچھ کہتی ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے
اس کے سارے اعضا کاٹ دینے چاہئیں اور اس کا قیمہ کر دینا چاہیے
بظاہر یہ سانپ خوبصورت اور سڈول ہے
لیکن اس کے اندر گندگی ہے اور زہر بھرا ہوا ہے
حقیقی مرد وہ ہوتا ہے جو عمل زیادہ کرتا ہے اور بولتا کم ہے
بزدل بہروپیے کے اعمال کم اور برے ہوتے ہیں، وہ بڑھکیں زیادہ مارتا ہے
چونکہ خوشحال کے ہاتھ اس دنیا میں ظالم تک نہیں پہنچ سکتے
میری دعا ہے کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ اس کی بخشش نہ کرے [10]

شہنشاہ اورنگزیب کی شخصیت کے بارے میں خوشحال خان کا یہ تجزیہ صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ آج تک نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ پورے پاکستان بلکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت صحیح یا غلط طور پر اورنگ زیب کے خلاف خوشحال خان کی اس تلخ نوائی سے شدید اختلاف کرتی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ خوشحال خان نے محض ذاتی عناد کی بنا پر اورنگزیب کی

کردار کشی کی تھی اور اس قسم کے باغی عناصر بالآخر برصغیر میں مغلوں کی مسلم مملکت کی تباہی کا باعث بنے تھے۔ تاہم افغان حکمرانوں نے 1952ء میں جب کابل میں ''خوشحال خان سکول'' کھولا تھا تو ان کا خیال تھا کہ سترھویں صدی کے اس قبائلی جاگیردار شاعر کو پاکستان کے خلاف پختون عصبیت کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے صوبہ سرحد کے عوام کے علم و دانش، فہم و فراست اور سیاسی و معاشرتی شعور کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایشیا میں سینکڑوں سال پرانے جاگیرداری وقبائلی نظریات کو زندہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پختونستان کا تصور محض عبدالقیوم خان جیسے حکمرانوں کی بدعنوانیوں کی وجہ سے زندہ رہ سکتا تھا اور اس بدبخت نے اسے زندہ رکھا۔ خوشحال خان کی شاعری اسے کوئی زندگی نہیں بخش سکتی تھی۔

1952ء کے بعد افغان حکمرانوں نے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کے میدان میں جو سب سے بڑا کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے ایک پیشہ ور سفارت کار عبدالرحمان پژواک نے تقریباً 150 صفحے کی ایک کتاب لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ امیر عبدلرحمان نے 1893ء میں حکومت برطانیہ کے ساتھ سرحد بندی کا معاہدہ مجبوری کے تحت کیا تھا اس لئے اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے اور اس بنا پر حکومت افغانستان یک طرفہ طور پر کھینچی ہوئی ڈیورنڈ لائن کو مسترد کرنے میں حق بجانب ہے جس کی وجہ سے بہت سے قبائل جبری طور پر دو ملکوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ مجوزہ پختونستان کا علاقہ ستر لاکھ پختونوں کی آبادی پر مشتمل ہے اور اس کا 190000 مربع میل علاقہ پامیر سے لے کر بحیرہ عرب اور ایرانی سرحد تک پھیلا ہوا ہے یعنی دریائے سندھ اور افغانستان کی سرحد تک کا سارا علاقہ پختونوں کا علاقہ ہے۔ اس میں چترال، ہزارہ، کوہستان، سوات، بونیر، دیر، پشاور، تیرہ، باجوڑ، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، وزیرستان، خیبر، پیزو، گومل، بولان اور مالاکنڈ شامل ہیں۔[11] اس کا موقف یہ ہے کہ جب 1947ء میں برصغیر سے برطانیہ کی دستبرداری کے بعد پاکستان کی مصنوعی ریاست معرض وجود میں لائی گئی تھی تو اس علاقے کے پختونوں کو حق خود ارادیت نہیں دیا گیا تھا لیکن وہ اپنے اس ''پختونستان'' میں نہ تو افغانستان کا ایسا کوئی علاقہ شامل کرتا ہے جہاں پشتو بولنے والے لوگ رہتے ہیں اور نہ ہی وہ ان افغانستانی پختونوں کے حق خود ارادیت کی کوئی بات کرتا ہے۔ وہ

یہ بھی نہیں بتاتا کہ تاریخ کے کس دور میں پختونوں کے اس علاقے نے ایک آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کی تھی اور یہ ریاست کب تک قائم رہی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ پختونوں کی جدوجہد آزادی کا پاکستان کی مصنوعی ریاست کے قیام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ سینکڑوں سال سے اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی غیر ملکی طاقت کی غلامی قبول نہیں کی۔ وہ بابر کے عہد سے لے کر برطانوی اقتدار کے زوال تک پختونستان کے قیام کا مسلسل مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی مغلوں کے غلبہ کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ یہ مانتا ہے کہ مغلوں کے خلاف قبائلی سرداروں نے جو وقتاً فوقتاً بغاوتیں کی تھیں وہ "غدار عناصر" کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ بابر نے اس مقصد کے لئے یوسف زئی کے ایک سردار ملک شاہ معصوم کی بیٹی بی بی مبارکہ سے شادی کر لی تھی اور اکبر نے رشوت اور تفرقہ انگیزی کے ذریعے کچھ "غدار" پیدا کر لئے تھے اور وہ پہلے جلال الدین ☆ کی طاقت کو کمزور کرنے اور بالآخر اس کی شکست کا باعث بنے تھے۔

خوشحال خان کی طرح عبدالرحمان پژواک بھی شہنشاہ اورنگزیب کے خلاف بہت زہرفشانی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اورنگزیب کی پالیسی کی بنیاد قبائلیوں میں تفرقہ ڈالنے پر تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مسلم حکمران کے طور پر پیش کر کے پختونوں کے اسلامی جذبہ سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنی آزادی اور قوم پرستی کو ترک کر دیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پشتونوں کے خلاف ایک سامراجی پالیسی کو مذہبی لبادہ پہنا کر استعمال کیا گیا تھا۔ مگر پشتون اپنے سیاسی نصیب سے باخبر تھے۔ انہوں نے اس جھانسے میں آنے سے انکار کر دیا اور خوشحال خان کی زیر قیادت خٹک قبیلہ نے آفریدیوں کے ساتھ مل کر مغلوں کی مزاحمت کی۔ تاہم پژواک تسلیم کرتا ہے کہ قبل ازیں خوشحال خان شہنشاہ شاہ جہاں کا وفادار ملازم تھا اور اس نے اس مغل بادشاہ کی طرف سے فوجی مہمات میں حصہ لیا تھا۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ خوشحال خان کے بیٹے بہرام خان نے اورنگزیب کے ساتھ مل کر اپنے باپ کے خلاف لڑائی کی تھی۔[12] لیکن یہ نہیں بتاتا کہ اس لڑائی میں بیٹا فتح یاب ہوا تھا اور باپ کو شکست ہوئی تھی۔

☆ اکبر کے عہد کا ایک پٹھان قبائلی سردار جس نے تیرہ کے علاقہ میں مغل سلطنت کے خلاف کئی سال تک سرکشی جاری رکھی۔ پٹھان اسے جلال الدین پیر روشن کے نام سے یاد کرتے ہیں جبکہ اکبر کا سرکاری مورخ ابوالفضل اکبرنامہ میں اس کا ذکر جلالہ تاریکی کے نام سے کرتا ہے۔ (مرتب)

عبدالرحمان پژواک مزید لکھتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی نوآبادیت کی آمد اور مغرب کی سامراجی رقابتوں نے افغانستان میں ایسے افسوسناک حالات پیدا کر دیئے تھے کہ رنجیت سنگھ نے جسے افغان بادشاہ نے دریائے سندھ کے اس پار کے اپنے مقبوضہ علاقہ کا انتظام سپرد کر رکھا تھا، اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور اس نے پنجاب پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بعدازاں اس نے انگریزوں کی امداد سے دریائے سندھ کے مغربی علاقے میں بھی اثر پھیلا لیا۔ اس طرح اس کی حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے پشاور پر حملہ کر دیا اور اس کے بعد پختون قوم کی شدید جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا۔ سکھ اس علاقے پر اپنا اقتدار کبھی بھی قائم نہیں کر سکے تھے کیونکہ پختونوں کی جدوجہد آزادی مسلسل جاری رہی تھی۔ سکھوں کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے اس علاقے میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی کوشش کی تو انہیں بھی پختونوں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کو اپنے 70 سالہ دور اقتدار میں پختون حریت پسندوں کے خلاف 25 مرتبہ فوجی کاروائیاں کرنا پڑیں۔ انہوں نے 17 تعزیری فوجی کاروائیاں صرف وزیرستان میں کیں جہاں انہیں بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا۔ پژواک برطانوی سامراج کی افغانستان کو ''بفرسٹیٹ'' بنانے کی پالیسی کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ صرف اتنا لکھتا ہے کہ ''حکومت برطانیہ نے 1893ء میں افغانستان کی سرحد بندی کے بارے میں جو معاہدہ کیا تھا وہ غیر مساوی تھا۔ اس پر مجبوری کے تحت دستخط کئے گئے تھے اور افغانستان پر اسے فوجی قوت کے ذریعے ٹھونسا گیا تھا۔ پختونوں کے علاقہ کا مسئلہ حکومت برطانیہ اور افغانستان کے درمیان ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا۔ پختونستان کے عوام غیر ملکی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے۔ اس معاہدے کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کا ڈیورنڈ لائن سے متعلقہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔''[13]

اگرچہ افغان سفارت کار نے اپنے ان بیانات میں تاریخی حقائق کو بری طرح مسخ کیا ہے اور بہت سے ایسے حقائق کا ذکر ہی نہیں کیا جو اس کے موقف کے حق میں نہیں ہیں۔ تاہم اس کا یہ بیان تاریخی لحاظ سے بے بنیاد نہیں ہے کہ حکومت برطانیہ نے 1893ء میں امیر عبدالرحمان سے سرحد بندی کا جو معاہدہ کیا تھا وہ غیر مساوی تھا۔ چودھری محمد علی، ایس۔ ایم۔ برک اور بعض دوسرے پاکستانی مورخین کا یہ موقف بین الاقوامی قانون کے تحت صحیح ہے کہ ''حکومت افغانستان

اب اس معاہدے کو چیلنج کرنے کی مجاز نہیں ہے کیونکہ یہ معاہدہ امیر عبدالرحمان کی اپنی خواہش کے مطابق ہوا تھا اور بعد میں 1905ء، 1919ء، 1921ء اور 1930ء میں اس کی توثیق کی گئی تھی۔ حکومت برطانیہ نے پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے پر افغانستان کے دعویٰ کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا تھا اور اب حکومت پاکستان حکومت برطانیہ کے وارث کی حیثیت سے اس سارے علاقے کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی حقدار ہے'' لیکن ان کا یہ موقف تاریخی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 80-1879ء کی دوسری افغان جنگ کے بعد افغانستان کی حیثیت ایک آزاد و خودمختار ملک کی نہیں رہی تھی۔ وہ برطانوی سامراج کا ایک زیر تحفظ یا طفیلی ملک بن گیا تھا۔ امیر عبدالرحمان برطانوی سامراج کی امداد سے برسر اقتدار آیا تھا اور اس بنا پر وہ کوئی خودمختار حکمران نہیں تھا بلکہ ایک وظیفہ خوار طفیلی حکمران تھا۔ اسے کابل کے تخت پر بٹھانے کی ایک بڑی شرط یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا تعین کرے گا۔ اگر برطانوی سامراج چاہتا تو وہ افغانستان کو بآسانی اپنی ہندوستانی سلطنت میں مدغم کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا محض اس لئے نہ کیا کہ اس نے روسی سامراج سے مفاہمت کے بعد افغانستان کو اپنی بالادستی میں ایک ''بفر سٹیٹ'' بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ 1905ء میں امیر حبیب اللہ خان بھی کوئی آزاد و خودمختار حکمران نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ امیر عبدالرحمان کی طرح برطانوی سامراج کا وظیفہ خوار تھا۔ اس لئے اس کی جانب سے حکومت برطانیہ سے جو معاہدہ کیا گیا تھا اسے بھی تاریخی لحاظ سے مساوی معاہدہ نہیں کہا جا سکتا۔ امیر حبیب اللہ میں برطانوی سامراج کی کسی خواہش کی خلاف ورزی کرنے کی ہمت یا طاقت نہیں تھی۔ البتہ 1919ء اور 1921ء میں سامراج دشمن امیر امان اللہ خان نے حکومت برطانیہ سے جو معاہدات کئے تھے انہیں بہت حد تک مساوی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس زمانے میں گاندھی کی عدم تعاون کی پر تشدد تحریک اور علی برادران کی تحریک خلافت کی وجہ سے برصغیر میں برطانوی سامراج کے اقتدار کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور روس میں لینن کی زیر قیادت پرولتاری انقلاب کامیاب ہو چکا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر برطانوی سامراج کی افغانستان کے بارے میں نئی پالیسی یہ تھی کہ جنگی اہمیت کے اس علاقے پر محض بزور قوت اپنی سامراجی پالیسی نہ ٹھونسی جائے بلکہ اس مقصد کی تکمیل سیاسی اور سفارتی سازشوں کے ذریعے کی جائے۔ بالآخر یہ سازشیں کامیاب ہوئیں۔ 1928ء میں امان اللہ خان کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کی جگہ 1929ء میں درانی قبیلہ کے ایک

غدار خاندان کا جرنیل نادر شاہ برطانیہ کی امداد سے کابل کے تخت پر براجمان ہو گیا۔ چنانچہ اس نے بھی حسب توقع لندن میں افغان سفیر کی وساطت سے 1921ء کے معاہدہ کی توثیق کر دی تھی۔

لیکن 1893ء کے معاہدے کو تاریخی لحاظ سے غیر مساوی تسلیم کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ برصغیر سے برطانوی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ یہ معاہدہ اور 1921ء کا معاہدہ قانونی طور پر غیر موثر ہو گیا تھا۔ یہ موقف بین الاقوامی قانون کے تحت بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر دنیا کے موجودہ نقشے میں بے شمار تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ برطانیہ، روس، اٹلی، فرانس، جرمنی، امریکہ اور جاپان کے علاوہ متعدد مغربی سامراجی ممالک نے سولہویں صدی کے بعد ساری دنیا میں بے شمار غیر مساوی سرحدی معاہدے کئے تھے۔ اگر آج کل ان تاریخی بے انصافیوں کا ازالہ شروع کر دیا جائے تو پھر دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جس کی سرحدوں میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں نہیں کرنی پڑیں گی۔ اگر دنیا میں اس قسم کی جغرافیائی افراتفری مچ جائے تو معلوم نہیں بالآخر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ مزید برآں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ نے 1849ء میں شمال مغربی سرحدی علاقہ سکھوں سے بزور قوت حاصل کیا تھا۔ امیر دوست محمد خان نے انگریزوں کی سکھوں سے دوسری جنگ کے دوران سکھوں کے حلیف کی حیثیت سے دو ایک ماہ کے لئے اس علاقے پر قبضہ کیا تھا لیکن جب سکھوں کو شکست ہو گئی تو افغان حکمران بھی بھاگ گیا تھا اور انگریزوں نے صرف سکھوں کی سلطنت کی درہ خیبر کی حد تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ انہوں نے اس وقت اس سے آگے جانے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کی تھی کہ اس طرح روسی سامراج سے تصادم کے خطرہ کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ لہٰذا افغان حکمرانوں کو 1947ء میں اور اس کے بعد اس علاقے میں دعویٰ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں جس پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہونے کے زمانے میں ان کا قبضہ ہی نہیں تھا۔ رنجیت سنگھ نے درہ خیبر تک کے علاقے پر انگریزوں کی آمد سے بہت پہلے قبضہ کر لیا تھا جبکہ افغانستان مسلسل طوائف الملوکی کا شکار تھا۔

افغان سفارت کار کا یہ موقف بھی صحیح نہیں کہ ڈیورنڈ لائن متعلقہ قبائلی عوام کے رجحانات اور ضروریات کا لحاظ کئے بغیر محض کاغذ پر بلا سوچے سمجھے کھینچ دی گئی تھی۔ خان عبدالغفار خان کا بیٹا عبدالولی خان اور اس کے ساتھی بھی کھلم کھلا افغان حکمرانوں کے اس موقف کی تائید کر کے پاکستان کی بین الاقوامی سرحد کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ وہ اعلانیہ امیر عبدالرحمان کے

ان الفاظ سے اتفاق کرتے تھے کہ ''یہ لائن افغانوں کے جسم میں سے گزرتی ہے اور اس کے ایک عضو کو دوسرے عضو سے جدا کرتی چلی گئی ہے۔'' اس گمراہ کن موقف کی تردید کرنے والی ایک حقیقت کی نشاندہی جان سی گرفتھس (John C. Griffths) نے کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''ڈیورنڈ لائن عمومی طور پر ان قبائلی سرحدوں پر کھینچی گئی تھی جو پشاور، کوہاٹ، بنوں، ٹانک اور کوئٹہ کی منڈیوں میں جانے والے قبائل کو ان قبائل سے الگ کرتی تھی جن کے معاشی روابط خراسان سے تھے اور خرید وفروخت کے لئے غزنی اور قندھار کی منڈیوں میں جاتے تھے۔ اس لائن سے صرف دو جگہوں پر مہمند اور وزیری قبائل تقسیم ہوئے تھے۔ مہمند قبیلہ کے ہمیشہ سے دو رجحانات تھے۔ اس کے بالائی طبقہ کا رخ ہمیشہ پشاور کی بجائے لال پور اور جلال آباد کی طرف ہوتا تھا۔ لہٰذا اس طبقہ کا علاقہ امیر افغانستان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک وزیروں کا تعلق تھا ان میں سے جو تھوڑے سے وزیری برمل میں رہتے تھے انہیں افغانستان میں ہی رہنے دیا گیا تھا جبکہ ان کی بھاری اکثریت ہندوستان میں رہی تھی۔''[14]

اولف کیرو لکھتا ہے کہ صرف دو جگہوں کے سوا افغانستان اور ہندوستان کے درمیان سرحد کی نشاندہی موقع پر تعمیر کر کے کی گئی تھی۔ یہ برجیاں اب وہاں موجود نہیں ہیں۔ پہلی جگہ جہاں موقع پر نشاندہی نہیں ہوئی تھی چترال کی سرحد تھی لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے دوران سرحد بندی کی یہ کمی پوری کر دی گئی تھی۔ دوسری جگہ کنڑ اور باجوڑ کو الگ کرنے والی پہاڑیوں پر واقع تو اں سر سے لے کر سفید کوہ کے مغربی کنارے کی سکارم چوٹی تک تھی۔ یہ سیکٹر مہمند کے علاقے سے گزرتا ہے اور اسے تقسیم کرتا ہے اور اس میں خیبر اور افغانستان کی طرف کی آفریدی سرحدیں شامل ہیں۔ 1919ء کی تیسری افغان جنگ کے بعد درہ خیبر کے مغربی کنارے پر اس کے ایک چھوٹے سے علاقے کی موقع پر سرحد بندی کی گئی تھی۔ بقیہ سیکٹر کی موقع پر کبھی بھی نشاندہی نہیں ہوئی۔ یہ بات دس ہزار سے لے کر سولہ ہزار فٹ بلند سفید کوہ کے عظیم سلسلے اور آفریدیوں اور افغانستان کے درمیان نمایاں اور مسلمہ سرحد سے متصل علاقے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن اس بنا پر دریائے کابل کے شمال کی طرف مہمند علاقے میں مشکلات پیدا ہوئی ہیں کیونکہ ڈیورنڈ لائن نے اس علاقے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ حکومت ہندوستان نے ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے افغان امیر کو ایک متبادل سرحد کی پیش کش کی تھی۔ اس مجوزہ سرحد بندی سے بوہائی داگ ویلی

افغانستان کے پاس رہتی مگر اس تجویز پر پھر کوئی عمل نہیں ہوا تھا۔اولف کیرو مزید لکھتا ہے کہ سفید کوہ کے ساتھ ساتھ موقع پر سرحد کی نشاندہی نہ کرنے کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس سلسلہ کوہ کی چوٹی اس سارے علاقے میں ایک نمایاں اور قدرتی سرحد ہے۔خیبر کے مغربی علاقے میں موقع پر سرحد کی نشاندہی نہ کرنے کی یہ کمی 1919ء میں پوری کر دی گئی تھی لیکن مہمند کے علاقے میں مشکل درپیش رہی۔ اس مشکل کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی جغرافیائی سرحد قبائلی سرحد سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ڈیورنڈ لائن کنڑ اور باجوڑ کو الگ کرنے والے علاقے کے ساتھ ساتھ دریائے کابل کی طرف اس طرح کھینچی گئی تھی کہ امیر عبدالرحمان کے بیان کے مطابق لال پور افغانستان کے پاس رہا تھا اور یہ شن پوخ کے نزدیک دریا تک پہنچی تھی۔عبدالرحمان کی بیان کردہ اس لائن سے بھی سارے کاما اور گوشتا کے مہمند افغانستان میں رہ گئے تھے جبکہ ہندوستان میں بائی زئی اور خوئی زئی کے ان مہمندوں کو رکھا گیا تھا جن کے پشاور کے ساتھ کوئی سیاسی تعلقات نہیں تھے اور جو کوئی الاونس نہیں لیتے تھے۔ چونکہ جو بین الاقوامی سرحد کسی قبیلے کی وفاداری کو تقسیم کر دے وہ بآسانی بدامنی کا باعث بن جاتی ہے اس لئے 1893ء کے معاہدے کے چند سال بعد افغان امیر کو مہمند علاقے کے مشرق کی طرف ایک نئی سرحد کی پیشکش کی گئی تھی۔ اگر یہ پیشکش قبول کر لی جاتی تو متعدد بالائی مہمند قبیلوں کی وفاداری رسمی طور پر اس کی طرف منتقل ہو جاتی۔ اگرچہ یہ پیش کش کبھی قبول نہیں کی گئی تھی لیکن 1947ء تک یہ موجود رہی تھی اور پشاور کی جانب سے ان دونوں سرحدوں کے درمیانی علاقے کے قبیلوں سے معاہدات کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اس غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے برطانوی ارباب اختیار کو ایک سے زیادہ مرتبہ پریشانی لاحق ہوئی تھی اور وہ اپنا یہ حق بتانے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اگر ان قبائل نے کوئی معاندانہ اقدام کیا تو ان کے اڈے پر مؤثر کاروائی کرنے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔[15]

تاہم اگر امیر عبدالرحمان اور عبدالولی خان کے اس بیان کو تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ڈیورنڈ لائن، افغانوں کے جسم میں سے گزرتی ہے اور اس کے ایک عضو کو دوسرے عضو سے جدا کرتی چلی گئی ہے'' تو بھی یہ بات اس لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم نہ کرنے کا جواز پیدا نہیں کرتی۔ براعظم افریقہ اس قسم کی پیچیدہ، مبہم اور غیر واضح سرحدوں سے بھرپور ہے۔ اس وسیع وعریض براعظم کے تقریباً پچاس ممالک کے صحرائی اور جنگی قبائل کئی

ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے معاشرتی اور معاشی تقاضوں کے تحت عملی طور پر ان ممالک کی بین الاقوامی سرحدوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان سرحدوں کا تعین مغربی سامراجیوں نے اس طرح کیا تھا جس طرح کہ ڈیورنڈ لائن کا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود تقریباً سارے افریقی ممالک ایک دوسرے کی بین الاقوامی سرحدوں کو تسیلم کرتے ہیں۔ لاطینی امریکہ کے تقریباً چالیس ممالک کے ایک ہی زبان بولنے والے پہاڑی قبائل بہت سے ملکوں میں منقسم ہیں اور ان کی ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے لیکن اس پر کبھی کسی نے لاطینی امریکہ کے کسی ملک کی بین الاقوامی سرحد کے جواز کو چیلنج نہیں کیا۔ یورپ میں البانوی زبان بولنے والے پہاڑی قبائل دوملکوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یوگوسلاویہ کا ایک پوراصوبہ البانوی زبان بولنے والی آبادی پر مشتمل تھا اور ان کے معاشرتی اور معاشی روابط کچھ عرصہ پہلے تک البانیہ کے قبائل سے قائم تھے لیکن اس کے باوجود ان دونوں ملکوں کی سرحدیں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ تھیں اور کسی کو ان سرحدوں پر اعتراض کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ رومانیہ، ہنگری اور مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں کی اس قسم کی بین الاقوامی سرحدوں کی متعدد مثالیں موجود ہیں اور کبھی کبھی اخبارات میں ان کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا ہے جرمن زبان بولنے والے کروڑوں لوگ چیک ری پبلک، سلواکیہ، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ میں منقسم ہیں لیکن ہٹلر کے سوا کبھی کسی نے اس بنا پر ان ممالک کی بین الاقوامی سرحدوں کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا۔ مشرق وسطیٰ میں کردستان کے علاقے اور ان کے ایک ہی زبان بولنے والے پہاڑی قبائل تین ملکوں یعنی عراق، ایران اور ترکی میں بکھرے پڑے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی اس علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کی شخصیت اتنی عظیم اور اس کی سلطنت اتنی وسیع تھی کہ ان کے مقابلے میں احمد شاہ ابدالی اور اس کی عارضی سلطنت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ امریکہ اور ایران کے خفیہ سازشی اداروں کی طرف سے کبھی کبھی اس علاقے میں عراق کے خلاف بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن کبھی کسی نے سرکاری طور پر عراق کی بین الاقوامی حدود کے مسترد کرنے کی جرأت نہیں کی۔ روسی ترکستان اور چینی سنکیانگ کی سرحد کی بھی یہی حالت ہے۔ اس سرحدی علاقے کے ایک ہی زبان بولنے والے قبائل کی آمدورفت کسی پاسپورٹ کے بغیر اس بین الاقوامی سرحد کے دونوں طرف جاری رہتی ہے اور روس اور چین میں کسی نے بھی کم ازکم اس علاقے کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں کیا۔

ہندوستان، برما اور بنگلہ دیش کے پہاڑوں میں رہنے والے سرحدی قبائل کو معلوم نہیں کہ بین الاقوامی سرحد کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ کھلم کھلا اور بلا روک ٹوک تینوں ممالک میں آتے جاتے رہتے ہیں لیکن دہلی، رنگون اور ڈھاکہ میں سے کسی نے بھی کبھی دوسرے ملکوں کی بین الاقوامی سرحد کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ منگولیا کا ایک بڑا علاقہ طویل عرصے سے چین کی تحویل میں ہے حالانکہ چینی منگولیا اور آزاد منگولیا کے عوام کی زبان اور ثقافت مشترکہ ہے لیکن بین الاقوامی طور پر ان ممالک کی سرحدیں تسلیم شدہ ہیں اور ان کے بارے میں کبھی کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔ اس قسم کی سرحدوں کی مثالیں، ویتنام، لاؤس، تھائی لینڈ اور جنوب مشرقی ایشیا کے متعدد دوسرے ممالک میں بھی موجود ہیں۔ اگر ساری دنیا کی ان سرحدوں میں لسانی یا معاشرتی یا ثقافتی یا معاشی وجوہ کی بنا پر رد و بدل کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو دنیا کا نقشہ کیا سے کیا ہو جائے گا کیونکہ بہت سے ممالک کے وجود کا کوئی جواز ہی نہیں رہے گا۔ بڑی مچھلیاں ساری چھوٹی مچھلیوں کو نگل جائیں گی اور خود مملکت افغانستان بالکل ناپید ہو جائے گی کیونکہ اس کے علاقے انہی وجوہ کی بنا پر کم از کم تین ملکوں میں یعنی روس، ایران اور پاکستان میں تقسیم ہو جائیں گے۔ افغان حکمرانوں کا یہ موقف بھی غلط تھا اور ہے کہ چونکہ ایرانی بادشاہ نادر خان کے قتل کے بعد اس کی فوج کا ایک جونیئر آفیسر احمد شاہ ابدالی، 73-1747ء، میں پہلی مرتبہ ایسی افغان سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا علاقہ دریائے آمو اور تبت سے لے کر دہلی اور کراچی تک پھیلا ہوا تھا اس لئے افغان دریائے سندھ کے سارے شمالی علاقے کی ملکیت کے حقدار ہیں جب وہ اس قسم کی باتیں کہتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کی سلطنت کے قیام سے قبل سینکڑوں سال تک کابل کا علاقہ دہلی دربار کا محض ایک صوبہ تھا۔ پھر سکھوں کے عہد میں لاہور دربار کا حکم درہ خیبر تک چلتا تھا اور بالآخر انگریزوں کے عہد میں ان کے حکم کی تعمیل نہ صرف درہ خیبر تک ہوتی تھی بلکہ کابل کا کوئی طفیلی حکمران ان کے حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کر سکتا تھا۔ اگر عبدالولی خان کا یہ بیان صحیح ہے کہ ''افغان دوسری افغان جنگ کے اختتام سے لے کر اب تک ڈیورنڈ لائن پر برابر اعتراض کرتے چلے آ رہے ہیں۔'' تو یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت سے لے کر اب تک سارے افغان حکمران باقاعدہ معاہدوں کے ذریعے اس لائن کی توثیق کرتے رہے ہیں۔ ان افغان حکمرانوں کو اس مسئلہ پر برطانوی سامراج سے محاذ آرائی کرنے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی تھی لیکن 1947ء کے بعد پاکستان

کے خلاف ان کے اس سلسلے میں معاندانہ رویے کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہیں اپنی پاکستان دشمنی میں
ہندوستان کے علاوہ سوویت یونین کی بھی تائید وحمایت حاصل تھی۔

باب:9

قیوم شاہی کا خاتمہ اور عبدالغفار خان کی سیاسی بحالی

پاکستان کی آزادی، خودمختاری اور سالمیت کے خلاف افغانستان کے اس معاندانہ رویے کا صوبہ سرحد کے آمر مطلق خان عبدالقیوم خان پر کوئی صحت منداثر نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ اس نے اگست 1948ء میں خان عبدالغفار خان اور اس کی خدائی خدمت گار تنظیم کو کچلنے کے بعد اپنے خونخوار پنجے ان مسلم لیگی عناصر کی طرف بڑھائے جنھوں نے تحریک پاکستان میں گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں اور جو اس بنا پر ''شیر سرحد'' کی حکمرانی کو کسی نہ کسی وقت چیلنج کر سکتے تھے۔ اس نے سب سے پہلا وار 1949ء کے اوائل میں صوبہ سرحد کے ممتاز ترین مسلم لیگی قائد پیر امین الحسنات آف مانکی شریف پر کیا کیونکہ اس شریف آدمی نے صوبائی مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں سرحد کے اس نام نہاد ''مرد آہن'' کی دھاندلیوں کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ پیر مانکی نے لاہور کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں بہت واویلا کیا کہ مگر اس کا یہ احتجاج اس لئے مؤثر ثابت نہ ہوا کہ خان عبدالقیوم خان نے اس وقت تک پنجاب کے بعض باغی عناصر کے خلاف لیاقت علی خان کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ اس گٹھ جوڑ کا مظاہرہ اپریل 1949ء میں ہوا جبکہ مرکزی مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخاب میں نہ تو پنجاب کا کوئی نمائندہ کسی عہدہ پر منتخب ہوسکا اور نہ ہی پیر مانکی کی عبدالقیوم خان کی آمریت کے خلاف کوئی شنوائی ہوئی۔ پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کے لئے لیاقت علی خان کے نمائندے چودھری خلیق الزماں کو چن لیا گیا اور سیکرٹری شپ عبدالقیوم خان کے نمائندے یوسف خٹک کو دے دی گئی۔ ایک جائنٹ سیکرٹری سندھ اور دوسرا مشرقی بنگال سے لیا گیا۔

کراچی میں اس کامیابی کے بعد ''خان اعظم'' اپنی ''سلطنت سرحد'' میں واپس آیا تو

وہ اور بھی کھل کھیلا۔ اس نے پیر مانکی اور اس کے حامیوں کی زندگیاں محال کر دیں۔ اس نے ان میں سے متعدد کے خلاف جھوٹے مقدمے بنائے اور کئی ایک کو مقدمہ چلائے بغیر سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا۔ اس کے معتوبین میں ثمین جان اور ارباب عبدالغفور جیسے مسلم لیگی رفقا بھی شامل تھے۔ وہ کسی کو کوئی جلسہ کرنے یا بیان دینے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کوئی اخبار اس کی مرضی کے بغیر کوئی خبر نہیں چھاپ سکتا تھا۔ پیر مانکی اس کی اس قسم کی آمرانہ کاروائیوں سے تنگ آ گیا تو اس نے ستمبر 1949ء میں اس تاثر کے تحت ایک نئی صوبائی سیاسی جماعت ''عوامی مسلم لیگ'' کی داغ بیل ڈالی کہ قیوم خان کی من مانی کاروائی کے خلاف مرکزی مسلم لیگ سے کوئی مؤثر اپیل کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

پیر مانکی کی اس جرأت مندانہ کاروائی کے بعد وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے نوزائیدہ عوامی مسلم لیگ کے ارکان کی سیفٹی ایکٹ کے تحت پکڑ دھکڑ کا سلسلہ اس قدر وسیع پیمانہ پر شروع کیا کہ پاکستان کے جمہوریت پسند عناصر دنگ رہ گئے۔ گرفتار شدگان کی داد فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ مرکز میں لیاقت علی خان کی حکومت اپنے وسیع تر مفاد کی خاطر قیوم خان کی ہر کاروائی کو جائز تصور کرتی تھی۔ پشاور کے ایک جریدہ ''سرحد'' نے اس قسم کی کاروائیوں کے خلاف احتجاج کیا تو اس کے مدیر کو 16 ردسمبر 1949ء کو گرفتار کر کے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت غیر معین عرصہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا چونکہ اس وقت تک نواب زادہ لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف پنجاب میں نواب ممدوٹ کی زیر قیادت جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کا ایک طاقتور گروہ پیدا ہو چکا تھا۔☆ اس لئے اب پاکستان کے وزیر اعظم کے حلیف خان عبدالقیوم خان کو ''مثالی حکمران'' تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ پنجابی اخبارات میں اس پر نکتہ چینی شروع ہو گئی تھی۔ اس گروہ کے اس ''جمہوریت پسند'' رویے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس گروہ نے لیاقت علی خان کے مقابلے میں حسین شہید سہروردی، جس نے لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی، کی قیادت کی حوصلہ افزائی شروع کر دی تھی۔ پیر مانکی نے اس صورت حال کو غنیمت سمجھا اور اس نے فروری 1950ء میں لاہور میں سہروردی کے ساتھ مل کر ''پاکستان عوامی مسلم لیگ'' کی

☆ تفصیل کے لئے دیکھیے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 4۔ جناح لیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد۔ ایڈیشن دوم 2013ء زاہد چودھری۔ تکمیل و ترتیب حسن جعفر زیدی۔ ادارہ مطالعہ تاریخ

بنیاد ڈال دی جس کا وہ خود صدر منتخب ہو گیا لیکن بقول عبدالولی خان ''موٹی کھال اور بلند آواز رکھنے والا بے ضمیر قیوم خان'' ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی آمرانہ پالیسی میں اور بھی سختی آ گئی۔ یہاں تک کہ عوامی مسلم لیگ کے زعماء بلبلا اٹھے۔ اس جماعت کے عہدیدار فضل حق شیدا نے 30ر جولائی کو ایک بیان میں پاکستان کے محب وطن جمہوریت پسندوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ عوامی مسلم لیگ کے کارکنوں کو فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت گرفتار کر کے ان سے جیلوں میں سرخ پوشوں سے بھی بدتر سلوک کیا جا رہا ہے مگر شیدا کا احتجاج صدا بہ صحرا ثابت ہوا اور سابق مسلم لیگی لیڈروں اور کارکنوں کی پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ 10ر اگست کو پشاور حمدیہ پریس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی کیونکہ اس میں چھپنے والے اخبار ''الجمعیت'' میں ایک ''قابل اعتراض'' مضمون شائع ہو گیا تھا۔

اکتوبر 1950ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان خود پاکستان مسلم لیگ کا صدر بن گیا تو عبدالقیوم خان کا فسطائی حوصلہ اور بھی بلند ہوا اور اس نے سرحد میں سیاسی مخالفوں کی پکڑ دھکڑ کی رفتار اتنی تیز کر دی کہ یوں لگتا تھا کہ سارا صوبہ سرحد ایک سیاسی قید خانہ بن گیا ہے جہاں کسی کو تڑپنے یا فریاد کرنے یا سر اٹھا کر چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی مہینے میں پنجاب میں نواب افتخار حسین آف ممدوٹ نے لیاقت علی خان کی حکومت اور اس کی مسلم لیگ سے بغاوت کر کے ''جناح مسلم لیگ'' کے نام سے ایک جماعت قائم کر لی جو دسمبر میں پیر مانکی اور حسین شہید سہروردی کی عوامی مسلم لیگ میں مدغم ہوئی تو ان تینوں عناصر کی جماعت کا نام محض اس لئے ''جناح عوامی مسلم لیگ'' رکھ دیا گیا کہ وہ عوام الناس کی قائداعظم اور مسلم لیگ کے ساتھ جذباتی وابستگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان کا الزام یہ تھا کہ لیاقت علی خان کی جعلی مسلم لیگ جناح کی اصلی مسلم لیگ سے مختلف ہے۔ یہ تینوں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے اس لئے خلاف تھے کہ وہ پنجاب اور سرحد میں صوبائی سطح پر دولتانہ اور قیوم خان کے ٹولوں کی پشت پناہی کرتا تھا اور کل پاکستان سطح پر وہ حسین شہید سہروردی کو اپنا بدترین سیاسی حریف تصور کرتا تھا۔

17ر مارچ 1951ء کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے صوبہ سرحد میں عام انتخابات کرانے کے لئے ایک قانون منظور کیا۔ جس کے فوراً بعد صوبائی اسمبلی توڑ دی گئی لیکن قیوم خان کی وزارت برقرار رہی اور اس طرح سرحد کے عوام الناس کا یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ قیوم خان نے

قائداعظم جناح کی زندگی میں لیاقت علی خان کے ساتھ خفیہ طور پر گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ جناح اپریل 1948ء میں سرحد کے عوام کو قیوم شاہی سے نجات دلانا چاہتے تھے مگر وہ لاکھوں مہاجرین کی آمد سے پیدا شدہ مشکلات، کشمیر کی لڑائی اور بعض دوسرے سنگین مسائل کی وجہ سے فوری طور پر ایسا نہیں کر سکے تھے اور انہوں نے پشاور کے جلسہ عام میں اس مقصد کے لئے سرحد کے عوام الناس سے مہلت مانگی تھی۔ 27/مارچ 1951ء کو پیر مانکی نے مرکزی حکومت کے اس غیر جمہوری فیصلے کے خلاف ایک جلسہ عام میں احتجاج کیا تو اسے صوبے سرحد سے بے دخل کر دیا گیا۔ پھر اپریل کے اواخر میں صوبائی مسلم لیگ کے انتخابات ہوئے تو وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان، وزیر اعظم لیاقت علی خان کی قائم کردہ روایت کے مطابق صوبائی مسلم لیگ کا صدر بن گیا۔ اس نے یہ غیر سرکاری عہدہ حاصل کرنے کے لئے سرکاری مشینری کے ذریعے اس قدر دھاندلی کی اور مسلم لیگی کونسلروں پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ مسلم لیگ میں اس کا مخالف دھڑا بلبلا اٹھا۔ اس کے مخالف لیگی دھڑے کی قیادت پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک اور مرکزی لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے رکن خان ابراہیم آف جھگڑا کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ دونوں ابتداً خان عبدالقیوم خان کی سفارش پر ہی مسلم لیگ ہائی کمان کے رکن بنے تھے لیکن بعد میں انہوں نے پنجاب کے دولتانہ گروپ سے گٹھ جوڑ کر کے ''خان اعظم'' کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ انہوں نے 29/اپریل کو ایک بیان میں مسلم لیگ کے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف سخت احتجاج کر کے اعلان کیا کہ وہ آئندہ مسلم لیگ کے کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ لیاقت علی خان ان دنوں پشاور میں ہی تھا مگر جب اس نے اس احتجاج کو قابل اعتنا نہ سمجھا تو سرحد کے باشعور سیاسی عناصر کو اشارہ مل گیا کہ آئندہ صوبائی اسمبلی کے عام انتخابات میں کیا ہونے والا ہے۔ 30/اپریل کو لیاقت علی خان نے نئی صوبائی مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''حیرت ہے کہ آج بھی بعض لوگ ہماری قومی جماعت مسلم لیگ اور حکومت کو دو مختلف چیزیں سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ پاکستان جیسے جمہوری ملک میں قومی سیاسی جماعت اور حکومت کو دوش بدوش چلنا چاہیے۔''[1] چنانچہ صوبہ سرحد میں یہ دونوں چیزیں کچھ اس طرح دوش بدوش چلیں کہ قیوم خان کے سیاسی مخالفین کا سرحد میں رہنا ہی محال ہو گیا۔ 17/مئی کو پیر مانکی کے سرحد میں داخلہ پر پھر پابندی عائد کر دی گئی جبکہ غلام محمد لونڈ خور کو پہلے ہی سرحد میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح ان دونوں کو عملاً صوبہ سرحد کی

شہریت سے ہی محروم کر دیا گیا تھا اور وہ لاہور میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔

6 رجون کو لاہور کے روزنامہ ''جہاد'' ☆ نے سیاسیات سرحد کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا جس میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی کہ ''صوبہ سرحد میں اس وقت مسلم لیگ کی حکومت برسر اقتدار ہے لیکن قائداعظم کی مسلم لیگ کے تمام پرانے لیڈر اور کارکن اس جماعت سے باہر ہیں۔ پیر مانکی شریف، خان ثمین جان، ارباب عبدالغفور، پیر زکوڑی شریف، خان بخت جمال یہ وہ تمام اصحاب ہیں جو صوبہ سرحد مسلم لیگ کے روح رواں تھے۔ سرحد میں سرخپوشوں کے اثر کا خاتمہ ان ہی لیڈروں اور کارکنوں کی مساعی کی وجہ سے ہوا مگر آج ان میں سے کسی کا نام بھی مسلم لیگ سے وابستہ نہیں سرخپوش جماعت خلاف قانون ہے مگر اسے بالکل مردہ سمجھنا غلطی ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب کو ایک بڑے طبقے میں آج بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔'' ادارہ نوائے وقت کی طرف سے سیاسیات سرحد پر اس مبنی برصداقت ادارتی تبصرے کا حقیقی پس منظر یہ تھا کہ نوائے وقت کے ممدوح نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی زیر قیادت پنجابی جاگیرداروں کے ایک گروہ اور درمیانہ طبقہ کے پنجابی شاؤنسٹوں کا نوابزادہ لیاقت علی خان کی حکومت سے کئی وجوہ کی بنا پر شدید تضاد پیدا ہو گیا تھا جبکہ عبدالقیوم خان نے لیاقت علی خان سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ چونکہ اسی بنا پر دسمبر 1950ء میں حسین شہید سہروردی، نواب ممدوٹ اور پیر مانکی شریف کے گروپوں کے ادغام سے ایک نئی سیاسی جماعت ''جناح عوامی مسلم لیگ'' کا قیام عمل میں آچکا تھا اس لئے ادارہ نوائے وقت لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف اس جماعت کی ترجمانی کرتا تھا۔ اب اس ادارے کی نظر میں خان عبدالقیوم خان ''سرحد کا مرد آہن'' اور ''مثالی حکمران'' نہیں رہا تھا۔ یہ ادارہ مرکزی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک اور مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے سرحدی رکن ابراہیم جھگڑا کے لیاقت علی خان اور قیوم خان کے خلاف باغیانہ رجحانات کی بھی حوصلہ افزائی کرتا تھا جبکہ قیوم خان ان دونوں کو ''پنجابیوں کے پٹھو'' قرار دیتا تھا۔

ستمبر 1951ء میں مرکزی پارلیمنٹ کے چھ ماہ قبل منظور کردہ قانون کے مطابق صوبہ سرحد میں عام انتخابات کی تیاریاں ''زور شور'' سے شروع ہوئیں لیکن یہ تیاریاں بالکل یک طرفہ

☆ یہ اداریہ نوائے وقت کی طرف سے شائع ہوتا تھا کیوں کہ پنجاب میں وزیراعظم لیاقت علی خان کے حلیف جاگیردار ممتاز دولتانہ کی نئی صوبائی حکومت نے نوائے وقت پر پابندی لگا رکھی تھی۔

تھیں۔ ضلع مردان کے جلاوطن لیڈر غلام محمد لونڈ خور کے 17 ستمبر کے ایک بیان کے مطابق ان دنوں صوبہ سرحد میں بدترین آمریت کا دوردورہ تھا اور قیوم خان کے مخالفین کو کسی سیاسی سرگرمی کی اجازت نہیں تھی۔[2] حسین شہید سہروردی کا 30 ستمبر کو بیان یہ تھا ''کہ اگر صوبہ سرحد میں حزب اختلاف کو انتخابات سے کافی عرصہ پہلے صوبہ میں پروپیگنڈا کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو اس کی پارٹی سرحد کے عام انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کردے گی۔'' اس نے پیر مانکی شریف، پیر زکوڑی شریف، غلام محمد لونڈ خور کے علاوہ جناح عوامی لیگ، کئی دوسرے لیڈروں پر عائد کردہ پابندیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''سرخپوش پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداریوں کا یقین دلا چکے ہیں۔ اگر ان پر لگاتار غداری کی تہمت لگتی چلی گئی تو اس کا نتیجہ خطرناک ہوگا۔''[3] سہروردی کے اس بیان کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ 16 اکتوبر کو پشاور میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرنے کے لئے جارہا تھا تو اٹک پل پر اسے روک کر ایک حکم نامہ دیا گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ ''تمہیں چھ ماہ کے لئے صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے'' اور پھر 17 اکتوبر کو پشاور میں دفعہ 144 نافذ کر کے ہر قسم کے جلسوں، جلوسوں پر پابندی عائد کردی گئی۔ قیوم شاہی سکھ شاہی کی طرح اپنے عروج پر تھی اور عبدالقیوم خان ہری سنگھ نلوہ کی طرح اپنے سیاسی مخالفین کے وجود کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ عملی طور پر خان عبدالقیوم خان کا نعرہ بھی یہی تھا کہ ''راج کرے گا خالصہ آکی رہے نہ کوئی'' اور ادارہ نوائے وقت کی جانب سے شائع کردہ اخبار ''نوائے پاکستان'' کا 10 اکتوبر کا تبصرہ یہ تھا کہ جب ایک جماعت کے کل پاکستان لیڈر کو اس جماعت کے انتخابی اجلاس میں شرکت کے لئے داخلہ کی اجازت بھی نہیں، تو صوبہ سرحد کے انتخابات ڈھونگ اور فراڈ نہیں تو اور کیا ہیں؟

16 اکتوبر 1951ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان راولپنڈی میں پنجابی شاونزم اور مذہبی عصبیت کی گولیوں کا شکار ہوگیا تو خان عبدالقیوم خان نے پاکستان کے نئے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کے ساتھ ''پنجابیوں'' کے خلاف گٹھ جوڑ کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہ کی۔ اس گٹھ جوڑ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بنگال میں خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی کے گروہوں کے درمیان بڑا پرانا معاندانہ تضاد تھا اور ناظم الدین کو اپنے اس دیرینہ سیاسی حریف کے خلاف مغربی پاکستان سے خان عبدالقیوم خان جیسے حلیفوں کی سخت ضرورت تھی۔ 31 اکتوبر کو ''سرحد میں قیوم شاہی کی غیر جمہوری اقدامات کے خلاف احتجاج'' کرنے کے لئے کئی سیاسی جماعتوں کی ایک مشترکہ کانفرنس ہوئی جس میں

جناح عوامی مسلم لیگ، اسلام لیگ، جماعت اسلامی، جمیعت العلمائے اسلام اور آزاد پاکستان پارٹی کے مندوبین نے شرکت کی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ صوبائی انتخابات منصفانہ اور جمہوری طریقے سے کرائے جائیں مگر قیوم سرکار پر اس کا رد عمل یہ ہوا کہ اس نے اس کانفرنس کے فوراً بعد جناح عوامی مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے متعدد سرگرم کارکنوں کو گرفتار کر لیا اور 11 نومبر کو صوبائی انتخابات کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے دن، یہ اعلان کیا گیا کہ صوبہ سرحد کے ''خان اعظم'' خان عبدالقیوم خان پشاور اور ہزارہ کے دو حلقوں سے ''بلا مقابلہ'' منتخب ہو گئے ہیں اور ضلع مردان کے ایک انتخابی حلقے میں حزب اختلاف کے امیدوار غلام محمد خان لونڈ خور کے کاغذات نامزدگی اس بنا پر مسترد کر دیئے گئے ہیں کہ ان پر اس نے ''خود دستخط نہیں کئے تھے۔'' اس پر ادارہ نوائے وقت کے اخبار ''نوائے پاکستان'' نے ''دھاندلی'' کے زیر عنوان ایک اداریہ لکھا جس میں بتایا گیا کہ خان عبدالقیوم خان کے دو حلقوں سے ''بلا مقابلہ'' منتخب ہونے کا پس منظر یہ ہے کہ ہزارہ کے حلقہ میں اس کے انتخابی حریف کو گرفتار کر کے اسے اس حلقہ کی حدود سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ پشاور چھاؤنی کے حلقہ میں جو امیدوار اس کی مخالفت کر رہا تھا اس کے کاغذات نامزدگی کی تائید کرنے والے ووٹر کو راتوں رات اغوا کر لیا گیا اور دوسرے دن اس سے یہ بیان دلوایا گیا کہ میں نے کاغذات نامزدگی پر جو دستخط کئے وہ لاعلمی میں کئے اور مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔

16 نومبر 1951ء کو وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین، نوابزدہ لیاقت علی خان کی جگہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر بن گیا تو اس نے لیاقت علی خان کی طرح صوبہ سرحد کے انتخابات میں خان عبدالقیوم خان کی پشت پناہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ وزیر اعظم پاکستان کا یہ فیصلہ نہ صرف اس لحاظ سے جمہوریت کش تھا کہ عبدالقیوم خان نے انتخابات کے موقع پر پورے صوبے میں مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کے ذریعے دہشت پھیلا رکھی تھی بلکہ یہ اس لحاظ سے بھی جمہوریت کے لئے ہلاکت خیز تھا کہ مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے یوسف خٹک اور ابراہیم جھگڑا سمیت جن مسلم لیگی لیڈروں کو پارٹی ٹکٹ دیئے تھے قیوم خان نے ان سب کو ہرانے کا بھی سرکاری طور پر انتظام کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے صرف وہی 84 امیدوار کامیاب ہوں جنہیں قیوم لیگ کے صوبائی پارلیمانی بورڈ نے ٹکٹ دیئے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے نام پر بھی ایسے عناصر کو ابھرنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا جو کبھی اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکتے تھے۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ سے

یوسف خٹک اور ابراہیم جھگڑا کے علاوہ 16 دوسرے امیدواروں کو لیگ ٹکٹ محض اس لئے مل گئے تھے کہ مرکزی بورڈ میں ناظم الدین اور قیوم خان کے گروہ کے ارکان اقلیت میں تھے۔ پنجاب کے دولتانہ گروپ نے خواجہ ناظم الدین اور قیوم خان کے باغیوں سے ساز باز کا بازار پوری طرح گرم کر رکھا تھا۔

قیوم خان نے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے مسلم لیگی لیڈروں کو عملی طور پر اپنانے سے انکار کر دیا اور وہ ان کے مقابلے میں اپنے ''آزاد'' امیدواروں کی ہر طرح سے تائید وحمایت کرتا رہا۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ کی اپیل پر پنجاب کے کچھ مسلم لیگی لیڈر اپنی پارٹی کی آئینی امیدواروں کے حق میں کنویسنگ کرنے کے لئے صوبہ سرحد گئے تو ''خان اعظم'' نے انہیں حکم دیا کہ چپ چاپ واپس چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں امن عامہ میں خلل اندازی کے جرم میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دوں گا۔ 24 رنومبر کو خان ابراہیم جھگڑا نے ایک بیان میں الزام عائد کیا کہ ''قیوم خان سرکاری مشینری کو اپنے مخالفوں بالخصوص میرے خلاف استعمال کر رہا ہے۔'' اس نے اس سلسلے میں پشاور کے ڈپٹی کمشنر کا خاص طور پر ذکر کیا۔[4] 26 رنومبر کو پولنگ شروع ہوا تو اس دن سرحد کی جناح عوامی لیگ کے مزید سولہ لیڈروں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا اور پھر 28 اور 29 نومبر کو نوشہرہ، مردان اور دوسرے علاقوں میں حزب اختلاف کے بہت سے کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ 2 ردسمبر کو خان ابراہیم جھگڑا نے انتخابات سے اپنا نام واپس لینے کا اعلان کر دیا اور الزام عائد کیا کہ قیوم خان کی سرکاری مشینری اس کے مخالف امیدوار ارباب شیر افضل خان کے حق میں پورا زور صرف کرتی رہی ہے۔ اسی دن پاکستان ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق پنجاب مسلم لیگ کے کارکنوں نے، جو خان ابراہیم جھگڑا کی حمایت کے لئے پشاور گئے ہوئے تھے، انتخابات میں بدعنوانیوں اور سرکاری مداخلت کے شدید الزامات عائد کئے۔ ان کا الزام یہ تھا کہ پولیس اور قیوم گروپ کے حامی ووٹروں کو زدوکوب کر رہے ہیں۔ نیز پولیس کے سپاہی مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی وردیاں پہن کر خان جھگڑا کے مخالف قیوم لیگی امیدوار شیر افضل خان کے حق میں کنویسنگ کر رہے ہیں۔ اس بیان میں مزید بتایا گیا کہ پنجاب مسلم لیگ کے کونسلر مظہر جمیل کو جو خان جھگڑا کی حمایت میں کام کر رہا تھا پولنگ سٹیشن سے زبردستی نکال دیا گیا اور اسے گرفتار کرنے کی دھمکی دی گئی۔ چکانی پولنگ بوتھ پر خان جھگڑا کے ووٹروں پر لاٹھی چارج کیا گیا۔[5]

جب 12 ردسمبر کو ان نام نہاد انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو حسب توقع قیوم خان کے امیدواروں کی بہت بھاری اکثریت کو کامیابی ہوئی۔ ان کے مقابلے میں نہ صرف حزب اختلاف کے امیدوار ہار گئے بلکہ وہ 18 مسلم لیگی امیدوار بھی ناکام ہوئے، جنہیں مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے ٹکٹ دیئے تھے۔ صرف چار نشستیں جناح عوامی مسلم لیگ کو ملیں۔ بظاہر سرحد کے ''مردآہن'' نے حزب اختلاف کو یہ رعایت اس لئے دی تھی کہ ملک میں یہ تاثر پیدا ہو کہ اس نے اپنی زیر نگرانی منصفانہ طور پر انتخابات کرائے ہیں۔ تاہم پاکستان کے جمہوریت پسند حلقوں میں سرحد کے اس سیاسی بوچڑ کے ہاتھوں جمہوریت کے اس قتل عام سے چیخ و پکار مچ گئی۔ ادارہ نوائے وقت کی طرف سے شائع ہونے والے ''نوائے پاکستان'' کی 13 ردسمبر سے لے کر 21 ردسمبر تک اشاعتوں میں شائع شدہ بے شمار الزامات میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(1) صوبائی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ یعنی خود خان عبدالقیوم خان نے ایک شخص پیر محمد کو مردان کے حلقہ نمبر 9 کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا تھا لیکن مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے صوبائی پارلیمانی بورڈ یعنی عبدالقیوم خان کے اس فیصلے کے خلاف اپیل منظور کر کے مسلم لیگ کا ٹکٹ سلطان محمد خان کو دے دیا۔ قیوم خان کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس کے ایما پر پیر محمد ''آزاد'' امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو گیا اور پھر وہ ساری سرکاری مشینری کی امداد سے کامیاب ہو گیا۔

(2) اس حلقہ کے غلاماں گاؤں کے رائے دہندگان قیوم خان اور اس کے امیدوار پیر محمد کے خلاف تھے مگر پٹواری، تحصیل دار اور پولیس کپتان اس گاؤں کے ہر ووٹر کے پاس گئے اور انہوں نے اسے ڈرا دھمکا کر پیر محمد کو ووٹ دینے کی تلقین کی۔

(3) 9 ردسمبر کو اس علاقے میں پولنگ شروع ہوا تو شام تک کل 640 ووٹ ڈالے گئے لیکن جب گنتی کی گئی تو ان کی تعداد 980 تھی اور وہ سب کے سب پیر محمد کے حق میں تھے۔ اس حلقہ کے باقی پولنگ سٹیشنوں پر اسی تعداد اور اسی تناسب سے جعلی ووٹ ڈالے گئے۔

(4) تھانہ کالو خان کے انسپکٹر پولیس نے ان ووٹروں کو زدوکوب کیا جو قیوم شاہی اور اس کے امیدوار پیر محمد کے خلاف تھے۔ پولیس نے ان ووٹروں کو مار مار کر وہاں سے بھگا دیا

اور اس طرح انہیں ووٹ دینے کی اجازت ہی نہ ملی۔

(5) نوشہرہ کے حلقہ میں حزب اختلاف کے حق میں جو ووٹ ڈالے گئے ان میں سے 30 فیصد گنتی کے وقت مسترد کر دیئے گئے۔

(6) پولیس اور پولنگ افسروں نے بعض پولنگ سٹیشنوں پر ووٹروں کے ہاتھوں سے بیلٹ پیپر چھین کر انہیں قیوم خان کے امیدواروں کے بکسوں میں ڈال دیا۔

(7) صوبائی وزرا اور پولنگ افسروں نے خود قیوم خان کے امیدواروں کے حق میں جعلی ووٹ ڈالنے کے کام میں حصہ لیا جبکہ حزب اختلاف کے ووٹروں کو خوف زدہ کر کے انہیں اپنے ووٹ کا حق استعمال کرنے سے باز رکھا گیا۔

(8) ضلع مردان کی تحصیل صوابی کے ایک پولنگ سٹیشن پر بکسوں میں سے جتنی پرچیاں نکلیں ان کی تعداد اس علاقے کے رائے دہندگان کی کل تعداد سے زیادہ تھی۔ اس طرح اس جگہ جعلی پرچیاں ڈالنے کا ریکارڈ توڑ دیا گیا تھا۔

(9) کئی پولنگ سٹیشنوں پر پولیس نے حزب اختلاف کے پولنگ ایجنٹوں کو باہر لے جا کر جبراً اپنی نگرانی میں بٹھائے رکھا اور اس دوران پولنگ افسروں نے قیوم خان کے امیدواروں کے حق میں پرچیاں ڈالیں۔

(10) حزب اختلاف کے 31 امیدواروں کے کاغذات نامزدگی پہلے ہی تکنیکی وجوہ کی بنا پر مسترد کر دیئے گئے تھے کیونکہ ان امیدواروں کی کامیابی یقینی نظر آتی تھی۔

(11) حزب اختلاف کے سینکڑوں لیڈروں اور کارکنوں کو انتخابات کے دوران گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔

(12) ضلع ہزارہ کے ایک پولنگ سٹیشن پر قیوم لیگیوں نے سرکاری اہل کاروں سے مل کر ہلڑ مچایا تا کہ حزب اختلاف کے حامی اپنے ووٹ نہ ڈال سکیں۔

(13) حزب اختلاف کے کارکنوں کے سروں پر گوبر پھینکا گیا۔

(14) ووٹروں سے کہا گیا کہ اگر تم نے حزب اختلاف کے بکسوں میں ووٹ ڈالے تو ہمارے مقرر کردہ افسر تمہیں چھپ کر دیکھ لیں گے۔

(15) نابالغ بچوں سے قیوم لیگ کے امیدواروں کے حق میں ووٹ ڈلوائے گئے۔

(16) کئی پولنگ سٹیشنوں پر بکس الٹے رکھوائے گئے اور کئی دوسرے پولنگ سٹیشنوں پر بکس کے سوراخ میں اندر کی طرف باریک کپڑا رکھا گیا۔

(17) سرکاری اہلکاروں نے کئی دیہات میں جا کر حزب اختلاف کے ووٹروں کو پولنگ سٹیشن پر آنے سے روکے رکھا۔

پاکستان کے دوسرے اخبارات میں اس قسم کے اور بھی بے شمار الزامات عائد کئے گئے جنہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے مگر پاکستان کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس نے قیوم خان کے منتخب امیدواروں کو مسلم لیگ پارٹی تسلیم کرلیا۔ یوسف خٹک اور ابراہیم جھگڑا اس دھاندلی کے خلاف شور مچاتے رہے مگر ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ قبل ازیں لیاقت علی خان کے عہد اقتدار میں پنجاب کے انتخابات میں ''جھرلو'' نے پاکستان کے جمہوریت پسند عناصر کو بہت صدمہ پہنچایا تھا لیکن خواجہ ناظم الدین کے عہد میں قیوم خان نے جس انتخابی دھاندلی اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا اس کے پیش نظر بہت سے لوگوں کا انتخاب پر سے اعتماد ہی اٹھ گیا۔ بالخصوص صوبہ سرحد کے عوام الناس کو یہ محسوس ہوا کہ قیوم شاہی کے ماتحت انہیں اپنے صوبائی امور کے انتظام میں کوئی دخل حاصل نہیں ہوسکتا۔ سرحد جناح عوامی مسلم لیگ کونسل نے 20 دسمبر کو مطالبہ کیا کہ ''صوبہ سرحد کی نئی اسمبلی غیر آئینی ہے۔ لہٰذا کسی جج کی نگرانی میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔''[6] 26 دسمبر کو پشاور میں جناح عوامی مسلم لیگ، ابراہیم جھگڑا کے مسلم لیگی گروپ، جماعت اسلامی اور آزاد پاکستان پارٹی کی ایک کانفرنس میں بھی اس قسم کا مطالبہ کیا گیا اور پھر یکم جنوری 1952ء کو روزنامہ ''نوائے پاکستان'' نے بھی اس مطالبہ کی تائید وحمایت کی مگر قیوم لیگ کے مسٹر کیانی نے اس مطالبے کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ ''انتخابات نے مسلم لیگ کی مقبولیت کو ثابت کردیا ہے''[7] اور قیوم خان نے انکشاف کیا کہ ''خان عبدالغفار خان کی پاکستان کے خلاف سرگرمیاں ابھی تک جاری ہیں۔''[8]

عبدالقیوم خان کو خان عبدالغفار خان کی، جو جون 1948ء سے گجرات جیل میں مقید تھا پاکستان کے خلاف سرگرمیوں کا انکشاف کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ اس کی انتخابی غنڈہ گردی اور انتہائی آمرانہ طرز حکومت نے نہ صرف صوبہ سرحد بلکہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کے اندر بھی سرخ پوشوں کے موافق جذبات پیدا کردیئے تھے اور لوگوں نے ان کے

ساتھ اس ہمدردی کا کھلم کھلا اظہار شروع کر دیا تھا۔ قبل ازیں صرف حسین شہید سہروردی کبھی کبھی سرخپوشوں کے حق میں آواز اٹھایا کرتا تھا مگر اب کئی اطراف سے ان کی حمایت میں آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ادارہ نوائے وقت کے روزنامہ ''نوائے پاکستان'' نے 23 رجنوری 1952ء کو اپنے ایک اداریے میں سرحد کے خان برادران کے خلاف قیوم خان کی طرف سے عائد کردہ غداری کے الزام کی تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا۔ اداریہ میں قارئین کی توجہ صوبہ سرحد کے سابق وزیر تعلیم یحییٰ جان کے اس بیان کی طرف مبذول کرائی گئی جس میں عبدالقیوم خان کے اس بیان کی تردید کی گئی تھی کہ غفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب نے ابھی تک پاکستان کو تہ دل سے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اداریے میں بتایا گیا کہ یحییٰ جان نے اپنے اس بیان میں سرخپوش جماعت کی بعض قراردادوں اور قائداعظم مرحوم کے نام غفار خان کے ایک خط کا حوالہ بھی دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرخپوشوں نے پاکستان کو دل سے تسلیم کر لیا ہے اور وہ بانی پاکستان قائداعظم کو اپنی وفاداری کا یقین دلا چکے ہیں۔'' یہ اداریہ اس صحافتی ادارے کا تھا جس نے 18 رجون 1948ء کو خان عبدالغفار خان کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ یہ گرفتاری اتنا عرصہ بعد کیوں عمل میں آئی اور پھر اس ادارے نے 12 راگست 1948ء کی بھابڑا کی فائرنگ پر جو اداراتی تبصرہ کیا تھا اس میں خان عبدالقیوم کو مبارکباد دی گئی تھی کیونکہ ''اس نے اپنے صوبہ میں غداروں پر کڑی نگرانی رکھی تھی۔'' اس وقت اس ادارے کی رائے یہ تھی کہ ''جو لوگ خان عبدالقیوم خان پر دہشت پسندی اور ڈکٹیٹر شپ کا الزام عائد کر رہے ہیں وہ صوبہ سرحد کے صحیح حالات سے واقف نہیں ہیں۔''[9]

اب اس ادارے کی اس صحافتی قلابازی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں یہ ادارہ بیک وقت اسلام، پاکستان اور پنجابی شاونزم کا علمبردار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عبدالقیوم خان کے ''بنگالیوں'' کے ساتھ گٹھ جوڑ کی وجہ سے اسلام اور پاکستان کے علاوہ ''پنجاب'' کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ 12 رفروری 1952ء کو ''نوائے پاکستان'' نے پیر مانکی شریف کا یہ بیان سرخی کے ساتھ شائع کیا کہ ''خان عبدالغفار خان کو رہا کیا جائے۔'' 19 رفروری کو اس نے غلام محمد لونڈ خور کا بھی اسی مضمون کا ایک بیان شائع کیا اور پھر 22 رفروری کو اس اخبار نے اپنے ایک اداریے میں غیر مبہم الفاظ میں مطالبہ کیا کہ ''اگر حکومت کے پاس خان عبدالغفار خان کے خلاف کوئی واضح اور

ٹھوس ثبوت موجود ہے تو وہ عدالت میں ان پر مقدمہ چلائے ورنہ انہیں رہا کردے۔''[10] گویا اس صحافتی ادارے کو تقریباً چار سال کے بعد یہ خیال آیا کہ خان عبدالغفار خان کی مقدمہ چلائے بغیر نظر بندی ناجائز تھی۔ جون 1948ء میں نوائے وقت کی رائے میں سرحدی گاندھی کی غداری مسلمہ تھی اور اس بنا پر اسے کسی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس اخبار کو حیرت تھی کہ یہ گرفتاری اتنا عرصہ بعد کیوں عمل میں آئی تھی۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

4ر مارچ 1952ء کو سرحد اسمبلی کا بجٹ سیشن ہوا تو حزب اختلاف کے ارکان واک آوٹ کر گئے کیونکہ انہیں خان عبدالغفار خان کی صحت کے متعلق تحریک التوا پر بحث کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس واقعہ کی اصل اہمیت یہ تھی کہ حزب اختلاف سابق مسلم لیگیوں پر مشتمل تھی یعنی اب سرحد میں وہ عناصر خان عبدالغفار خان کی حمایت کرنے لگے تھے جو تین چار سال قبل اسے غدار کہا کرتے تھے۔ ملک کی سیاست میں اس کیفیاتی تبدیلی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اپریل میں ''نوائے وقت'' کا ڈیکلریشن بحال کر دیا گیا۔ اس کی بظاہر ایک وجہ یہ تھی کہ خان عبدالقیوم اور خواجہ ناظم الدین کے گٹھ جوڑ نے دولتانہ حکومت اور ادارہ نوائے وقت کے سیاسی نصب العین میں بہت حد تک یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ پنجابی شاونزم اپنے عروج پر تھا اور وزیر اعلیٰ دولتانہ کا خیال تھا کہ وہ ادارہ نوائے وقت کو یہ رعایت دے کر اپنے لئے اس اخبار کی تائید وحمایت حاصل کر لے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ناظم الدین کابینہ کا ایک سینئر وزیر نواب مشتاق احمد گرمانی بڑی دیر سے اس اخبار کی اشاعت کی بحالی کے لئے دباؤ ڈال رہا تھا۔ پنجاب میں وہ اس اخبار کا سب سے بڑا سرپرست وممدوح تھا اور جاگیردارانہ سیاسی دھڑے بندی میں وہ دولتانہ کے مخالف دھڑے کا سرغنہ تھا۔

18 رمئی 1952ء کو کراچی میں جماعت احمدیہ کی سالانہ کانفرنس میں پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی تقریر کے بعد پنجاب اور کراچی میں اینٹی احمدیہ ایجی ٹیشن شروع ہوگئی جو نو دس مہینے تک جاری رہی تاہم اس دوران خان عبدالقیوم خان کے خلاف اور خان عبدالغفار خان کے حق میں پروپیگنڈا کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بالآخر گورنر جنرل غلام محمد کے ہاتھوں 17 رمارچ 1953ء کو پنجاب کی دولتانہ وزارت کی برطرفی، لاہور میں مارشل لا کے نفاذ اور پھر 17 راپریل کو خواجہ ناظم الدین کی مرکزی وزارت کی برطرفی کے بعد پاکستان کے حکمران طبقوں

کی سیاسی دھڑے بندی میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔ گورنر جنرل غلام محمد پاکستان میں امریکی سامراج کے مفادات کے علاوہ کراچی اور پنجاب کے گماشتہ سرمایہ داروں کے مفادات کا بھی علمبردار تھا اور اسے پنجاب کی سامراج نواز سول، فوجی اور عدالتی بیورو کریسی کی بھرپور تائیدوحمایت حاصل تھی۔ اس نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کی جگہ محمد علی بوگرہ کی جو کٹھ پتلی وزارت بنائی اس میں ایک نمایاں بات یہ تھی کہ نئے مرکزی وزیروں کی فہرست میں صوبہ سرحد کے ''خان اعظم'' خان عبدالقیوم خان کا نام بھی بطور وزیر صنعت شامل تھا۔ اس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ ''شیر سرحد'' کو اس کی سیاسی قوت کے مورچے سے الگ کیا جائے تاکہ وہ آئندہ کسی ''بنگالی'' گروپ کے ساتھ کوئی موثر ساز باز نہ کر سکے۔

قیوم خان کو طوعاً وکرھاً یہ عہدہ قبول کرنا پڑا لیکن اس نے پشاور سے روانگی سے پہلے ایک ایسی حرکت کی جو دنیا کی جمہوریت کی تاریخ میں فقید المثال تھی۔ اس کے اس سنسنی خیز کارنامے کا انکشاف 23راپریل کو پشاور کے گورنر ہاؤس کے ایک سرکاری اعلان سے ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ''خان عبدالقیوم خان نے آج صوبائی قانون ساز اسمبلی کی مسلم لیگ کی قیادت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ گورنر نے اس کے مشورے کے مطابق شمال مغربی صوبہ سرحد کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس سردار عبدالرشید خان کو وزارت سازی کی دعوت دی ہے اور سردار رشید نے یہ دعوت قبول کر لی ہے۔'' گویا خان عبدالقیوم خان نے پشاور سے روانگی سے پہلے صوبائی اقتدار کی باگ ڈور اپنے ایک معتمد پولیس افسر کے حوالے کر دی تھی اور اس طرح صوبہ سرحد نے جو قیوم خان کے ماتحت معناً پولیس سٹیٹ بن چکا تھا، اب لفظاً بھی پولیس سٹیٹ کی حیثیت اختیار کر لی۔ گورنر ہاؤس سے جاری ہونے والے اعلان میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ سردار عبدالرشید نے اسی دن انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ سے استعفیٰ دیا تھا اور قیوم خان کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے بھی اسی دن اسے اپنا قائد منتخب کر لیا تھا اور مزید یہ کہ قیوم خان نے صوبائی اسمبلی کی رکنیت اور صوبائی مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ نہیں دیا تھا۔ سردار عبدالرشید خان کی وزارت میں ایک شخص شمس الحق کو بھی شامل کیا گیا جو صرف پرائمری تک پڑھا ہوا تھا۔ یہ شخص 22راگست 1947ء سے قبل عبدالقیوم خان بارایٹ لا کا منشی تھا اور دسمبر 1951ء کے ''عام انتخابات'' کے بعد قیوم کابینہ میں بطور وزیر صحت شامل کیا گیا تھا۔ اس شخص کی قیوم خان سے بے پناہ وفاداری کی بنیاد کے بارے میں پورے

ملک میں سکینڈل مشہور تھا۔ تاہم رشید وزارت کی تشکیل اور اس میں شمس الحق کی شمولیت کا مقصد یہ تھا کہ "خان اعظم" عملی طور پر صوبہ سرحد کے اقتدار سے علیحدہ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت کچھ عرصہ کے بعد مل گیا جبکہ سردار عبدالرشید خان نے صوبہ میں اقتدار مستحکم کرنے کے بعد اس امر پر احتجاج کیا کہ "شمس الحق قیوم کا مخبر ہے۔ وہ روز روز کی رپورٹ دیتا ہے اور قیوم خان اس کی رپورٹ کی بنیاد پر صوبائی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔" نوائے وقت کے بقول "عبدالقیوم خان کا طرز عمل کچھ اس طرح کا تھا کہ گویا وہ وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید خان کا اتالیق و سربراہ ہے۔ وہ سربراہی کا مظاہرہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ معمولی بہانوں سے پشاور پہنچتا ہے۔"[11]

لیکن جہاں تک سیاسی مخالفوں پر جبر و تشدد کا تعلق تھا یہ "شاگرد رشید" اپنے "اتالیق" سے بھی دو قدم آگے تھا۔ اس نے مرکزی ارباب اقتدار کی امداد سے صوبہ میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد پہلے تو عملی طور پر یہ تاثر دیا کہ وہ خان عبدالقیوم خان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں ہے۔ اس نے اس مقصد کے لئے 29 را کتوبر 1953ء کو خان عبدالقیوم خان کو مجبور کر دیا کہ وہ صوبائی مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائے۔ اس کے تقریباً ایک ہفتے بعد صوبائی لیگ کی کونسل نے سردار رشید کو صدر منتخب کر لیا اور پھر اسی مہینے میں صوبائی اسمبلی نے یونیورسٹی ایکٹ میں ایک ترمیم منظور کر کے قیوم خان کو پشاور یونیورسٹی کی عمر بھر کی چانسلر شپ سے الگ کر دیا اور یہ قرار دیا کہ آئندہ صوبائی وزیر اعلیٰ بلحاظ عہدہ یونیورسٹی کا چانسلر ہوگا۔ اس طرح جب سردار رشید نے اپنے "اتالیق" کے چنگل سے پوری طرح گلو خلاصی کرا لی تو پھر اس نے عوامی لیگ کی طرف رخ کیا جو اگست 1953ء میں ضلع پشاور کے ایک ضمنی انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کرنے کے باعث اس کے لئے خطرے کا باعث بن گئی تھی اور جس کا ون یونٹ کی مجوزہ سکیم کے بارے میں رویہ غیر واضح تھا۔ 21 رنومبر کو جناح عوامی مسلم لیگ کے نائب صدر ارباب سکندر خان کے ایک بیان کے مطابق فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت اس کی پارٹی نظر بندوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ جب رشید خان کی اس فسطائی کاروائی کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج شروع ہوا تو 12 رجون 1954ء کو آل پاکستان عوامی لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن ارباب عبدالغفور خان کو گرفتار کر لیا گیا اور تقریباً دو ہفتے بعد اسے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت ایک سال قید بامشقت کی

سزا دے دی گئی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس نے بیس ہزار روپے کی نیک چلنی ضمانت پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 25 رجولائی کو ارباب سکندر خان اور ہزارہ عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری سکندر شاہ گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر ''قابل اعتراض'' تقریریں کرنے کا الزام تھا۔ اگست میں ضلع مردان میں ضمنی انتخاب ہوا تو اس نے عدل و انصاف اور جمہوری وسیع القلبی کو ترک کر کے اپنے استاد قیوم خان کا دھاندلی وغنڈہ گردی کا حربہ کچھ اس طرح استعمال کیا کہ پورے صوبہ میں دہشت پھیل گئی۔ 29 راگست 1954ء کو ضلع مردان کے ضمنی انتخاب میں ''شکست کھانے والے'' عوامی لیگی امیدوار غلام محمد لونڈ خور کو فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کی دفعہ گیارہ کے تحت عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب کہ وہ اٹک کا پل عبور کر کے پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے والا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ لاہور میں ایک پریس کانفرنس میں بتائے گا کہ اس ضمنی انتخاب میں کس قسم کی بے قاعدگیاں روا رکھی گئی ہیں۔ اس نے مردان سے لاہور کے لئے روانگی سے پہلے وزیر اعلیٰ سردار رشید خان کو ایک تار بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے مردان کے ضمنی انتخاب میں ہر ممکن بے قاعدگی روا رکھ کر اپنے پیش رو کو بھی مات کر دیا ہے۔ پاکستان کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں اور سرکاری ملازمین کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔''

اس صورت حال کے پیش نظر 30 راگست کو ضلع مردان کے موضع لونڈ خور میں منعقدہ سرحد عوامی لیگ کے ایک اجتماع میں رائے ظاہر کی گئی کہ جماعت کو ختم کر دیا جائے۔ پیر مانکی نے اس اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''سردار رشید خان کی مسلم لیگی حکومت نے اس ضمنی انتخاب میں جو انتہائی ناجائز طریقے اختیار کئے ہیں ان کے پیش نظر اس امر میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ یہاں اپوزیشن کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ میں مغربی پاکستان میں تمام اپوزیشن پارٹیوں سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنی اپنی تنظیم ختم کر دیں کیونکہ پاکستان ایک فسطائی ملک بن چکا ہے۔''[12] 5 رستمبر کو نوائے وقت میں مردان کے ضمنی انتخاب کے بارے میں عوامی لیگ کے اعلیٰ عہدیدار کا بیان شائع کیا گیا جس میں یہ بتایا گیا کہ ''سردار رشید نے انتخابی دھاندلیوں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ دیانت داری اور انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی ہے۔ موجودہ وزیر اعلیٰ سردار رشید نے سابق وزیر اعلیٰ قیوم خان کو بخشوانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جعلی پرچیاں اور پرچیوں کی مکمل کاپیاں گزشتہ عام انتخابات میں قیوم لیگی امیدواروں کے بکسوں

میں چوری چھپے ڈالی گئی تھیں لیکن اس ضمنی انتخاب میں ذمہ دار افسروں نے کھلم کھلا ایسا کیا ہے۔ جس پولنگ سٹیشن میں صرف چار سو پرچیاں ڈالی گئیں وہاں سے آٹھ آٹھ سو پرچیاں برآمد ہوئیں ہمارے بعض کارکنوں نے افسروں کو پرچیوں کی کاپیاں مسلم لیگی امیدوار کے بکس میں ڈالتے ہوئے دیکھا اور ایک جگہ تو ایک افسر سے 57 پرچیاں چھین لی گئیں۔ یہ پرچیاں اب بھی میرے پاس موجود ہیں''۔[13] لیکن اس بیان کا اثر یہ ہوا کہ ستمبر کے دوسرے ہفتے میں غلام محمد لونڈ خور کے خلاف مقدمہ کی ایک جرگہ میں سرسری سماعت ہوئی اور اسے سات سال قید کی سزا دے دی گئی۔ اس پر پیر مانکی کا 13 ستمبر کو تبصرہ یہ تھا کہ قیوم خان ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے اپنے مخالفین سے اس قدر وحشیانہ سلوک نہیں کرتا تھا۔ وہ بظاہر جمہوریت کا پرچم اٹھا کر اپنے سیاسی مخالفین کو کچلتا تھا لیکن اس کا جانشین (سردار رشید) تو بالکل ہی بوچڑ ہے۔

جب کراچی میں گورنر جنرل غلام محمد کے ٹولے نے سردار عبدالرشید خان کی اس قسم کی بدعنوانیوں کا کوئی محاسبہ نہ کیا تو وہ ''ببر شیر سرحد'' بن گیا اور پھر اس نے 10 اکتوبر کو سابق ''شیر سرحد'' خان عبدالقیوم خان کو بکری بنا دیا۔ یہ حیرت انگیز واقعہ اس طرح رونما ہوا کہ جب خان عبدالقیوم خان حسب معمول دورہ سرحد کے لئے پشاور پہنچا تو ریلوے سٹیشن پر کالی جھنڈیوں سے اس کے خلاف مظاہرہ کیا گیا مخالفانہ نعرے لگائے گئے اور شہر میں جلوس نکالا گیا۔ اسی شام خان عبدالقیوم خان نے ایک انٹرویو میں شکایت کی کہ میرے خلاف یہ مظاہرہ چند برسر اقتدار مسلم لیگیوں نے کرایا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ یہ مظاہرہ وزیر اعلیٰ سردار رشید نے کرایا ہے اور اب میری ہی بلی مجھے ہی میاؤں کرنے لگی ہے۔ 13 اکتوبر کو خان عبدالقیوم خان نے اپنے دیرینہ سیاسی حریف ڈاکٹر خان سے ملاقات کی لیکن نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا اور سرحد میں خان قیوم کا مشن بالکل ناکام رہا۔ 16 اکتوبر 1954ء کی اس رپورٹ میں خان قیوم خان کے مشن کی کوئی نوعیت نہیں بتائی گئی تھی لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ وہ سرحد میں کوئی نیا سیاسی گٹھ جوڑ کر کے کسی نہ کسی طرح اپنے سیاسی اقتدار کو بحال رکھنا چاہتا تھا۔ اسے ڈاکٹر خان صاحب کے عروج اور سردار رشید کی سرکشی کے پیش نظر اپنا سیاسی مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اسکندر مرزا اسے دستور ساز اسمبلی کے بالواسطہ انتخابات کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ نہیں لینے دے گا اور پنجاب کا جاگیر دار طبقہ پہلے ہی اس کے خلاف تھا کیونکہ اس نے لیاقت علی خان

کے انتقال کے بعد ان کے خلاف بنگالیوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔ قدرتی طور پر خان عبدالغفار خان کو، جو جنوری 1954ء میں رہائی کے بعد پنجاب میں مقیم تھا، عبدالقیوم خان کے اس سیاسی زوال سے بہت فائدہ پہنچایا۔

سرحدی گاندھی کا سیاسی ستارہ دراصل دسمبر 1952ء میں قیوم خان کے انتخابی ڈھونگ کے فوراً ہی بعد رو بہ عروج ہو چکا تھا کیونکہ کئی اطراف سے اس کی رہائی کا مطالبہ شروع ہو گیا تھا۔ اس مطالبہ نے اپریل 1953ء میں صوبہ سرحد کے اقتدار سے قیوم خان کی علیحدگی کے بعد بہت زور پکڑ لیا تھا۔ جناح عوامی مسلم لیگ کا قائد حسین شہید سہروردی یہ مطالبہ کرنے میں پیش پیش تھا۔ اس نے پہلے تو اپنی جمہوریت پسندی کے بلند بانگ دعوے کے باوجود 17 اپریل کو گورنر جنرل غلام محمد کے ہاتھوں اپنے دیرینہ سیاسی حریف خواجہ ناظم الدین کی مرکزی وزارت کی آمرانہ برطرفی کا خیر مقدم کیا تھا اور پھر 29 مئی کو ایک بیان میں حکومت پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ غفار خان کو رہا کر کے آزادی پسند لوگوں کی خوشنودی حاصل کر لے کیونکہ اس کی رائے میں ''نظر بندی سے غفار خان کی مقبولیت کم نہیں ہوئی، بلکہ لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بڑھ گیا ہے اگر نظر بندی کے دوران غفار خان کو کچھ ہو گیا تو حکومت کے خلاف جذبہ ناراضگی نازک صورت اختیار کر لے گا اور اس کے ردعمل کو کنٹرول کرنا حکومت کے لئے مشکل ہو جائے گا۔''[14] 4 جون کو روزنامہ نوائے وقت نے سہروردی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ ''خان برادران کو رہا کیا جائے۔'' اداریے میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''ہر تیسرے چوتھے مہینے میں غفار خان کی صحت کے متعلق سرکاری اعلان شائع کرنے سے بہتر یہ ہے کہ خان موصوف اور ان کے بھائی کو رہا کر کے صوبہ سرحد میں ایسی فضا پیدا کی جائے جو ملک وملت کے لئے سازگار ہو صوبہ سرحد کی سیاست کا صرف ایک رخ مرکزی حکومت کے سامنے رہا ہے۔ صرف وہی رخ جو خان عبدالقیوم خان نے اسے دکھانا مناسب سمجھا ہے۔''[15] 13 اگست کو نوائے وقت نے ایک اور اداریے میں اس رپورٹ پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ''ڈاکٹر خان صاحب کی نظر بندی میں مزید ایک سال کی توسیع کر دی گئی ہے بے شمار محبان وطن کو جو ڈاکٹر صاحب کی رہائی کی خبر سننے کے منتظر تھے اس رپورٹ سے صدمہ پہنچے گا۔ صوبہ سرحد کے اہل سیاست کا ایک گروہ محض اغراض کے پیش نظر ان کی رہائی کی مخالفت کر رہا ہے۔''

پنجاب میں نوائے وقت اور بعض دوسرے عناصر کی طرف سے خان برادران کی رہائی کے بارے میں اس پر زور اور مسلسل مطالبے کا حقیقی پس منظر یہ تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد کے ٹولے نے اپریل 1953ء میں سامراج نواز سول بیورو کریسی کی آمریت مسلط کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ صوبہ سرحد میں سر جارج کننگھم کے اس مشورے پر عمل کیا جائے گا جو اس نے اگست 1947ء کو قیام پاکستان کے فوراً بعد مرکزی حکومت کو دیا تھا یعنی یہ کہ صوبائی کانگرس پارٹی کے ڈاکٹر خان صاحب جیسے دائیں بازو کے عناصر کا سیاسی تعاون حاصل کیا جائے۔[16] اس ٹولے کا خیال تھا کہ اس طرح نہ صرف صوبہ سرحد میں روز افزوں عوامی بے چینی کا سد باب ہو جائے گا بلکہ مغربی پاکستان سے خان عبدالقیوم خان جیسے عناصر کا ''بنگالیوں'' سے گٹھ جوڑ بھی ٹوٹ جائے گا۔ پنجاب کے جاگیرداروں اور نودولتیوں کو اس فیصلے سے اتفاق تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ''پنجاب'' کے مفادات پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔ اس فیصلے کو غلام محمد کی اندرونی کابینہ کے رکن جنرل اسکندر مرزا نے عملی جامہ پہنایا۔ اس نے ساری عمر صوبہ سرحد میں بطور پولیٹیکل ایجنٹ ملازمت کی تھی اور اس بنا پر اس کے ڈاکٹر خان صاحب سے مراسم تھے۔ جب حسب توقع ڈاکٹر خان صاحب گورنر جنرل غلام محمد کی زیر قیادت بیورو کریسی کی آمریت سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تو 7 رجنوری 1954ء کو غفار خان اور اس کے سارے ساتھیوں کی رہائی کا اعلان کر دیا گیا۔ نظر بندوں کی جائیدادیں بحال کر دی گئیں اور ان کی نقل و حرکت پر سے پابندی بھی اٹھالی گئی لیکن مرکزی حکومت نے خان عبدالغفار خان پر نئی پابندی عائد کر دی کہ وہ صوبہ سرحد میں داخل نہیں ہو سکے گا بلکہ پنجاب میں مقیم رہے گا۔ حسین شہید سہروردی نے حکومت کے اس اعلان کو سراہا کیونکہ اس طرح مرکزی پارلیمنٹ میں اس کے حریف خواجہ ناظم الدین کے گروپ کے کمزور ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ پیر مانکی نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اس فیصلہ پر مبارک باد دی کیونکہ یہ فیصلہ سرحد میں قیوم شاہی کے استبدادی دور کے خاتمہ کی علامت تھا اور نوائے وقت نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا کیونکہ اس طرح اسلام، پاکستان اور پنجاب کو لاحق شدہ خطرہ ٹل گیا تھا۔

خان عبدالغفار خان کی نقل و حرکت پر یہ پابندی تقریباً دو سال تک قائم رہی۔ اس عرصے میں اس نے پنجاب کے لوگوں سے نجی محفلوں میں یا استقبالیہ تقریبات میں جو باتیں کیں اور اخبارات کو جو انٹرویو دیئے ان سے پتہ چلا کہ یہ شخص پختونستان کے بارے میں اپنے اس ترمیم

کردہ موقف پر بدستور قائم ہے جو اس نے 4 ستمبر 1947ء کو سردریاب کے اجتماع میں اختیار کیا تھا۔یعنی بادشاہ خان اپنی مطلوبہ سلطنت پختونستان اور پاکستان کے درمیان ایک ایسی کنفیڈریشن کے حق میں تھا جس میں سے وہ جب چاہے باہر نکل جائے۔ وہ پاکستان میں ایسا آئین چاہتا تھا جس کے تحت صوبوں کو علیحدگی کا حق حاصل ہو۔ اس نے مارچ 1948ء میں اپنی پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور میں بھی یہی بات کی تھی اور پھر اس نے 27 فروری کو نمائندہ نوائے وقت سے طویل انٹرویو کے دوران یہی بات کہی تھی۔ اس نے یہ انٹرویو مقامی صحافی شورش کاشمیری کے گھر میں دیا تھا اور اس موقع پر دو ایک دوسرے لوگوں کے علاوہ ایک مسلم لیگی کارکن خرم واسطی بھی موجود تھا مگر اس دن شام کو اس نے شورش کاشمیری کے ذریعے ایڈیٹر نوائے وقت سے درخواست کر کے انٹرویو کا یہ حصہ کٹوا دیا تھا۔ اس نے اپنے اس انٹرویو میں الزام (جو شاید سراسر بے بنیاد نہیں تھا) عائد کیا تھا کہ صوبہ سرحد کو ''خودمختار مملکت'' قرار دینے کی تجویز 1947ء میں سب سے پہلے قیوم خان نے پیش کی تھی لیکن بعدازاں وہ قائداعظم کی سرزنش کی بنا پر اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ اس کا اپنا بظاہر ''بے ضرر اور معصومانہ مطالبہ یہ تھا کہ ''صوبہ سرحد کا نام بدل کر پختونستان رکھ دیا جائے تاکہ اس کے نام سے ظاہر ہو کہ یہ پٹھانوں کا علاقہ ہے۔''[17] گویا اس کی ساری سیاست کا مقصد صوبہ سرحد کا نام بدلنے تک محدود تھا۔ اس نے اس قسم کی منافقانہ سیاست یقیناً گاندھی سے سیکھی تھی کیونکہ عام طور پر منافقت کسی پٹھان کے کردار کا حصہ نہیں ہوتی۔ وہ اس قسم کی باتیں کر کے پنجاب کے باشعور محب وطن عناصر کی عقل و دانش اور فہم و فراست کی توہین کرتا تھا۔ اس نے نمائندہ نوائے وقت سے متذکرہ انٹرویو کی رپورٹ میں سے صوبوں کی علیحدگی کے حق والا حصہ محض اس لئے کٹوا دیا تھا کہ ایسی باتیں کبھی پنجاب میں قابل قبول نہیں ہوسکتی تھیں۔

جب مارچ 1954ء میں مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی عبرتناک انتخابی شکست ہوئی تو اس نے اپریل کے اوائل میں ٹائمز آف انڈیا کو جو انٹرویو دیا اس میں وہ اپنے حقیقی عزائم کو پوری طرح نہ چھپا سکا۔ اس نے کہا کہ ''پختونستان سے میری مراد یہ ہے کہ پاکستان کے تمام علاقوں کو جہاں پٹھان بستے ہیں ملا کر ایک نیا صوبہ بنا دیا جائے اور اس کا نام پختونستان رکھا جائے۔ صوبہ سرحد، قبائلی علاقہ، بلوچستان اور پنجاب کے ضلع میانوالی کا علاقہ اس نئے پختونستان میں شامل ہوں گے۔''[18] قبل ازیں بلوچستانی گاندھی خان عبدالصمد اچکزئی 24 مارچ 1954ء کو یہ شوشہ

چھوڑ چکا تھا کہ بلوچستان کے پشتو بولنے والے علاقوں کو بلوچستان سے الگ کر کے صوبہ سرحد سے ملا دیا جائے"[19] اور جی۔ ایم۔ سید یہ کہہ چکا تھا کہ "سندھ کی اصل حدود میں بہاولپور کا جنوبی حصہ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان اور ملتان شہر کے جنوبی حصے شامل ہیں۔"[20] مسئلہ کشمیر کے بارے میں خان عبدالغفار خان کا کہنا یہ تھا کہ کشمیر کے سلسلے میں اس کی خدمات اور مساعی سے فائدہ اٹھانے کا سوال دو مرتبہ پیدا ہوا۔ پہلی مرتبہ قائداعظم کی زندگی میں اس سے یہ کہا گیا کہ وہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کی مدد کریں مگر اس نے اس سلسلے میں کچھ کرنے سے پہلے یہ ضمانت طلب کی کہ پاکستان میں آمریت کی بجائے "جمہوریت" کارفرما ہو گی۔[21] بظاہر جمہوریت سے اس کا مطلب یہ تھا کہ صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بحال کی جائے اور سرور یاب کی قرارداد کے مطابق اس کا پختونستان کا مطالبہ تسلیم کیا جائے۔ 12 اپریل کو دہلی کے اخبار سٹیٹس مین میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ پاکستان میں متعینہ امریکی سفیر نے خان عبدالغفار خان کو امریکہ آنے کی دعوت دی ہے اور غفار خان نے یہ دعوت منظور کر لی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کو امریکی فوجی امداد کے مسئلہ پر غفار خان اور امریکی سفیر میں طویل بات چیت ہوئی ہے۔[22] اگرچہ بعد میں عملی طور پر اس رپورٹ کی تصدیق تو نہ ہوئی لیکن ان دنوں امریکیوں کی جانب سے خان عبدالغفار خان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش بعید از قیاس نہیں تھی۔ اس کا کسی حد تک ثبوت 14 اپریل کو مل گیا جبکہ امریکی پٹھو حسین شہید سہروردی نے ایک بیان میں خان عبدالغفار خان کے مطالبہ پختونستان کی حمایت کی اور مغربی پاکستان میں مسلم لیگ کے مخالف سیاسی کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ خان عبدالغفار خان کی قیادت میں ایک متحدہ محاذ قائم کریں اور اسی دن نوائے وقت کا "اقتدار کی قیمت پختونستان" کے زیر عنوان اداریہ یہ تھا کہ "کراچی میں غفار خان اور سہروردی کی ملاقات کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ اگر سہروردی کو غفار خان کا تعاون حاصل ہو جائے تو وہ انہیں صوبہ سرحد کے موجودہ جناح عوامی لیگ کے لیڈروں پر ترجیح دے گا ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ سہروردی کے اس بیان واعلان سے صرف چند روز قبل صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب کے جناح عوامی لیگی لیڈر غیر مشروط الفاظ میں پختونستان کے مطالبہ کی مذمت کر چکے ہیں۔"[23] 19 اپریل 1954ء کو نوائے وقت نے اپنے ایک اور اداریے میں یہ رائے ظاہر کی کہ "مغربی پاکستان میں سہروردی کا مجوزہ متحدہ محاذ قائم نہیں ہو سکے گا۔ اس کی دو وجوہ

ہیں۔ پنجاب کے جناح عوامی لیگ کے تمام ذمہ دار لیڈر امریکن فوجی امداد کے حق میں ہیں۔ کمیونسٹوں کے نقطہ نظر سے ان کی یہ روش سخت قابل اعتراض ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب کی جناح عوامی لیگ کے لیڈر غیر مبہم الفاظ میں پختونستان کے مطالبہ اور غفار خان کی موجودہ سرگرمیوں کی مذمت کر چکے ہیں۔"[24]

باب:10

افغانستان کے معاندانہ رویے اور غفار خان کی سیاسی ہٹ دھرمی کی وجوہ

پنجاب میں خان عبدالغفار خان کی از سر نو مخالفت شروع ہونے کے باوجود جون 1955ء میں اس کے لئے ملک کی سیاسی فضا ساز گار ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خان عبدالقیوم خان نے مسلم لیگ اور اس کی ساری ذیلی تنظیموں نے اس بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا کہ مسلم لیگ کی ہائی کمان نے، جو غلام محمد اینڈ کمپنی کے کنٹرول میں تھی اسے نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے لئے اپنا امیدوار نامزد نہیں کیا تھا اور اس بنا پر ''خان اعظم'' اب اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب یہ جماعت ''مردہ'' ہو چکی ہے اور اسے کسی نئی زندہ پارٹی کی داغ بیل ڈالنی چاہیے۔ جولائی کے دوسرے ہفتے میں مرکزی حکومت نے خان عبدالغفار خان کی نقل وحرکت پر عائد کردہ پابندی ہٹالی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ غلام محمد ٹولے کو ڈاکٹر خان صاحب سے ون یونٹ کی سکیم کے بارے میں سودا بازی کے بعد یہ امید تھی کہ اب سرحد میں غفار خان سیاسی طور پر الگ تھلگ ہو جائے گا۔ اس کا پختونستان کا سٹنٹ ختم ہو جائے گا اور اس کی سیاسی سرگرمیاں کوئی خطرناک صورت اختیار نہیں کر سکیں گی۔ قبل ازیں ون یونٹ کے قیام کے لئے بہت سی کارروائی ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا ٹھوس اقدام یہ ہوا تھا کہ 28/اکتوبر 1954ء کو ڈاکٹر خان صاحب کو مرکزی وزارت میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کے اس تقرر کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ اس طرح یہ سرحد میں ون یونٹ کے حق میں سیاسی فضا ہموار کرے گا اور اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ غلام محمد ٹولہ ان دنوں اپنے سامراجی آقاؤں کے حکم کی تعمیل میں جواہر لال نہرو سے صلح وآشتی کی جو بات چیت کر رہا تھا اس میں سرحد کا سابق کانگری وزیر اعلیٰ

ممد ومعاون ثابت ہوگا۔ مگر خان عبدالغفار خان نے 30 ر اکتوبر کو ایک بیان میں اس اقدام سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اب سرخپوشوں پر سے پابندی ہٹالی جائے گی اور دستور ساز اسمبلی کے نئے انتخابات ہوں گے [1] لیکن جب چند دن بعد اس پر پاکستان کی برسر اقتدار بیوروکریسی کے عزائم زیادہ واضح ہوئے تو اس نے 20 ر نومبر کو ایک اور بیان میں رائے ظاہر کی تھی کہ ''موجودہ حالات ون یونٹ کے قیام کے لئے ساز گار نہیں ہیں اس قسم کی کاروائی سے پہلے عام انتخابات ہونے چاہئیں۔'' [2] اس طرح جب دونوں بھائیوں کے درمیان تضاد کھل کر سامنے آ گیا تھا تو 22 ر نومبر 1954ء کو پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ایک نشریاتی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ مغربی پاکستان کے سارے علاقوں کو ایک صوبہ مغربی پاکستان میں مدغم کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے فوراً بعد صوبائی اسمبلیوں سے اس سکیم کی منظوری حاصل کرنے کے لئے مشینری قائم کر دی گئی تھی اور اس مشینری نے ایک ماہ کے اندر تینوں صوبائی اسمبلیوں سے مطلوبہ منظوری حاصل کر لی تھی۔ [3] جب سرحد اسمبلی کا اس مقصد کے لئے اجلاس ہوا تھا تو پیر مانکی شریف کی عوامی لیگ نے خان عبدالغفار خان کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس کا بائیکاٹ کیا تھا کہ ون یونٹ بنانے سے متعلقہ فیصلہ نئی منتخب دستور یہ سے کرایا جائے اور اس مقصد کے لئے ملک بھر میں براہ راست انتخابات کرائے جائیں لیکن وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید خان اور اس کے وزارتی رفقا نے ون یونٹ کے حق میں تقریریں کی تھیں۔ سردار رشید کی دلیل یہ تھی کہ پنجاب نے ون یونٹ اسمبلی میں 40 فیصد نمائندگی پر اکتفا کر کے فیاضی کا ثبوت دیا ہے۔ مارچ 1955ء میں ڈاکٹر خان صاحب کو ون یونٹ کا وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا گیا تھا اور جولائی کے اوائل میں سرحد کے وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید خان کو اس لئے برطرف کر دیا گیا تھا کہ وہ ون یونٹ کی حمایت سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس کا الزام یہ تھا کہ ون یونٹ سکیم پیش کرتے وقت صوبائی حقوق کے تحفظ کی جو یقین دہانی کرائی گئی تھی اس پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔

غلام محمد ٹولے کی کوئی امید پوری نہ ہوئی۔ خان عبدالغفار خان نے 17 ر جولائی 1955ء کو صوبہ سرحد میں داخل ہوتے ہی ون یونٹ کے خلاف اور پختونستان کے حق میں سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس کی ان سرگرمیوں کے دوران 6 ر اگست 1955ء کو میجر جنرل اسکندر مرزا نے مخبوط الحواس غلام محمد کو دو ماہ کی چھٹی دے کر خود گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھالیا اور

17 راگست کو محمد علی بوگرہ کی جگہ چودھری محمد علی وزیر اعظم بن گیا۔ جب اس پنجابی وزیر اعظم کی زیر قیادت 30 رستمبر 1955ء میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے ون یونٹ ایکٹ کثرت رائے سے منظور کر لیا تو خان عبدالغفار خان کی مخالفانہ سرگرمیاں اور بھی تیز ہو گئیں اور پھر جب 14 راکتوبر کو گورنر جنرل اسکندر مرزا نے اس ایکٹ کی توثیق کر دی اور ڈاکٹر خان صاحب نے صوبہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھا لیا تو خان عبدالغفار خان نے ون یونٹ اور پنجابیوں کے خلاف پٹھانوں کی رائے عامہ کو منظم کرنے اور انٹی ون یونٹ فرنٹ (Anti One Unit Front) قائم کرنے کے لئے سرحد کے ان اضلاع کا دورہ شروع کر دیا جن میں پشتو بولی جاتی ہے۔ 1956ء کے اوائل میں اس نے اپنی دیرینہ روایت کے مطابق ان اضلاع کے دیہاتی عوام سے رابطہ مہم شروع کی۔ اس کی یہ مہم اس قدر وسیع پیمانے کی تھی کہ اس نے 14 رفروری 1956ء سے لے کر 6 رجون 1956ء تک دیہاتی علاقوں میں 83 تقریریں کیں۔ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت مغربی پاکستان کے نقطہ نگاہ سے غفار خان کی یہ تقریریں اتنی زہریلی اور اشتعال انگیز تھیں کہ اسے اس کے بڑے بھائی کی جانب سے جاری کردہ حکم کے تحت غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے خلاف 14 الزامات کے تحت مقدمہ کی سماعت لاہور میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک جج کی عدالت میں 3 رستمبر 1956ء کو شروع ہوئی جو 10 رجنوری 1957ء تک جاری رہی۔ استغاثہ کی شہادتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ اس نے اپنی تقریروں میں حکومت اور پنجابیوں کے خلاف نفرت پھیلائی ہے اور صوبہ سرحد کے لوگوں کو تلقین کی ہے کہ وہ پاکستان سے الگ ''آزاد پختونستان'' کی مملکت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کریں لیکن ملزم کا موقف یہ تھا کہ میرے خلاف یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔ میں جب اپنی تقریروں میں پختونستان کا ذکر کرتا تھا تو میرا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ پاکستان سے الگ پختونستان کی ریاست قائم کی جائے، بلکہ میرا مطلب یہ ہوتا تھا کہ پاکستان کے اندر پختونوں کا ایک خود مختار صوبہ قائم کیا جائے۔ میں نے اپنی تقریروں میں پاکستان کی خود مختاری اور اس کی جغرافیائی سالمیت پر کبھی حملہ نہیں کیا ہے۔ 4 ردسمبر کو ملزم غفار خان مقدمہ کی سماعت سے اس بنا پر دستبردار ہو گیا کہ جج نے وکیل کو صفائی کے ایک گواہ سے ایک سوال پوچھنے کی اجازت نہیں دی تھی اور اس سے قبل خود جج نے بعض گواہوں سے ایسے سوالات پوچھے تھے جنہیں ملزم نے پسند نہیں کیا تھا۔ چند دن بعد غفار خان

نے عدالت کے روبرو ایک درخواست میں مقدمہ کی سماعت سے دستبرداری کی ایک اور وجہ بھی بتائی۔ وہ یہ تھی کہ مجھے حکومت پاکستان سے کسی انصاف کی توقع نہیں کیونکہ وزیر داخلہ میجر جنرل اسکندر مرزا نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے تقریروں کا سلسلہ بند نہ کیا تو میرے خلاف سخت اقدام کیا جائے گا۔

تاہم جج نے ملزم کی عدم موجودگی میں مقدمہ کی سماعت جاری رکھی اور پھر 10 رجنوری 1957ء کو یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملزم عبدالغفار خان کے خلاف جو شہادتیں پیش ہوئیں ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں پاکستان سے الگ ایک آزاد پختونستان کے قیام کی تلقین کرتا رہا ہے۔ اس نے پٹھان عوام کو سرکاری مظالم کی بے بنیاد داستانیں سنا کر حکومت پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کی نظروں میں پاکستان کے وقار کو اس قسم کی باتیں کر کے گرانے کی بھی کوشش کی ہے کہ غیر ملکیوں کی نظر میں پاکستان کی اتنی بھی قدر و قیمت نہیں ہے جتنی کہ ایک مردہ کتے کی لاش کے ڈھانچے کی ہوتی ہے۔ اس نے اپنی تقریروں میں یہ اشتعال انگیز الزام بھی عائد کیا کہ پنجابیوں نے پٹھان عوام کو ان کے اس علاقے سے محروم کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دے رکھا ہے اور وہ پٹھانوں کی ہر چیز کو غصب کر رہے ہیں۔ فاضل جج کی رائے میں ملزم کا یہ موقف صحیح نہیں تھا کہ ''جب میں اپنی تقریروں میں پنجابیوں کا ذکر کرتا تھا تو میرا مطلب ان پنجابیوں کا ہوتا تھا جو برسر اقتدار تھے۔ میں عمومی طور پر سارے پنجابیوں کو موردالزام نہیں ٹھہراتا تھا۔'' فاضل جج نے اپنی اس رائے کی بنیاد پر ملزم کو غداری کے جرم کا مرتکب ٹھہراتے ہوئے اسے 14 ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی۔ سزائے قید اس لئے نہ دی گئی کہ ملزم پہلے ہی سات ماہ قید میں گزار چکا تھا۔ اس کی عمر 67 سال تھی اور اس کی صحت خراب رہتی تھی۔ مزید براں جج کو امید تھی کہ ملزم آئندہ پاکستان کے خلاف نفرت پھیلا کر اس کی سلامتی خطرے میں نہیں ڈالے گا۔[4]

لیکن اس عدالتی فیصلے میں اس حقیقت کا ذکر نہیں تھا کہ خان عبدالغفار خان نے جس ون یونٹ کے خلاف یہ تقریریں کی تھیں حکومت پاکستان نے نومبر 1954ء سے لے کر مارچ 1955ء تک اس کے قیام کے لئے کس قسم کی دھاندلی اور غنڈہ گردی کی تھی۔ جولائی 1955ء میں سرحد کے وزیراعلیٰ سردار عبدالرشید خان کو محض اس لئے وزارت سے برطرف کر دیا گیا تھا کہ وہ ون یونٹ سکیم کی حمایت سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس کا الزام یہ تھا کہ یہ سکیم پیش کرتے وقت صوبائی حقوق

کے تحفظ کے لئے جو یقین دہانی کرائی گئی تھی اس پر عمل نہیں کیا جارہا تھا۔[5] اس کی جگہ ون یونٹ کے تصور کے خالق جنرل ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان کو وزیراعلیٰ بنایا گیا تھا۔ جس نے صوبہ سرحد میں وہ ساری رکاوٹیں دور کردی تھیں جو ون یونٹ کے راستے میں حائل تھیں۔

خان عبدالغفار خان کی ون یونٹ اور پنجابیوں کے خلاف ان تقریروں کا ایک تلخ پہلو جس کا اس مقدمہ کے دوران ذکر نہیں ہوا تھا، یہ تھا کہ اس نے اپنی ان اشتعال انگیز تقریروں کے ذریعے پاکستان کے خلاف معاندانہ کاروائیوں میں حکومت افغانستان سے اشتراک عمل کیا تھا۔ اس کی صوبہ سرحد میں داخلے پر پابندی اٹھنے کے تین چار ماہ قبل جب 27/مارچ 1955ء کو پاکستان کے گورنر جنرل نے ون یونٹ کے قیام کا بذریعہ آرڈیننس اعلان کر کے مشتاق احمد گرمانی کو اس نئے صوبے کا گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب کو وزیراعلیٰ مقرر کیا تھا تو حکومت افغانستان نے اس پر اپنے شدید ردعمل کا اظہار کر کے یہ الزام عائد کیا تھا کہ ون یونٹ کے قیام سے پاکستان میں پٹھانوں کی الگ حیثیت کو مزید گھٹا دیا جائے گا۔ حکومت افغانستان کو پاکستان کی اس داخلی سیاست کاری پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اس کے شہ پر 30/مارچ کو کابل کے ایک ہجوم نے پاکستان کے سفارت خانے پر دھاوا بول دیا تھا۔ جس کے دوران سفارت خانے کا سارا فرنیچر اور دوسرا سامان توڑ پھوڑ دیا گیا تھا۔ پاکستان کے پرچم کو اتار کر اسے پھاڑ دیا گیا تھا اور اس کی جگہ پختونستان کا جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ اسی طرح قندھار اور جلال آباد میں پاکستان کے قونصل خانوں پر حملے ہوئے تھے۔ نتیجۃً دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات منقطع ہوگئے تھے اور پاک افغان سرحد تقریباً پانچ ماہ بند رہی تھی۔ اس دوران افغانستان کی جانب سے قبائلیوں کے چھوٹے چھوٹے حملے بھی ہوئے تھے، جبکہ سوویت یونین نے اسے بیرونی تجارت کے لئے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کی تھیں۔ پاکستان میں برطانوی ہائی کمشنر سرایلک سائمن (Alec Simon) کے ایک بیان کے مطابق برطانیہ اور ترکی نے حکومت افغانستان کے نام اپنے مراسلوں میں لکھا تھا کہ پاکستان کے سفارت خانے پر حملے سے ان سفارتی مراعات کی خلاف ورزی ہوئی ہے جو عام طور پر سارے ممالک کو دی جاتی ہیں۔[6] مئی 1955ء میں بین المملکتی حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ کراچی کے روزنامہ ڈان نے یہ الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر افغانستان نے پاکستان کے بارے میں اپنے معاندانہ رویے میں اصلاح نہ کی تو پاکستان اس کے خلاف پولیس ایکشن کرنے

میں حق بجانب ہوگا[7] لیکن ستمبر میں ایران اور بعض دوسرے مسلم ممالک کی مداخلت سے دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی قدرے کم ہوگئی اور سفارتی تعلقات بحال ہو گئے[8] لیکن جب اکتوبر 1955ء میں ون یونٹ کے قیام کا باقاعدہ اعلان ہوا تو ان کے تعلقات پھر خراب ہو گئے۔ اس وقت خان عبدالغفار خان کی نقل وحرکت پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی اس نے صوبہ سرحد میں انٹی ون یونٹ تحریک کے قیام کے لئے اپنا دورہ شروع کر دیا تھا۔

نومبر 1955ء کے وسط میں افغانستان کی گرینڈ نیشنل اسمبلی لوئی جرگہ کا اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ افغانستان پختونستان کے علاقے کو پاکستان کا حصہ تسلیم نہیں کرتا اور آئندہ افغانستان ہر ممکن ذریعے سے اپنے دفاع کو مضبوط کرے گا۔[9] لوئی جرگہ کے اس اجلاس کے تقریباً ایک ماہ بعد 17 ردسمبر کو سوویت یونین کا وزیراعظم مارشل بلگانن (Bulganin) سوویت یونین کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری خروشچوف (Khrushchev) کے ہمراہ سرکاری دورے پر کابل پہنچا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ ''ہم پختونستان کے معاملے میں افغانستان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔'' اس نے کہا کہ ''پاکستان میں رہنے والے پچاس لاکھ پٹھان قبائلیوں کو حق خودارادیت ملنا چاہیے اور پختونوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے پختونوں سے مشورہ کرنا چاہیے۔'' پاکستان کے وزیراعظم نے سوویت یونین کے وزیراعظم کے اس بیان پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مارشل بلگانن پاکستان کے ان سرحدی قبائلیوں کو حق خودارادیت دینے پر آمادہ ہے جو آزاد خودمختار پاکستان کے باشندے ہیں اور جنہوں نے کبھی اپنے لئے یہ حق نہیں مانگا مگر وہ ان کشمیری عوام کو یہ حق دینے پر تیار نہیں جو اس کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔[10] مارشل بلگانن اس سے تقریباً ایک ہفتہ قبل ہندوستان کے دورہ کے موقع پر یہ اعلان کر چکا تھا کہ برصغیر کی تقسیم برطانوی سامراج کی سازش کی وجہ سے ہوئی تھی اور ہم کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ تصور کرتے ہیں۔ گویا سوویت یونین زعما پاکستان کے حکمران ٹولے کی سامراج نوازی کی سزا سارے پاکستانی عوام کو دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے اس دورۂ کابل کے موقع پر پاک افغان تعلقات میں کشیدگی سے مزید فائدہ اٹھانے کے لئے افغانستان کو 100 ملین ڈالر قرضہ دینے کی پیشکش بھی کی۔

تاہم سوویت لیڈروں کے اس دورے کے چند ماہ بعد غالباً بغداد پیکٹ کے رکن

ممالک یعنی امریکہ، برطانیہ، ترکی، ایران اور عراق کی مداخلت سے پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی میں بہت کمی ہوگئی۔

اگست 1956ء میں پاکستان کے صدر اسکندر مرزا نے وزیر اعظم سہروردی کے ہمراہ کابل کا دوستانہ دورہ کیا اور پھر 1957ء میں افغانستان کے وزیر اعظم سردار محمد داؤد خان نے پاکستان کا خیر سگالی دورہ کیا۔ 1958ء میں جب فیروز خان نون وزیر اعظم تھا افغان بادشاہ ظاہر شاہ نے پاکستان کا دورہ کیا تو دونوں ملکوں کے تعلقات میں مزید بہتری پیدا ہوگئی۔ اس سے قبل افغانستان کا وزیر خارجہ سردار نعیم خان کراچی آیا تھا تو دونوں ملکوں کے درمیان دو معاہدوں پر دستخط ہوئے تھے جن کے مطابق بین المملکتی ہوائی سروس شروع ہوگئی اور افغانستان کو پاکستان کے راستے بیرونی تجارت کے لئے بہت سہولتیں دی گئیں جن میں سے ایک سہولت یہ بھی تھی کہ افغان حکومت کراچی میں اپنا مال گودام قائم کرلے جہاں سے اس کی مال بردار گاڑیاں سامان لے کر روانہ ہوا کریں گی اور گاڑی کے ڈبوں پر افغان حکومت کی مہر ہوگی۔ مزید براں افغان حکومت کو اجازت دی گئی کہ اگر وہ چاہے تو پشاور میں اپنے علاقہ میں پانچ میل اندر تک ریلوے لائن کا سلسلہ قائم کرسکتی ہے لیکن باہمی خیر سگالی کے یہ دورے اور معاہدات دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی پائیدار بنیاد مہیا نہ کرسکے۔ دونوں کے درمیان قومی تضاد شدید اور معاندانہ تھا اور یہ محض لیپا پوتی سے حل نہیں ہوسکتا تھا۔

متذکرہ حقائق کے پیش نظر حکومت افغانستان کی طرف سے پختونستان پر اس قدر اصرار اور تقریباً ایک ہزار میل لمبی ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کی وجوہ یہ تھیں:۔

1۔ افغان حکمرانوں کو بھی برطانوی سامراجیوں اور ہندوستانی توسیع پسندوں کی طرح یقین تھا کہ برصغیر میں پاکستان کا قیام بالکل مصنوعی ہے اور یہ ملک زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ جیمز سپین کے بیان کے مطابق انہیں امید تھی کہ جب پاکستان ٹوٹ جائے گا تو پختونستان کے قیام کا امکان بہت روشن ہوگا اور پھر پٹھانوں کی یہ ریاست جلد ہی افغانستان میں مدغم ہوجائے گی۔ ہندوستان کو نہ صرف اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ وہ پختونستان کے افغانستان میں ادغام کی حمایت کرے گا کیونکہ اس طرح دریائے سندھ کا مشرق کا علاقہ اس کی تحویل میں چلا جائے گا۔[11]

افغان حکمرانوں کی اس امید کی بنیاد ان کے تاریخی عزائم میں مضمر تھی۔ بلاشبہ وہ 1773ء میں احمد شاہ ابدالی کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد وقتاً فوقتاً دریائے سندھ تک کے علاقے کے بارے میں اپنی توسیع پسندی کا اظہار کرتے رہے تھے۔ امیر دوست محمد خان نے 1849ء میں اور امان اللہ خان نے 1919ء میں یہ علاقہ بزور قوت حاصل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ انہوں نے 1944ء اور 1946ء میں بھی حکومت برطانیہ سے سفارتی ذرائع سے اس علاقہ کا مطالبہ کیا تھا مگر جب جولائی 1947ء میں صوبہ سرحد کے باقاعدہ اضلاع کا علاقہ رائے شماری کے نتیجے میں پاکستان میں شامل ہو گیا اور قیام پاکستان کے فوراً بعد قبائلی جرگوں نے بھی پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کر دیا تو افغان حکمرانوں نے اپنے دیرینہ مطالبہ میں ترمیم کر کے یہ مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ پاکستان میں رہنے والے پختونوں کو حق خود ارادیت دیا جائے کیونکہ جولائی 1947ء کے ریفرنڈم میں ان سے آزاد پختونستان کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ڈیورنڈ لائن کو اس بنا پر بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ امیر عبدالرحمان نے 1893ء میں اس معاہدے پر مجبوری کے تحت دستخط کئے تھے لیکن اس ترمیم کردہ مطالبے کی تہہ میں بنیادی مقصد وہی تھا کہ جب کبھی پاکستان کے پرخچے اڑیں گے تو دریائے سندھ تک کے علاقے کو مملکت افغانستان میں شامل کر دیا جائے گا۔ افغانستان کے سفارت کار عبدالرحمان پژواک نے 1952ء میں پختونستان کے بارے میں جو کتاب لکھی تھی اس میں افغانستان کے مطلوبہ علاقے میں پورے صوبہ سرحد کے علاوہ بلوچستان کے کئی علاقے بھی شامل کئے گئے تھے اور حکومت افغانستان کی طرف سے شائع کردہ ایک نقشے میں تو کراچی کی بندرگاہ کو بھی پختونستان میں شامل کر لیا گیا تھا۔

2۔ اڑھائی لاکھ مربع میل کے اس ملک کی معیشت اتنی پسماندہ تھی کہ بیسویں صدی کے وسط میں اس سے زیادہ پسماندہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ افغان باشندے ویسی ہی زندگی بسر کرتے تھے جیسی کہ ان کے آباؤ اجداد تین چار سو سال پہلے بسر کیا کرتے تھے۔ چونکہ زیر کاشت رقبہ پانچ فیصد سے بھی کم تھا اس لئے بیشتر لوگ بھیڑ، بکریاں اور دوسرے مویشی پال کر گزارہ کرتے تھے۔ خانہ بدوشوں کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ تھی جبکہ بقیہ آبادی قبائل اور جاگیردارانہ نظام کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ اس ساری آبادی پر

نظریاتی کنٹرول ان دقیانوسی ملاؤں کا تھا جو صدیوں پرانے سیاسی، معاشرتی نظام میں ذرا سی تبدیلی کو بھی بہت بڑی بدعت قرار دیتے تھے۔ 1928ء میں رجعت پسند جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں نے انہی دقیانوسی ملاؤں کی امداد سے امان اللہ خان کا تختہ الٹا تھا اس کا گناہ یہ تھا کہ وہ افغان قوم کو سینکڑوں سال پرانی نیند سے بیدار کر کے اسے بیسویں صدی کی سیاست، معاشرت اور ثقافت سے روشناس کرنا چاہتا تھا۔ 1947ء میں اور اس کے بعد افغان حکمرانوں کو اپنی قوم کی اس پسماندگی، قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کے رجعت پسندی اور ملاؤں کی دقیانوسیت کا پورا احساس تھا۔ لہٰذا ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان سارے عناصر کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے ان کی توجہ کسی بیرونی مسئلہ کی طرف مبذول رکھیں اور اس مقصد کے لئے پختونستان سے بہتر اور کوئی مسئلہ نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ملک میں پشتو بولنے والے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اور انہی لوگوں نے ہی 1929ء میں بچہ سقہ کو شکست دے کر نادر شاہ کو بادشاہ بنایا تھا اس لئے اگر ان کی توجہ پختونستان کے مسئلہ کی طرف مبذول رہے تو کابل کا تخت وتاج محفوظ رہے گا جہاں کی سرکاری زبان فارسی ہے۔ اولف کیرو 1958ء میں شائع شدہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یہ بات کبھی نہیں ہونی چاہیے کہ افغانستان کے موجودہ حکمران پشاور کے سرداروں کی اولاد ہیں۔ ظاہر شاہ اور اس کے افراد پشاور کے سردار سلطان محمد خان کے پڑپوتے ہیں۔ لہٰذا ان سب کے دلوں میں پشاور کے لئے بہت جذبہ پایا جاتا ہے لیکن یہ لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ پختون عوام اب اپنی تعلیم، ملازمت اور زندگی کی دوسری ساری اعلیٰ چیزوں کے لئے مشرق کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ان کے لئے درانیوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظریات فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک کابل کا لسانی بنیاد پر علاقائی مطالبہ بے معنی ہے۔ اگر کبھی سیاسی ادغام ہوا بھی تو اس کی شکل وصورت بہت مختلف ہوگی پشاور کابل کو ضم کرلے گا، کابل پشاور کو ضم نہیں کرے گا۔[12]

3۔ افغان حکمرانوں کو اس سلسلے میں حکومت ہندوستان کی طرف سے مسلسل شہ ملتی تھی آئن سٹیفنز (Ian Stephens) لکھتا ہے کہ "ہندوستان کی جانب سے پختونستان کی تائید وحمایت اس کے لئے سیاسی طور پر بہت فائدہ مند تھی۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر میں الجھا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے ارباب اقتدار دہلی میں پختونستان جرگے

منعقد کرنے کی اجازت دیتے تھے۔[13] اور جیمز سپین کی اطلاع یہ ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد نہیں تھا کہ پختونستان کی تحریک کے لئے ہندوستانی ذرائع سے مالی امداد ملتی تھی۔ایک مرتبہ یہ خبر بھی چھپی تھی کہ نئی دہلی کی جانب سے فقیرایپی کو کابل کی وساطت کی بجائے براہ راست مالی امداد دینے کی کوشش کی گئی ہے۔53-1952ء میں فقیرایپی کی مالی امداد میں بہت کمی ہوگئی تھی اور افواہیں یہ تھیں کہ فقیرایپی اور کابل میں پختونستان لیڈروں کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ تاہم 1954ء میں افغانستان کے جنوبی صوبے کے گورنر فیض محمد کی وساطت سے یہ مالی امداد بحال کردی گئی تھی۔''[14] لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے ارباب اقتدار افغان حکمرانوں کے دریائے سندھ تک کے علاقے پر دعویٰ کو واقعی تسلیم کرتے تھے۔ ایسا بالکل نہیں تھا۔ ہندوستانی حکومت نے پاکستان سے دشمنی کے باوجود افغان حکمرانوں کے اس موقف کی کبھی اعلانیہ تائید نہیں کی تھی کہ ڈیورنڈ لائن کی حیثیت تسلیم شدہ بین الاقوامی سرحد کی نہیں ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے حکمران بورژوا طبقے کے توسیع پسندانہ عزائم افغانستان کے جاگیردار طبقہ کے توسیع پسندانہ عزائم سے بہت بڑے اور زیادہ تھے۔ افغان حکمرانوں کی امیدوں کے برعکس ہندوستان کے ارباب اقتدار پاکستان کے ٹوٹنے کی صورت میں صوبہ سرحد کا ایک انچ علاقہ بھی افغانستان کو دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو پورے برصغیر کا جائز وارث سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ پاکستان کا سارا علاقہ بالآخر پھر ہندوستان میں شامل ہوجائے گا۔ڈاکٹر خان صاحب نے بھی 1947ء میں ایک سے زیادہ مرتبہ جواہر لال نہرو کو تحریری طور پر یقین دلایا تھا کہ'' آزاد پختونستان بالآخر ہندوستان میں شامل ہوگا اور اس کے افغانستان میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''

4۔ افغان حکمرانوں کو پاکستان کے خلاف اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے سلسلے میں سوویت یونین کی ہر طرح کی تائید وحمایت حاصل تھی۔1928ء میں سوویت یونین حکومت نے امان اللہ خان کے دورۂ ماسکو کے موقع پر پختون قبائل کو حق خودارادیت دینے کا مطالبہ کی حمایت کی تھی کیونکہ اس طرح نہ صرف امان اللہ کی سامراج دشمن حکومت کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی بلکہ برطانوی سامراج کی ''سونے کی چڑیا'' پر ضرب لگی تھی۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے تقریباً تین سال بعد جولائی 1950ء میں افغانستان اور سوویت یونین کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا لیکن اس موقع پر پختون قبائل کے حقوق کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ 1954ء میں سوویت یونین نے

افغانستان کو مختلف تعمیراتی کاموں کے لئے 18 ملین ڈالر کا قرضہ دیا مگر اس موقع پر بھی پختون قبائل کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ البتہ جب دسمبر 1955ء میں سوویت وزیر اعظم بلگانن اور کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری خروشچوف کابل گئے تو انہوں نے کھل کر مطالبہ پختونستان کی حمایت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''پاکستان میں رہنے والے پچاس لاکھ پختون قبائل کو حق خودارادیت ملنا چاہیے'' اگرچہ سوویت لیڈروں کا پاکستان کے خلاف یہ یک طرفہ بیان ان کے نظریاتی موقف کے منافی تھا تاہم اس کی وجہ پوشیدہ نہیں تھی۔ کراچی کا حکمران ٹولہ اس وقت تک پاکستان کو اینگلو۔امریکی سامراج کے فوجی معاہدوں میں شامل کر چکا تھا اور یہ بات بوجوہ سوویت حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ سوویت لیڈروں کے اس بیان کی بنیاد دراصل پختون قبائل کے حق خودارادیت کی حمایت پر نہیں تھی بلکہ انہوں نے یہ بیان محض پاکستان کی، جسے وہ صحیح طور پر مغربی سامراج کا ایک طفیلی ملک سمجھتے تھے، مخالفت میں دیا تھا چونکہ انہوں نے ایسا کرتے ہوئے پاکستان کے سامراج کے پٹھو حکمران ٹولے اور پاکستانی عوام میں کوئی تمیز نہیں کی تھی اس لئے عملی طور پر ان کی خارجہ پالیسی اور مغربی سامراجیوں کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ انہیں پاکستان کے پختون قبائلیوں کے حق خودارادیت کا تو خیال آتا تھا لیکن ان کے نزدیک کشمیر اور ناگالینڈ کے عوام کو اس بنیادی انسانی حق کی کوئی ضرورت نہیں تھی، حالانکہ وہ اس کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ سوویت لیڈروں کے اس دورے کے بعد کابل کو ماسکو کی جانب سے جو مالی اور فوجی امداد ملی اس کی مقدار کبھی افغان حکمرانوں کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر ان کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور آئندہ انہوں نے پختونستان کو عالمی سرد جنگ کے ماحول میں تاش کے ایک پتے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا کہ جس کے دکھانے سے انہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ سوویت یونین سے بھی ہر قسم کی امداد ملتی تھی۔ اب انہیں پاکستان کی جانب سے کسی ''پولیس ایکشن'' کا بھی خطرہ نہیں رہا تھا۔

پاکستان کے اندر غفار خان کی جانب سے پختونستان کے فتنے کو جاری رکھنے کی وجہ اس کی جاگیردارانہ ذہنیت، غیر حقیقت پسندانہ سیاست، بے پناہ خود پسندی اور بیرونی امداد میں پنہاں تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اس نے 1931ء میں اپنی خدائی خدمت گار تنظیم کے انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ باقاعدہ الحاق سے پہلے اور اس کے بعد کبھی بھی اپنی کسی تقریر یا

اپنے کسی بیان میں آزاد یا خودمختار، پختونستان کا نام نہیں لیا تھا۔ اس سلسلے میں کبھی کسی نے کوئی دستاویزی شہادت یا اخباری حوالہ پیش نہیں کیا۔ اسے پختونستان کا خیال سب سے پہلے اولف کیرو اور گاندھی کی تحریک پر اپریل 1947ء میں آیا جبکہ برصغیر کی تقسیم کے منصوبے پر غور ہو رہا تھا۔ پھر جب 2/جون کے منصوبہ تقسیم ہند میں صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کرانے کا اعلان ہوا تو اس نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کے مطابق پہلی مرتبہ اعلانیہ یہ مطالبہ کیا کہ اس ریفرنڈم میں ''آزاد پختونستان'' کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ جب اس کے اس مطالبے کی بوجوہ تکمیل نہ ہوئی اور صوبہ سرحد ریفرنڈم کے نتیجے کے طور پر پاکستان میں شامل ہو گیا تو ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق اس نے اپنے موقف میں ترمیم کر کے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ پاکستان کے اندر رز خودمختار پختونستان قائم کیا جائے کیونکہ بصورت دیگر اسے پنجابیوں کے غلبہ کا خطرہ تھا۔ 4/ستمبر 1947ء کو سردریاب میں کنفیڈریشن سے متعلقہ قرارداد اسی ترمیم کردہ موقف کے مطابق منظور کی گئی تھی۔ اس قرارداد کے پیچھے اس کا جذبہ انتقام کارفرما تھا۔ پاکستان کے قیام سے اس کی 27 سالہ سیاست ناکام ہو گئی تھی اور یہ بات اس کی جاگیردارانہ ذہنیت کے لئے قابل برداشت نہیں تھی۔ اسے پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے صوبہ سرحد پر غیر پٹھانوں کے غلبہ کا کبھی خیال نہیں آیا تھا اسے پٹھانوں پر پنجابیوں کے غلبہ کا خطرہ صرف اسی وقت محسوس ہوا تھا جب کہ برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی۔ پھر جب یہ پنجابیوں کے غلبہ کا ذکر کرتا تھا تو اس نے کبھی پنجاب کے رجعت پسند حکمران طبقوں اور پنجاب کے غریب عوام میں تمیز نہیں کی تھی۔

1920ء میں اس کی سیاسی زندگی کا آغاز صوبہ سرحد کے پشتو بولنے والے دو تین اضلاع سے شروع ہوا تھا اور اس کا دائرہ سیاست 1947ء تک اسی چھوٹے سے علاقے تک ہی محدود رہا۔ اگرچہ 1931ء کے بعد یہ انڈین نیشنل کانگرس سے وابستہ ہو گیا تھا اور اسے کانگرس ورکنگ کمیٹی میں شامل کر لیا گیا تھا لیکن اس نے کبھی کل ہند سطح پر کوئی سیاسی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ گاندھی نے اسے 1947ء میں ''بادشاہ خان'' ''مرد خدا'' اور ''فقیر ایپی منش'' کے خطابات محض اس لئے دیئے تھے کہ اسے معلوم تھا کہ جب تک صوبہ سرحد کانگرس کے زیر اثر رہے گا۔ اس وقت تک پاکستان کے بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بادشاہ خان سیاسی طور پر اس قدر کوتاہ اندیش یا کنویں کا مینڈک تھا کہ اسے 2/جون 1947ء تک یقین نہیں آیا تھا کہ برصغیر تقسیم ہو گا اور مسلم

لیگ کے مطالبہ پاکستان کی تکمیل ہوگی۔ ابوالکلام آزاد کہتا ہے کہ جب 2 رجون کو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی نے برصغیر کی تقسیم کی تجویز کی حمایت کی تو اس پر سکتہ طاری ہوگیا اور یہ کئی منٹ تک کوئی بات نہیں کرسکا تھا۔ گویا اسے جون 1947ء تک یہ نہیں پتہ چل سکا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے حالات کیا سے کیا ہوگئے ہیں؟ برطانوی سامراج ہندوستان کی سونے کی چیڑیا کو کیوں چھوڑ رہا ہے؟ برصغیر کی تقسیم کیوں ناگزیر ہوگئی ہے؟ اس کی اس بے خبری کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ اس کی تعلیم بہت واجبی تھی۔ اس نے کبھی کوئی اچھی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ یہ غالباً اخبار بھی باقاعدگی سے نہیں پڑھتا تھا اور پڑھتا تھا تو یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس میں اہم بات کونسی ہے؟ اگر یہ سیاسی طور پر دور اندیش اور باخبر و باشعور بورژوا لیڈر ہوتا تو اسے دوسری جنگ عظیم کے بعد کے بدلے ہوئے حالات میں اپنے سیاسی نظریے اور تدابیر میں تبدیلی کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ اس نے یہ احساس ہی نہیں کیا تھا کہ پٹیل، نہرو، گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے جون 1947ء میں برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ کیوں منظور کرلیا تھا؟ جب کہ وہ 1946ء کے آخر تک بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ کانگرس کے ہندو لیڈروں کی سیاست بورژوا تھی اس لئے وہ نسبتاً زیادہ حقیقت پسند اور موقع شناس تھے اور اسی بنا پر وہ اپنے سیاسی نظریے اور تدابیر کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ خان عبدالغفار خان کی جاگیردارانہ سیاست کی کم مائیگی، کوتاہ اندیشی اور ہٹ دھرمی اسے اس امر کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ سیاست میں موقع پرستی اور حقیقت پسندی میں فرق صرف نیت کا ہوتا ہے۔ اگر خان عبدالقیوم خان جیسا بدنیت اور منافق شخص ہوا کا رخ دیکھ کر یکا یک سیاسی قلابازی کھاتا ہے تو وہ موقع پرستی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اگر کوئی شخص بدلتے ہوئے ٹھوس حالات کے مطابق اپنے سیاسی نظریے اور تدابیر میں خلوص نیت سے مناسب ردو بدل کرتا ہے تو اسے موقع پرستی نہیں کہا جاسکتا۔ اگر خان عبدالغفار خان فی الحقیقت سیاسی بصیرت کا حامل ہوتا تو وہ خلوص نیت سے اپنے سیاسی انداز فکر اور طرز عمل میں بنیادی تبدیلی کرکے پورے پاکستان میں نہایت اہم سیاسی کردار ادا کرسکتا تھا۔ پاکستان میں تجربہ کار سیاسی لیڈروں کا واقعی قحط تھا۔ اگر خان عبدالقیوم خان اور حسین شہید سہروردی جیسے منافق ابن الوقت افراد پاکستان میں اعلیٰ سیاسی عہدے حاصل کرسکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ غفار خان ان سے اونچا اور پائیدار مقام حاصل نہ کرتا۔

اس کی سیاست کا ایک نہایت قابل تعریف پہلو یہ تھا کہ اس میں بے پناہ تنظیمی صلاحیت تھی اور یہ عوام الناس کے ساتھ بہت گہرا رابطہ رکھتا تھا۔ اس کی سیاست محلاتی سیاست نہیں تھی اور نہ ہی وہ غریب عوام کے کچے کوٹھوں اور جھونپڑیوں کی طبقاتی ہیئت سے خوف کھاتا تھا۔ اس نے 1920ء میں بظاہر غریب وپسماندہ عوام کی سماجی فلاح وبہبود کے لئے اپنی جو خدائی خدمت گار تنظیم قائم کی تھی، اسے اس نے اپنی دس سال کی مسلسل محنت سے غریب عوام اور چھوٹے مالکان اراضی کو اس قدر منظم کیا تھا کہ اولف کیرو کے بیان کے مطابق 1930ء میں گاؤں، ٹپہ، تحصیل، ضلع اور صوبہ کی سطح پر اس کی ایک متوازی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ 15 یہ دیہاتی علاقوں کا پیدل سفر کرتا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتا تھا۔ عوام الناس کے سامنے دال روٹی کھاتا تھا اور ہر گاؤں کے مشترکہ حجرے میں لوگوں سے گھل مل کر اس طرح باتیں کرتا تھا کہ وہ اس کی شخصیت اور سیاست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کا عوام الناس کو متاثر کرنے والا دوسرا سیاسی پہلو یہ تھا کہ وہ اپنی غلط یا صحیح سیاست کی وجہ سے ہر لحہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ اس نے قیام پاکستان سے پہلے تقریباً آٹھ سال انگریزوں کی جیل میں گزارے اور قیام پاکستان کے بعد 1958ء تک وہ پہلے قیوم شاہی کے حکم کے تحت اور پھر اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کے حکم کی تعمیل میں تقریباً چھ سال مقید رہا لیکن اس کی سیاسی ثابت قدمی یا ہٹ دھرمی میں کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ اس کی سیاست کا تیسرا اثر انگیز پہلو یہ تھا کہ اس نے بظاہر اپنی سیاست کو اپنے یا اپنے خاندان کے لئے زراندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا ہوا تھا اور اگر وہ پس پردہ سیاست کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتا بھی تھا تو اس کا عوام الناس کو کوئی پتہ نہیں چلتا تھا کیونکہ اس نے یا اس کے خاندان نے کبھی اپنے مال ودولت کی کسی طرح بھی نمائش نہیں کی تھی۔ اس کا اور اس کے خاندان کا رہن سہن بظاہر بہت سادہ اور کفایت شعاری یا کنجوسی کا مظہر تھا۔ یہاں تک کہ پٹھانوں کی معاشرتی روایات کے برعکس اس کا دسترخوان کبھی بھی کسی مہمان کے لئے نہیں کھلا تھا۔ ابوالکلام آزاد کی رائے میں 1946ء میں خان برادران کی مقبولیت میں کمی آنے کی ایک وجہ ان کی اس کنجوسی میں بھی مضمر تھی۔ تاہم اگر یہ شخص 14/ اگست 1947ء کے بعد اپنا یہی عوامی طریقہ سیاست پشتو بولنے والے دو تین اضلاع کی بجائے پورے ملک میں استعمال کرتا تو معلوم نہیں پاکستان کے غریب ومظلوم عوام اسے کہاں تک پہنچا دیتے۔

لیکن اس کی سیاسی بدقسمتی یہ تھی کہ اس میں وسعت قلب ونظر نہیں تھی۔ اس نے اپنی سیاسی کوتاہ اندیشی اور جاگیردارانہ جذبہ انتقام کی وجہ سے پٹیل اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی اس رائے پر بھروسہ کر رکھا تھا کہ پاکستان زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گا اور یہ ایک ریت کا پل ہے جو ایک ٹھوکر سے منہدم ہو جائے گا۔ اس کی اس رائے کی بنیاد یہ تھی کہ اس نے برصغیر کی تقسیم کے تاریخی پس منظر کا کبھی سائنسی تجزیہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ غالباً ایسا کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس نے کانگرسی لیڈروں کے اس پروپیگنڈے پر یقین کر رکھا تھا کہ پاکستان برطانیہ کی سازش کی پیداوار ہے۔ جب برطانیہ کا اس علاقے پر سے غلبہ کم ہوگا تو یہ ملک خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا تھا کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تاریخی تضاد کی کوئی ٹھوس سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی وجوہ تھیں اور پاکستان کی پیدائش اس تضاد کا منطقی نتیجہ تھا۔ پاکستان کے بننے کے بعد اس تضاد کی شدت میں بہت اضافہ ہوا تھا، کمی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا پاکستان کے حکمرانوں کی بدعنوانیوں کے باوجود اس ملک کے فوری طور پر ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر ہندوستانی ارباب اقتدار کی سازشوں کے باعث یہ ایام طفلی میں ختم ہو جاتا تو پورے برصغیر میں اس قدر بدامنی، خونریزی اور افراتفری ہوتی کہ معلوم نہیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا۔ ایک تجربہ کار سیاسی لیڈر کی حیثیت سے خان عبدالغفار خان کو ان سب باتوں کا اچھی طرح احساس وشعور ہونا چاہیے تھا۔ اسے یہ احساس وشعور نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ تھی کہ اس کی پختونستانی سیاست کو مختلف وجوہ کی بنا پر کم از کم تین بیرونی طاقتوں کی کھلم کھلا اور بھرپور تائید وحمایت حاصل تھی۔ ہندوستان کے ارباب اقتدار اس کی اس لئے حمایت کرتے تھے کہ اس طرح نہ صرف نوزائیدہ پاکستان کے لئے مشکلات میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ یہ یقین پختہ ہوتا تھا کہ جب پاکستان ٹوٹے گا تو ''آزاد پختونستان'' ڈاکٹر خان صاحب کے تحریری وعدے کے مطابق افغانستان کی بجائے ہندوستان میں شامل ہوگا۔ دوسری طرف افغانستان اس امید میں اس کی حمایت کرتا تھا کہ جب پاکستان کی موت واقع ہوگی تو دریائے سندھ تک پختونستان کا علاقہ خود بخود افغان مادر وطن کی گود میں آجائے گا۔ برطانیہ میں افغان سفیر شاہ ولی خان نے 1953ء کے اوائل میں لندن سے واپسی پر بمبئی میں کہا تھا کہ جب تک خان عبدالغفار خان جیل میں ہے اس وقت تک پاکستان اور افغانستان کے درمیان خیرسگالی پیدا نہیں ہوسکتی[16] اور سوویت یونین کی جانب سے اس کی حمایت

کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے حکمران ٹولے نے ابتدا ہی سے مختلف قسم کے گمراہ کن نعرے لگا کر پاکستان کو اینگلو امریکی سامراج سے وابستہ کرنے کے ارادے ظاہر کرنا شروع کر دیئے تھے۔ پاکستان کے بعض سادہ لوح عناصر جب بھی اپنے حکمرانوں کی بدعنوانیوں اور موقع پرستیوں سے تنگ آتے تھے تو وہ خان عبدالغفار خان کی ''سیاسی ثابت قدمی'' اور ''اصول پرستی'' کی تعریف کرتے تھے۔ وہ ایسا کرتے ہوئے یہ بھول جاتے تھے کے سیاسی بصیرت وتدبر کے بغیر خان عبدالغفار خان کی سیاسی ثابت قدمی دراصل جاگیردارانہ ہٹ دھرمی کی حیثیت رکھتی تھی۔

ہندوستان کے ذرائع ابلاغ خان عبدالغفار خان اور اس کے پختونستان کا بے پناہ پروپیگنڈا کرتے تھے۔ جب تک گاندھی زندہ رہا وہ آئے دن اپنی پرارتھنا میں بادشاہ خان کا ذکر کیا کرتا تھا اور ہندوستانی اخبارات میں سرحدی گاندھی کی روزانہ کی سیاسی مصروفیات کا مفصل ذکر ہوتا تھا۔ جب جون 1948ء میں صوبائی گورنر سر جارج کننگھم کے انتباہ کے باوجود، خان عبدالقیوم خان نے سرخپوش لیڈر کو فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز کے تحت گرفتار کر لیا تو ہندوستانی اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ نے بہت شور مچایا تھا۔ کانگرسی لیڈروں نے بھی بیانات دیئے اور پورے ہندوستان میں ''پختونوں'' کے احتجاجی جرگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بعض اوقات ہندوستانی اخبارات میں بادشاہ خان کی جیل میں صحت کے بارے میں اس قدر سنسنی خیز خبریں شائع ہوتی تھیں اور ہندوستانی لوک سبھا میں اس سلسلے میں اتنے سوالات پوچھے جاتے تھے کہ حکومت پاکستان کو بار بار سرکاری اعلانات کے ذریعے یہ یقین دلانا پڑتا تھا کہ عبدالغفار خان کی صحت بالکل اچھی ہے اور ہندوستانی ذرائع ابلاغ کا اس کے بارے میں پروپیگنڈا بے بنیاد اور معاندانہ تھا۔ خود جواہر لال نہرو نے بھی جنوری 1953ء میں حیدرآباد میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے خان عبدالغفار خان کی نظر بندی کا ذکر کر کے حکومت پاکستان کی مذمت کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ''خان عبدالغفار خان کی نظر بندی بہت بڑا المیہ ہے۔ اگرچہ ہم پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت تو نہیں کریں گے لیکن جب عبدالغفار خان سلاخوں کے پیچھے ہو تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے کانٹوں کے بستر پر ڈال دیا گیا ہے۔'' 28 اپریل 1953ء کو اتر پردیش کانگرس نے ''یوم عبدالغفار خان'' منایا۔ اس دن صوبہ کے مختلف شہروں میں پبلک جلسے ہوئے اور حکومت ہندوستان سے مطالبہ کیا گیا کہ ''وہ سرحدی گاندھی کی

رہائی کے لئے مداخلت کرے'' اور پھر مشرقی پنجاب اور دہلی میں ایک میمورنڈم پر دستخط کرانے کی مہم چلائی گئی جس میں سلامتی کونسل سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ عبدالغفار خان کی رہائی کے لئے مداخلت کرے۔[17] اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کا پروپیگنڈا کسی بھی سیاسی لیڈر کے لئے زبردست سیاسی ''ٹانک'' کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر یہ پروپیگنڈا پورے ہندوستان کے طاقت ور ذرائع ابلاغ سے ہو تو کیا کہنے۔ خان عبدالغفار خان کی سیاسی زندگی کے لئے یہ حقیقت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ہندوستان میں سرحدی گاندھی کے بارے میں پمفلٹوں اور کتابوں کا طومار بھی لگ رہا تھا۔ خان عبدالغفار خان ذہنی طور پر اتنا بڑا سیاسی لیڈر نہیں تھا کہ وہ اس قدر وسیع پیمانے کے ہندوستانی پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوتا۔ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا بہت سے لیڈروں کو اکثر و بیشتر سیاسی طور پر اندھا کر دیتی ہے۔ خان عبدالغفار خان ایسے ہی کوتاہ اندیش لیڈروں میں سے ایک لیڈر تھا۔ ہندوستانی ڈھنڈورچیوں نے مسلسل یک طرفہ پروپیگنڈا کر کے اسے صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر رکھا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ پختونستان کے مطالبہ پر بہر صورت اصرار کر کے اپنے آپ کو پختونوں کا تاریخی ہیرو بنا رہا ہے۔ کم از کم ہندوستانی ذرائع ابلاغ کا پروپیگنڈا سن کر اسے یہی محسوس ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہ خان اپنی نجی گفتگو میں اور پبلک تقریروں میں ہندوستان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا تھا اور پاکستان کی ہر چیز میں سے کیڑے نکالتا تھا۔

اسے ہندوستان کے کانگرسی ارباب اقتدار کی سامراج دشمنی بہت اچھی لگتی تھی حالانکہ 15 راگست 1947ء کے بعد کئی سال تک ہندوستان کا وزیر اعظم جواہر لال نہرو برما اور ملایا میں حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے حکومت برطانیہ سے بھرپور سیاسی، سفارتی، مالی اور فوجی اشتراک عمل کر کے اپنی بدترین سامراج نوازی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ جہاں تک کانگرسی لیڈروں کی جمہوریت پسندی کا تعلق تھا اس کے ڈھول کا پول اکتوبر 1951ء میں ریاست جموں وکشمیر کے نام نہاد دستور ساز اسمبلی کے عام انتخابات میں کھل چکا تھا۔ عبدالقیوم خان نے دسمبر 1951ء میں صوبائی انتخابات میں جو دھاندلی اور سرکاری غنڈہ گردی کی تھی وہ دراصل کشمیر میں شیخ عبداللہ کی پیروی ہی میں تھی۔ کشمیر کے ان نام نہاد انتخابات میں ''دستور ساز اسمبلی'' کی 75 نشستوں پر شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے سارے امیدوار ''بلا مقابلہ'' کامیاب ہو گئے تھے کیونکہ ان کے

بیشتر مخالف امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے تھے اور جو امیدوار انتخابی میدان میں رہ گئے تھے انہوں نے پولنگ سے دو ایک روز پہلے انتخابات کا اس الزام کی بنا پر بائیکاٹ کر دیا تھا کہ سرکاری پارٹی کی طرف سے دھاندلی اور غنڈہ گردی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود بادشاہ خان کے ممدوح اور ''عظیم جمہوریت پسند'' جواہر لال نہرو نے 19 ر اکتوبر 1951ء کو مدراس کے روزنامہ ''ہندو'' سے ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ ''کشمیری عوام نے انتخابات میں جس طریقے سے ووٹ دیئے ہیں اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ نیشنل کانفرنس اور ہندوستان کے ساتھ ہیں۔'' پھر اسی نہرو نے یکم نومبر کو کشمیر کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر شیخ عبداللہ کو مبارک باد کا پیغام بھیجا تھا اور روزنامہ ''ہندو'' کا اس پر تبصرہ یہ تھا کہ ''نیشنل کانفرنس ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا پروگرام لے کر عوام کے پاس گئی تھی اور ریاست کے ہر بالغ رائے دہندہ نے اس پروگرام کی توثیق کر دی ہے۔'' بادشاہ خان کو ہندوستان اور اس کے کانگرسی ارباب اقتدار کی جمہوریت پسندی کے بارے میں اس قسم کی منافقت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ پاکستان کی مخالفت میں بالکل اندھا ہو چکا تھا۔ اس کی سیاست کس قدر منافقانہ تھی اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب 2 ر جون 1947ء سے پہلے وہ کانگرس کے اکھنڈ بھارت اور ایک قومی نظریہ کا حامی تھا تو اس کی سیاست ''سیکولرازم'' کے اصول پر مبنی تھی لیکن جب 20 ر جون کو بنوں میں اس نے اپنی پارٹی سے ''آزاد پختونستان'' کی قرارداد منظور کرائی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ اس مجوزہ ریاست میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا اور پھر ستمبر 1947ء میں اس نے صوبہ سرحد کا دورہ کر کے خود مختار پختونستان کا پروپیگنڈا شروع کیا تو وہ پاکستان کی حکومت پر الزام عائد کرتا تھا کہ اس کی بنیاد حقیقی اسلام پر نہیں ہے۔ صوبائی گورنر سر جارج کننگھم نے گورنر جنرل کے نام 31 ر دسمبر کے خط میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پبلک جلسوں اور قبائلی جرگوں میں مروجہ قوانین کی جگہ شریعت کے نفاذ کے مطالبات کئے جا رہے ہیں۔[18] خان عبدالغفار خان کو یہ حقیقت بھی نظر نہیں آتی تھی کہ کس طرح نہرو کی حکومت نے ناگالینڈ کے عوام کو حق خود ارادیت دینے کی بجائے ان پر فوجی چڑھائی کر دی تھی اور اس کی نظر سے ایسی متعدد مثالیں بھی اوجھل تھیں کہ کس طرح نہرو کی نام نہاد جمہوری حکومت نے وقتاً فوقتاً وسطی اور جنوبی ہندوستان کی ان صوبائی حکومتوں کو غیر جمہوری طور پر برطرف کر دیا تھا جن کا طرز عمل اس کی فسطائی پالیسی سے مطابقت

نہیں رکھتا تھا۔

مذکرہ حقائق سے یہ بھی واضح ہے کہ خان عبدالغفار خان کی غیر حقیقت پسندانہ سیاست اور اس کے پختونستان سٹنٹ کو پاکستان میں تقویت ملنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان نے 22 راگست کو صوبہ سرحد کی عنان اقتدار خان عبدالقیوم خان جیسے خونخوار بھیڑیے کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ صوبائی گورنر سر جارج کننگھم نے گورنر جنرل کے نام اپنی ایک رپورٹ میں مشورہ دیا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف نہ کیا جائے کیونکہ اس نے پاکستان کے ساتھ وفاداری کا یقین دلایا ہے۔ کوئی شخص بھی پٹھانستان کا سنجیدگی سے مطالبہ نہیں کرتا اور کوئی بھی کانگرسی لیڈر پاکستان کے بارے میں غیر وفاداری کے جذبات کا حامل نہیں ہے۔ اگر خان عبدالغفار خان کے ساتھ ہنر مندی سے سلوک نہ کیا گیا اور اسے خواہ مخواہ دشمن بنالیا گیا تو وہ مستقبل میں سنگین مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ پھر اس نے ستمبر 1947ء میں گورنر جنرل کو خط کے ذریعے مطلع کیا تھا کہ میں نے آپ کے مشورے کے مطابق عبدالقیوم خان کو متنبہ کر دیا ہے کہ وہ موجودہ حالات میں کسی بہت ہی معقول وجہ کے بغیر سرخپوشوں کے ساتھ تصادم کا خطرہ مول نہ لے۔[19] نوائے وقت کی پشاور سے یہ رپورٹ صحیح نہیں تھی کہ ''سر جارج نے مرکزی حکومت سے درخواست کی ہے کہ اسے سرحد میں کانگرسی وزارت کی برطرفی کا مسئلہ اپنے خاص انداز میں حل کرنے کی اجازت دی جائے۔ سر جارج کا مخصوص انداز یہ ہے کہ حریف کو لمبی رسی دی جائے اور جب اس کی گردن پھندے میں اچھی طرح اٹک جائے، تو رسی کھینچ لی جائے۔ سر جارج کے کانگرسی وزرا ''بدستور کام کر رہے ہیں۔ مگر قیاس یہی ہے کہ اب ان کے دن آ گئے ہیں۔''[20] غالباً یہ رپورٹ عبدالقیوم خان نے بھجوائی تھی جو سر جارج کے برعکس مرکزی حکومت پر زور دے رہا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو فوری طور پر برطرف کیا جائے اور خان عبدالغفار خان پاکستان کے خلاف اپنے معاندانہ رویے سے اس سلسلے میں عبدالقیوم خان کی عملاً امداد کر رہا تھا۔ عبدالقیوم خان کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں خان عبدالغفار خان اور قائداعظم میں مفاہمت نہ ہو جائے اور خان عبدالغفار خان نے شاید قسم کھا رکھی تھی کہ وہ مطلوبہ مفاہمت کے لئے سیاسی فضا ہموار نہیں کرے گا۔ ایک طرف عبدالقیوم خان کی ہوس اقتدار و موقع پرستی اور دوسری طرف خان عبدالغفار خان کی جاگیردارانہ ہٹ دھرمی و تنتم مزاجی ایسی مفاہمت کی راہ میں حائل تھیں۔

اپریل 1948ء میں اس امر کی واضح علامتیں موجود تھیں کہ قائداعظم جناح، سر جارج کننگھم اور دوسرے ذرائع سے موصول شدہ اطلاعات کی بنا پر عبدالقیوم خان سے برگشتہ خاطر ہو چکے تھے اور انہوں نے 22 راپریل کو پشاور کے جلسہ عام میں قیوم وزارت کی رشوت ستانی، اقربا نوازی اور دوسری بدعنوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے عوام کو یقین دلایا تھا کہ اس زہر کو جلد ہی جسد سیاست سے نکال دیا جائے گا مگر اس خونخوار بھیڑیے نے گورنر جنرل اور صوبائی گورنر کے انتباہ سے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اس لئے کہ اسے ہر لحہ یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ جب تک خان عبدالغفار خان اور اس کی پارٹی کو بزور قوت کچلا نہیں جائے گا اس وقت تک اس کی وزارت کی کشتی ڈانواں ڈول رہے گی۔ چنانچہ اس نے 12 رجون 1948ء کو قائداعظم کی ہدایت کے برعکس اور مرکزی حکومت کی باقاعدہ منظوری حاصل کئے بغیر خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر لیا اور پھر اگست 1948ء میں ڈاکٹر خان صاحب کو گرفتار کرنے کے بعد چارسدہ کے نزدیک بھابڑا میں ایک احتجاجی اجتماع پر اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر کے لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ اس خونریزی سے خان عبدالغفار خان اور اس کے پختونستان سنٹ کی سیاسی قوت میں بہت اضافہ ہوا لیکن سرحد کا ''مرد آہن'' یہیں پر نہ رکا۔ وہ اپنے اقتدار کی سٹیم رولر کے نیچے جمہوریت انصاف اور رواداری کے علاوہ ہر اس چیز کو کچلنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا جو کسی معاشرہ یا ملک کی بقاوترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس نے سرخپوشوں سے فارغ ہونے کے بعد ان مسلم لیگیوں کی طرف رخ کیا جو کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی طرح اس کے اقتدار کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتے تھے۔ اس نے پیر مانکی کے علاوہ کئی دوسرے مسلم لیگیوں کو صوبہ سے بیدخل کر دیا اور پورے صوبہ میں اپنے حقیقی یا مصنوعی سیاسی مخالفین کے خلاف مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ سرحد کے عوام ہری سنگھ نلوہ کا استبدادی زمانہ بھول گئے۔ دسمبر 1951ء کے عام انتخابات میں اس ''شیر سرحد'' نے سرکاری درندگی کا جو مظاہرہ کیا وہ فی الحقیقت فقید المثال تھا۔ اگر اس کے بعد سرحد کے عوام میں خان عبدالغفار خان اور اس کی پارٹی کے حق میں ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تو یہ بات حیرت انگیز ہوتی۔ اپریل 1953ء میں اس ''خان اعظم'' نے صوبہ کے انسپکٹر جنرل پولیس کو وزیراعلیٰ بنانے کا جو ''کارنامہ'' سرانجام دیا اس کے بعد تو سیاسیات کے ہر طالب علم کو یقین ہو گیا تھا کہ اب خان عبدالغفار خان کے سیاسی ستارے کو عروج پذیر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن خان عبدالغفار

خان کے خدشہ کے برعکس عبدالقیوم خان کی یہ ساری بدعنوانیاں، پنجابیوں سے کسی ساز باز کا نتیجہ نہیں تھیں۔ اس نے پنجاب کے کسی جاگیردار ٹولے سے گٹھ جوڑ نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ بلا امتیاز سارے پنجابیوں کو گالیاں دیتا تھا۔ اس نے یہ سب سے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے ساتھ اور پھر وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کے ساتھ پنجاب کے جاگیرداروں کے ایک گروہ یا پنجاب کے سارے جاگیرداروں، نو دولتیے سرمایہ داروں اور اعلیٰ سول و فوجی حکام کے خلاف گٹھ جوڑ کی بنا پر کیا تھا۔ البتہ جب 1955ء میں سامراج نواز پنجابی سول، فوجی اور عدالتی بیوروکریسی اور پنجابی جاگیرداروں کی زیر قیادت مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں پر فسطائی اور غیر جمہوری طریقے سے ون یونٹ کی سکیم نافذ کی گئی تو ملک کے باشعور عناصر میں عبدالقیوم خان کی بدعنوانیوں کی بنا پر پیدا شدہ اس خدشہ میں مزید شدت پیدا ہوگئی کہ آئندہ نہ صرف سرحد میں پختونستان کا سٹنٹ ایک تحریک کی صورت اختیار کرے گا بلکہ مشرقی بنگال میں علیحدگی پسندی کی تحریک میں بہت تیزی و تندی پیدا ہو جائے گی۔

حسب توقع خان عبدالغفار خان جنوری 1957ء میں لاہور ہائی کورٹ کے حکم کے تحت رہا ہونے کے بعد گھر جا کر خاموش نہیں بیٹھ گیا تھا بلکہ اس نے ایک نئی کل پاکستان جماعت نیشنل عوامی پارٹی کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ جماعت آزاد پاکستان پارٹی، عوامی لیگ کے بھاشانی گروپ، گنا تنتری دل، سندھ محاذ، سندھ ہاری کمیٹی، رورے پختون، استحان گل اور خدائی خدمت گار تنظیم کے ادغام سے وجود میں آئی تھی۔ اس نئی جماعت میں خان عبدالغفار خان، مسٹر جی۔ ایم۔ سید، شیخ عبدالمجید سندھی، خان عبدالصمد اچکزئی، شہزادہ عبدالکریم اور غوث بخش بزنجو کے علاوہ میاں افتخار الدین اور مولانا عبدالحمید بھاشانی جیسے متعدد زعماء بھی شامل تھے جنہوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس کا پہلا قومی کنونشن 1957ء میں ڈھاکہ میں ہوا جس میں اس کے جو اغراض و مقاصد بیان کئے گئے ان میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ''ون یونٹ'' کے قیام کی مخالفت کی جائے گی کیونکہ اس کی وجہ سے مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان مقابلہ کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور مغربی پاکستان کی چھوٹی اکائیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے آئینی، سیاسی اور اقتصادی حقوق نظر انداز کئے جا رہے ہیں۔'' تاہم اس کے بعد بھی بعض حلقوں میں پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی جو تھوڑی بہت امید باقی رہ گئی تھی وہ بھی

اکتوبر 1958ء میں جنرل محمد ایوب خان کے ''فوجی انقلاب'' نے ختم کر دی۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ پاکستان کی جغرافیائی سالمیت برقرار رہے گی یا نہیں؟ بلکہ سوال یہ تھا کہ پاکستان کے حصے بخرے ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔ پنجاب کے رجعت پسند جاگیرداروں، پنجاب و کراچی کے کوتاہ اندیش نو دولتیے سرمایہ داروں، سامراج نواز سول، فوجی اور عدالتی بیوروکریسی اور ان سب کے خرید کردہ درمیانہ طبقہ کے بعض ابن الوقت دانشوروں اور صحافیوں نے برصغیر کے دس کروڑ غریب اور درمیانہ طبقہ کے اس وطن عزیز کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ یہ لوگ اسلام و پاکستان کے ''اجارہ دار'' بنتے تھے اور جو کوئی بھی ان سے اختلاف رائے کرتا تھا اس پر فوراً ''کفر'' اور ''غداری'' کا لیبل لگا دیتے تھے۔ ان سے سرٹیفکیٹ حاصل کئے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو محب الوطن نہیں کہہ سکتا تھا۔

اگر پاکستان کے مرکزی ارباب اقتدار صوبہ سرحد کے گورنر سر جارج کننگھم کے مشورے کے برعکس ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو غیر جمہوری طریقے سے برطرف نہ کرتے بلکہ اس کی زیر قیادت کانگرس کے ''دائیں بازو'' کے عناصر سے سیاسی مفاہمت کرتے یا اگر اس وزارت کی کسی وجہ سے برطرفی ضروری ہی تھی تو اس کے بعد صوبہ کا اقتدار ایک بدترین قسم کے موقع پرست فاشسٹ عبدالقیوم خان کے حوالے نہ کرتے تو خان عبدالغفار خان کی غیر حقیقت پسندانہ سیاست اور اس کے پختونستان کے سٹنٹ کے پھلنے پھولنے کا امکان پیدا نہ ہوتا۔ سر جارج نے 8 ستمبر کو گورنر جنرل کے نام اپنے ایک خط میں یہ اطلاع دی تھی کہ ''خان عبدالغفار خان اور دوسرے سرخپوش لیڈر پبلک جلسوں میں تقریریں کر رہے ہیں اور پٹھانستان کا جھنڈا لہرا رہے ہیں لیکن ان کے جلسے ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ ان کے خلاف مقدمہ چلا کر ان کی تشہیر نہ کی جائے خواہ ان کی سرگرمیاں قابل گرفت ہی کیوں نہ ہوں۔''[21] صوبائی گورنر کے اس مشورے کا مطلب یہ تھا کہ خان عبدالغفار خان کی علاقہ پرستی کی سیاست کا آئینی و جمہوری طریقوں سے مؤثر سدباب کیا جا سکتا ہے۔ مگر پاکستان کے رجعت پسند جاگیردار طبقے، کوتاہ اندیش نو دولتیوں اور سامراج نواز افسر شاہی نے برطانوی سامراج کے ایک تجربہ کار افسر کے ان مشوروں پر عمل کرنے کی بجائے خان عبدالقیوم خان کو اندھا دھند فسطائی ڈنڈا چلانے کی کھلی چھٹی دے دی۔ چنانچہ بالآخر وہ اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے خان عبدالغفار خان کا عظیم

ترین سیاسی محسن ثابت ہوا۔

صوبہ سرحد کے عوام اس سرکاری بدسلوکی کے مستحق نہیں تھے۔ وہ 1947ء میں سرحدی گاندھی کے 27 سالہ سیاسی غلبہ سے نجات حاصل کر کے برضا و رغبت پاکستان میں شامل ہوئے تھے۔ سیاسی جمہوریت اور معاشرتی و معاشی انصاف ان کا بنیادی حق تھا۔ انہیں اسلام اور پاکستان کے نام پر اس حق سے محروم کرنا کسی طرح بھی روا نہیں تھا۔ انہیں 23 / مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان کے مطابق زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری ملنی چاہیے تھی۔ قائداعظم جناح نے بھی 12 / جون کو خان عبدالغفار خان سے ملاقات کے دوران یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا آئین وفاقی ہوگا اور اس میں ہر صوبہ کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہوگی۔ پنجاب میں اسلام اور پاکستان کے ''اجارہ داروں'' نے سرخپوشوں کے خلاف عبدالقیوم خان کی سکھاشاہی کی تائید و حمایت کر کے انتہائی سیاسی کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا اور اس طرح یہ ثابت کیا تھا کہ خان عبدالغفار خان کا پنجابی غلبہ سے متعلقہ خدشہ بالکل بے بنیاد نہیں تھا۔ سرحد کے پٹھان عوام کا پنجاب کے غریب عوام سے کوئی تضاد نہیں تھا۔ پنجاب میں پٹھانوں کو معاشرتی لحاظ سے ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور کبھی کوئی پٹھان پنجاب میں آ کر اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ کسی حد تک احساس برتری اور معاشرتی جارحیت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ پنجابیوں اور پٹھانوں میں رشتہ داریوں اور بیاہ شادیوں کا سلسلہ بہت پرانا تھا اور پاکستان بننے کے بعد ان معاشرتی روابط میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی پنجابی کو کبھی کسی پٹھان کے خلوص، مہمان نوازی، فراخدلی اور وفاداری کے بارے میں کبھی کوئی شبہ نہیں ہوتا تھا۔

اگر پاکستان کے ارباب اقتدار پورے پاکستان میں غیر جمہوری، غیر متوازن اور غیر منصفانہ سیاسی و معاشی پالیسی اختیار نہ کرتے تو خان عبدالغفار خان کی قسم کے تنگ نظر عناصر کی علاقہ پرستی کی سیاست کے فروغ پانے کا امکان پیدا نہ ہوتا۔ ضرورت اس امر کی نہیں تھی کہ صوبہ سرحد میں ڈنڈے کے زور سے قیوم شاہی کو برقرار رکھا جائے بلکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ ہر سطح کے پٹھان عوام کو جمہوری طریقے سے پوری طرح اعتماد میں لے کر ان کی بلا تاخیر سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی ترقی کے لئے مؤثر اقدامات کئے جاتے۔ مزید ضرورت اس امر کی تھی کہ قبائلی علاقوں میں مفاد پرست سرداروں کو کروڑوں روپے سالانہ مواجبات کی صورت میں رشوت دے

کر امن وامان قائم رکھنے کی پالیسی کو بتدریج ترک کر کے قبائلی عوام کو ایک منصوبہ کے تحت بیسویں صدی کی سیاست، معاشرت، ثقافت اور معیشت کے بہترین پہلوؤں سے روشناس کر کے ان کے تہذیبی ارتقا کے لئے مصمم طریقے سے مخلصانہ کوشش کی جاتی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو افغانستان کے رجعت پسند حکمرانوں کو پاکستان کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں کا موقع نہ ملتا۔ شاید وہ حکومت برطانیہ کی 1930ء کی تجویز کے مطابق مہمند علاقے میں ازسرنو سرحد بندی پر آمادہ ہو جاتے اور اگر وہ اس پر نہ بھی آمادہ ہوتے تو وہ اتنی زیادہ فتنہ انگیزی نہیں کر سکتے تھے۔ سرحد کے قبائلی اور دوسرے عوام کو درانی شاہی سے کوئی عقیدت و محبت نہیں تھی۔ افغانستان کے حکمرانوں کا پڑدادا سردار سلطان محمد خان سکھوں کا پٹھو تھا اور اس نے معمولی پوزیشن اور مالی منفعت کے لئے امیر دوست محمد خان سے غداری کر کے پشاور کی وادی کو سکھوں کے حوالے کر دیا تھا۔ غالباً اس تاریخی پس منظر کی وجہ سے افغانستان کی اندرونی و بیرونی تجارت پر سکھوں اور ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اور زرعی معیشت پر بھی انہی کا کنٹرول تھا۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان کے ارباب اقتدار سے اس قسم کے ترقی پسندانہ ومخلصانہ اقدامات نہ ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے کیونکہ پاکستان کا جاگیردار طبقہ بہت رجعت پسند تھا، نودولتیے کوتاہ اندیش تھے اور سول، فوجی اور عدالتی بیوروکریسی سامراج نواز تھی، درمیانہ طبقہ نوزائیدہ، ناتجربہ کار اور بہت حد تک موقع پرست تھا اور اس بنا پر وہ ملک کی سیاست میں کوئی مؤثر وصحت مند کردار ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ چونکہ ملک میں معاشی ترقی کی رفتار بہت سست، غیر منصفانہ اور غیر متوازن تھی اس لئے مزدور طبقہ بطور سیاسی قوت نہ ہونے کے برابر تھا۔ غریب کسان اس قدر پسماندہ، مظلوم اور غیر منظم تھے کہ ان سے کسی سیاسی عمل کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

حوالہ جات

باب:1 پہلی افغان سلطنت

1- Olaf Caroe, Sir, *The Pathans*, London 1963 p. 257

2- Prem Nath Bazaz, *The History of Struggle for Freedom in Kashmir*, New Delhi, 1954, p 117

3- *Pak-Afghan Relations*, Government of Pakistan, 1975, p. 3

4- Olaf Caroe, *op. cit.*, p. 304-5

باب:2 برطانیہ کی فارورڈ پالیسی کے تحت افغانستان کی بفرسٹیٹ

1- Olaf Caroe, *op. cit.*, pp. 324-26

2- *Ibid.*, p.361

3- Gunnar Myrdal, *Asian Drama, Vol. 1*, London, 1968, p. 178.

4- *Ibid.*, p. 177

5- S.M.Burke, *Pakistan's Foreign Policy*, Karachi 1973, p. 83

6- Gunnar Myrdal, *op. cit.*, p. 177

7- S.M. Burke, *op. cit* p. 81

8- *Ibid.*, pp. 81-83

9- Olaf Caroe, *op. cit.*, p. 381

10- *Ibid.*, pp. 382 - 83

11- *Ibid.*, p. 384

12- Gunnar Myrdal, *op. cit.*, p. 179

13- *Ibid.*, p. 178

باب:3 افغان حکمرانوں کے توسیع پسندانہ عزائم

1- S.M.Burke, *op. cit.*, pp. 83-84

2- Olaf Caroe, *op. cit.*, p. 405

3- S.M.Burke, *op. cit.*, p. 84

4- Olaf Caroe, *op. cit.*, p. 407-8

5- *Ibid.*, p. 465

باب:4 آزاد پختونستان کا شوشہ......انگریزوں اور کانگرس کی ملی بھگت کا نتیجہ

1- *The Tranfer of Power 1942-47, Vol. 10*, Ed-in-chief Nicholas Mansergh, Ed. Penderal Moon, London, 1981 pp. 252-253, 270

2- *Ibid.*, p. 491-92

3- *Ibid.*, p. 535-36

4- *Ibid.*, p. 362

5- *Ibid.*, p. 530

6- *Ibid.*, pp. 567-68

7- *Ibid.*, p. 566

8- *Ibid.*, pp. 581-83, 592, 599, 608

9- *Ibid.*, pp. 611-13

10- *Ibid.*, pp. 671-72

11- *Ibid.*, p. 698

12- *Ibid.*, p. 697

13- *Ibid.*, p. 768

14- *Ibid.*, p. 944

15- Alan Campbell Johnson, *Mission with Mountbatten*, London, 1951, pp. 75-76

16- Chaudhri Mohammad Ali, *The Emergence of Pakistan*, Lahore, 1973 p. 164

17- *Ibid.*, pp. 145-46
See also Pyarelal, *Mahatama Gahdhi The Last Phase, Vol 2* Ahmedabad, 1958, p.170

18- Maulana Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* Calcutta, 1959, pp.194-95

19- *The Transfer of Power 1942-47, Vol 11* Ed-in-chief Nicholas Mansgerh, Ed.Penderal Moon, London, 1982. p. 150

20- *Ibid.*, pp. 72-78

21- Leonard Mosley, *The Last Days of British Raj*, London 1961, p. 132

22- Abdul Kalam Azad, *op. cit.*, pp. 194-95

23- Chaudhri Mohammad Ali, pp. 164-65

24- Yahya Bakhtiar, *Opening Address in the Supreme Court of Pakistan*, 1975, p.14

باب:5 سرحدی گاندھی کا پختونستان اور ریفرنڈم

1- Pyarelal, *op. cit.*, p.273

2- E.W.R Lumby, *Transfer of Power in India 1945-47*, London, 1954, p.173

3- *The Pakistan Times*, June 21, 1947

4- Yahya Bakhtiar, *op. cit.*, p.61

5- *The Paksitan Times*, June 25, 1947

6- *Ibid.*, June 26, 1947

7- E.W.R..Lumby, *op. cit.*, pp.172-73

8- *The Pakistan Times*, June 28, 1947

9- *Ibid.*, July 1, 1947

10- *Ibid.*, July 2, 1947

11- Pyarelal, *op. cit.*, p. 227

12- *Ibid.*, p. 279

13- Yahya Bakhtiar, *Concluding Address in the Supreme Court of Pakistan*, 1975 p. 63

14- *The Pakistan Times*, July 4, 1947

15- *The Transfer of Power 1942-47, Vol. 11*, *op cit.*, pp. 262-63

16- *Ibid.*, p. 415

17- *Ibid.*, pp. 526-27

18- *Ibid.*, pp. 730-31

19- *Ibid.*, pp. 799-800

20- Yahya Bakhtiar, *op. cit.*, p. 64

21- *The Transfer of Power 1942-47, Vol.11, op. cit.*, pp. 820-21. 870-71

22- *The Pakistan Times*, July 6, 1947

23- *Ibid.*, July 6, 1947

24- *The Transfer of Power 1942-47, Vol. 11, op. Cit.*, p. 832, pp 870-71

25- *Ibid.*, p. 910

26- *Ibid.*, p. 878

27- *Ibid.*, p. 889

28- *Ibid.*, p. 591

29- *Ibid.*, p. 595

30- S.M. Burke, *op. cit.*, pp. 72-73

31- *The Transfer of Power 1942-47, Vol.11, op. cit.*, p 810

32- Yahya Bakhtiar, *op. cit.*, p. 63

33- *Ibid.*, pp. 32-33.

34- *The Transfer of Power 1942-47, Vol. 11 op cit.*, pp. 172-173

35- *The Pakistan Times*, July 9, 1947

36- *Ibid.*, July 11, 1947

37- *Ibid.*, July 19, 1947

38۔ خان عبدالولی خان۔اور بیان اپنا۔لاہور ص 22-120

39- (1) *The Transfer of power 1942-47, Vol. 10, op. cit.*,p.944

(II) Alan Campbell Johnson, *op. cit.*, p. 76

40- Abul Kalam Azad, *op. cit.*, p.194

41- Leonard Mosely, *op. cit.*, p.132

42- L.F. Rushbrook Willimas, *Pakistan Under Challenge*, London, 1975, pp. 57-58

43- S.M Burke, *op. cit.*, p.71

باب:6 عبدالغفار خان کی کوتاہ اندیشی اور قیوم خان کی موقع پرستی

1- Maulana Abul Kalam Azad, *op. cit*, pp. 170-171

2- Alan Campbell Johnson, *op. cit.*, p. 75

3- Chaudhri Mohammad Ali, *op. cit.*, p. 145

4- Olaf Caroe, *op. cit.*, p. 433

5۔ خان عبدالولی خان۔ محولہ بالا۔ ص ص 18-117

6- S.M. Burke, *op. cit.*, p. 69

7- Abdul Qaiyum Khan, *Gold and Guns on the pathan Frontier,* Bombay, 1945, pp. 32, 43-44

8۔ نوائے وقت۔ 23/ اگست 1947ء

9۔ ایضاً۔ 27/ اگست 1947ء

10- Chaudhri Mohammad Ali, *op. cit.*, p. 251

11- M. Rafique Afzal, *Political Parties in Pakistan 1947-1958*, Islamabad, 1976, p. 90

12- Khalid Bin Sayeed, *Pakistan. The Formative Phase 1857-1948*, Karachi, 1968 p. 270-72

13- *The Pakistan Times*, July 25, 1947

14- Abdul Qaiyum Khan, *op. cit.*, pp. 42-44

15- *Ibid*, pp. 69-70

16- Khalid Bin Sayeed *op. cit.*, p. 273

17- Maulana Abul Kalam Azad, *op. cit*, p. 195-96

18- Quoted by Yahya Bakhtiar, *op. cit.*, p. 36

باب:7 قیوم خان کی فسطائیت، غفار خان کی گرفتاری اور بھابڑا فائرنگ

1۔ خان عبدالولی خان۔ محولہ بالا۔ ص 123

2- Khalid Bin Sayeed, *op. cit.*, p. 274.

3۔ خان عبدالولی خان۔ محولہ بالا۔ ص 125

4- *Supreme Court Judgement on the Dissolution of NAP,* Rawalpindi,1975, pp. 84-85

5- Chaudhri Mohammad Ali, *op cit.*, p. 368

6۔ سید نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ لاہور۔1966ء۔ص 359

7۔ ایضاً۔ص ص 66-365

8۔ نوائے وقت۔18رجون 1948ء

9۔ ایضاً۔19رجون 1948ء

10۔ ایضاً۔18راگست 1949ء

11۔ ایضاً۔18راگست 1949ء

باب:8 پختون شاونزم کا تاریخی پس منظر اور ڈیورنڈ لائن کی بین الاقوامی حیثیت

1- *Dawn*, July 15, 1949

2- *Ibid.*, July17, 1949

3- Damodar P. Singhal, *Pakistan*, London, 1972, p.149

4- S.M. Burke, *op. cit.*, p. 74

5- *Dawn*, January10, 1950

6- S.M. Burke, *op. cit.*, p. 74

7- *The Pakistan Times*, June 17, 1950

8- *Ibid.*, July 16, 1950

9۔ خان عبدالولی خان۔محولہ بالا۔ص 149

10- Quoted in Olaf Caroe, *op. cit.*, p. 239

11- Abdur Rehman Pazhwak, *Pakhtoonistan-An Important Political Development in Central Asia*, London, 1953 pp 8-10

12- *Ibid.*, pp. 59-66

13- *Ibid.*, pp. 73-74

14- Quoted in S.M. Burke, *op. cit.*, p. 87

15- Olaf Caroe, *op. cit.*, pp. 382-83, 463-64

16۔ خان عبدالولی خان۔محولہ بالا۔ص 147

باب:9 قیوم شاہی کا خاتمہ اور عبدالغفار خان کی سیاسی بحالی

1۔ جہاد۔2رمئی1951ء

2۔ نوائے پاکستان۔19رستمبر1951ء

3۔ ایضاً۔30رستمبر1951ء

4۔ ایضاً۔26رنومبر1951ء

5- *The Pakistan Times*, December 6, 1951

6۔ نوائے پاکستان۔21ردسمبر1951ء

7۔ ایضاً۔24ردسمبر1951ء

8۔ ایضاً۔7رجنوری 1952ء

9۔ نوائے وقت۔18راگست 1948ء

10۔ نوائے پاکستان۔22رفروری 1952 ء

11۔ نوائے وقت۔3رجولائی 1953ء

12۔ ایضاً۔یکم ستمبر1954ء

13۔ ایضاً۔5رستمبر1954ء

14۔ ایضاً۔31رمئی1953ء

15۔ ایضاً۔4رجون1953ء

16- Khalid Bin Sayeed, *op. cit.*, p. 274

17۔ نوائے وقت۔یکم مارچ1954ء

18۔ ایضاً۔9راپریل1954ء

19۔ ایضاً۔25رمارچ1954ء

20۔ ایضاً۔9راپریل1954ء

21۔ ایضاً۔8رمارچ1954ء

22۔ ایضاً۔14راپریل1954ء

23۔ ایضاً۔16/اپریل1954ء

24۔ ایضاً۔19/اپریل1954ء

باب:10 افغانستان کے معاندانہ رویے اور غفار خان کی سیاسی ہٹ دھرمی کی وجوہ

1۔ نوائے وقت۔یکم نومبر1954ء

2۔ نوائے وقت۔21/نومبر1954ء

3- Khalid Bin Sayeed, *op. cit.*, p. 187

4- *Pakistan Legal Decisions*, Lahore, 1957, pp. 142-195

5- Keith Callard, *Paksitan A Political Study*, Karachi, 1968 p. 190

6- *Dawn*, April 5, 1955

7- *Ibid.*, May 6, 1955

8- S.M Burke, *op. cit.*, p. 206

9- *Ibid.*, p. 209

10- Mohammad Ahsan Chaudhri, *Pakistan and the Great Powers*, Karachi, 1970, p. 59

11- Yayha Bakhtiar *op. cit.*, p. 64

12- Olaf Caroe, *op. cit.*, p. 435-37

13- Ian Stephens, *Pakistan*, London, 1964, p. 265

14- Yahya Bakhtiar, *op. cit.*, p. 66

15- Olaf Caroe, *op. cit.*, pp. 432-33

16- Yahya Bakhtiar, *op. cit.*, p. 84

17- *Ibid.*, p. 84

18- Khalid Bin Sayeed, *op. cit.*, pp. 244-45

19- *Ibid.*, p. 224,274

20۔ نوائے وقت۔21/اگست1947ء

21- Khalid Bin Sayeed, *op. cit.*, p. 244

کتابیات

Afzal, M. Rafique, *Political Parties in Pakistan 1947-1958,* National Commission on Historical & Cultural Research, Islamabad, 1976.

Ali, Chaudhry Mohammad, *The Emergence of Pakistan,* Originally published by Columbia University Press, New York & London, 1967, Reprinted by the Research Society of Pakistan, University of the Punjab, Lahore, 1973.

Azad, Abul Kalam, *India Wins Freedom,* Orient Longmans Calcutta, 1st Printed 1959, reprinted 1964

Bakhtiar, Yahya, Opening Address in the Supreme Court of Pakistan and Concluding Address in the Supreme Court of Pakistan, Government of Pakistan, Islamabad, 1975

Bazaz, Prem Nath, *The History of struggle for freedom in Kashmir,* Kashmir Publishing Company, New Delhi,1954

Burke, S. M., *Pakistan's Foreign Policy,* Oxford University Press, Karachi and London, 1973

Callard, Keith, *Paksitan: A Political Study,* George Allen and Unwin, London & Oxford University Press Karachi, First Published in. 1957. Third impression 1968.

Caroe, Olaf, Sir, *The Pathans,* Macmillan & Co. Ltd. London and New York, 1962, First Edition 1958, reprinted 1962

Chaudhri, Mohammad Ahsan, *Pakistan and the Great Powers*, Council for Pakistan Studies, Karachi, 1970.

Johnson, Alan Campbell, *Mission With Mountbatten*, Robert Hale Ltd: London, 1951

Khan Abdul Qayyum, *Gold and Guns on the Pathan Frontier*, Hind Kitabs, Bombay, 1945

Lumby, E.W R., *The Transfer of Power in INDIA 1945-71*, George Allen & Unwin Ltd., London, 1954

Mosely, Leonard, *The Last Days of British Raj*, Weidenfield and Nicolson, London, 1961.

Myrdel, Gunnar, *Asian Drama: an enquiry in to the powerty of Nations, Vol-I*, Penguin books Hammondsworth, 1968.

Pazhwak, Abdul Rehman, *Pakhtunistan-An Important Political Development in Central Asia*, Afghan Information Bureau, London, 1953

Pyarelal, *Mahatama Gandhi. The Last Phase, Vol II*, Navajivan Publishing House, Ahmedabad, 1958

Sayeed, Khalid Bin, *Paksitan : The formative Phase 1857-1948, 2nd ed*; Oxford University Press, London, 1968

Singhal, Damodar P, *Pakistan*, Prentice Hall London 1972

Stephens, Ian, *Pakistan*, Ernest Benn, London, 1964

Williams, L. F. Rushbrook, *Pakistan Under Challenge*, Stacey International, London, 1975

کتب (اردو)

احمد، سید نور۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ دار الکتاب۔ لاہور۔ 1966ء

خان عبدالولی خان۔ اور بیان اپنا، لاہور۔

دستاویزات و سرکاری مطبوعات

Pak-Afghan Relations, Government of Pakistan, 1975

Pakistan Legal Decisions, Lahore, 1975

Supreme Court Judgement on the Dissolution of NAP, Govt of Paksitan, Rawalpindi, 1975.

The Transfer of power 1942-47, Ed-in-Chief, Nicholas Mansergh, Ed. Penderal Moon, Her Majesty's Stationary Office, 1981 Vol 10,1982 Vol. 11

اخبارات و جرائد

Dawn, Karachi, Files of 1945,1955

The Paksitan Times, Lahore, Files of 1947,1950

نوائے پاکستان۔ لاہور۔ فائلیں 1951ء، 1952ء

نوائے وقت۔ لاہور۔ فائلیں 1948ء

اشاریہ

آ

ا

ش

ن